بہار / گرما ۱۹۹۵

آج

ترتیب : اجمل کمال

نیر مسعود | ذی شان ساحل | حسن منظر | افضال احمد سید
محمد انور خالد | افتخار جالب | سعید الدین | ثروت زہرا
آصف فرخی | انور خاں | نکہت حسن | ایتاو گھوش
اِیوان کِلیما | فہمیدہ ریاض | اُدے پرکاش
گریس اوگونٹ | جوناتھن ٹرائٹل | برنارڈ مالامڈ

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

شمارہ ۱۹ : بہار / گرما ۱۹۹۵

اپریل - ستمبر ۱۹۹۵

مینیجنگ ایڈیٹر

زینت حسام

اہتمام

آج کی کتابیں

بی ۱۴۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

طباعت

ایجوکیشنل پریس

پاکستان چوک، کراچی

رابطے کے لیے پتا:

اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

فون: ۸۱۱۳۴۷۴

بیرونِ ملک خریداری کے لیے پتا:

محمد عمر میمن

۵۴۱۷، ریجنٹ اسٹریٹ، میڈیسن، وسکانسن ۵۳۷۰۵، یو ایس اے

Scanned with CamScanner

ترتیب

نیر مسعود

۹

طاؤس چمن کی مینا

ذی شان ساحل

۴۶

توہین   فائرنگ   سُرخ ہیئر بینڈ والی لڑکی   ایک آدمی   ہنسی
مختلف لوگوں کے لیے نظم   گھنٹی کا مسئلہ   لاش   چڑیاں
شہری سہولتیں   قطب الدین واپس آتا ہے   لُو
ہلکی اور بھاری چیزیں   شہر

حسن منظر

۷۰

ایک اور آدمی

افضال احمد سید

۷۷

ایک افتتاحی تقریب   شہر میں بہار لوٹ آئے گی
ہمیں بہت سارے پھول چاہییں
ہمارے لیے   ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا   کھیل
افتتاحی تختی چوری ہو گئی ہے   ہدایات کے مطابق
خداوند خدا کی روح   ایک لڑکی

Scanned with CamScanner

محمد انور خالد

۸۶

نظمیں

افتخار جالب

۹۱

زیست کا کوڑا ملبہ

سعید الدین

۹۳

نظم   بُل ڈوزر   تفتیش   خانہ جنگی

اُس کے پاؤں بہت خوب صورت ہیں

پاگل

ثروت زہرا

۹۹

ہَٹ   ورثہ   ہوائیں حاملہ ہیں

صداؤں کا سمندر   ڈرو نہیں

آصف فرخی

۱۰۵

شہر بدری

Scanned with CamScanner

انور خاں

۱۱۱

بسر ہو سکے تو بسر کیجیے

نکہت حسن

۱۲۰

جاگنگ پارک

ایستاو گھوش

۱۳۱

مسز گاندھی کی بدروحیں

اِیوان کِلیما

۱۴۷

آزادی اور کوڑا کرکٹ

فہمیدہ ریاض

۱۵۳

کیا گلابی کبوتر جیت گئے؟

Scanned with CamScanner

اُدے پرکاش

۱۶۹

تبت

مرنا سب سے اچھے دن نظم

سنو کاریگر صراحی پتا عمارت ڈاکیا

سرکار مالک، آپ ناحق ناراض ہیں گیم سینکچوری

سؤر کے بارے میں کچھ کو بتائیں

گریس اوگوٹ

۲۱۰

جگر خوار

جوناتھن ٹرائٹل

۲۲۲

اسٹالن، اسٹالن اور اسٹالن

انتخاب

برنارڈ مالامڈ

۲۳۱

جینے کا مول

۲۴۰

میری موت

Scanned with CamScanner

۲۴۸
اُدھار

۲۵۵
زندگی غنیمت ہے

۲۶۴
پہلے سات برس

۲۷۵
رشتہ ساز

۲۹۲
نوکرانی کے جوتے

۳۰۵
ماتم گسار

۳۱۳
دراز میں بند آدمی

Scanned with CamScanner

آج

خزاں ۱۹۹۵

خصوصی شمارہ:

کراچی کی کہانی

دسمبر ۱۹۹۵ میں شائع ہو گا

Scanned with CamScanner

نیر مسعود

طاؤس چمن کی مَینا

۱

روز کا معمول تھا۔ میں باہر سے آتا، دروازہ کھٹکھٹاتا۔ دوسری طرف سے جمعراتی کی اماں کے کھانسنے کھنکھارنے کی آواز قریب آنے لگتی، لیکن اس سے پہلے ہی دوڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدموں کی آہٹ دروازے پر آکر رُکتی۔ ادھر سے میں آواز لگاتا:

"دروازہ کھولو۔ کالے کالے خاں آئے ہیں۔"

دروازے کے پیچھے سے کھلکھلانے کی دبی دبی آواز آتی اور قدموں کی آہٹ دور بھاگ جاتی۔ کچھ دیر بعد جمعراتی کی اماں آ پہنچتیں، دروازہ کھلتا اور میں گھر میں ہر طرف کچھ ڈھونڈھتا ہوا سا داخل ہوتا۔ ایک ایک کونے کو دیکھتا اور آواز لگاتا:

"ارے بھئی، کالے خاں کی گوری گوری بیٹی کہاں ہے؟"

کبھی پکارتا:

"یہاں کوئی فلک آرا شہزادی رہتی ہے؟"

اور کبھی کامنی کی شاخوں کو ہلا کر کہتا:

"ہماری پہاڑی مَینا کسی نے دیکھی ہے؟"

ساتھ ساتھ کنکھیوں سے دیکھتا جاتا کہ ننھی فلک آرا ایک کونے سے بھاگ کر دوسرے کونے میں چھُپ رہی ہے اور رہ رہ کر ہنس پڑتی ہے۔ لیکن میں اندھا بہرا بنا اُسے وہاں ڈھونڈھتا جہاں وہ نہیں ہوتی تھی۔ آخر مجھے اپنے پیچھے اُس کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز سنائی دیتی۔ میں چیخ مار کر اُچھل پڑتا، پھر گھوم کر اُسے گود میں اٹھا لیتا اور وہ واقعی پہاڑی مینا کی طرح چہکنا شروع کر دیتی۔

Scanned with CamScanner

روز کا یہی معمول تھا، اور یہ اُس دن سے شروع ہوا تھا جب شاہی جانوروں کے داروغہ نبی بخش نے مجھ کو قیصر باغ کے طاؤس چمن میں ملازمت دلائی تھی۔ اس سے پہلے میں گومتی کے کنارے جانوروں کے رَمنوں کے آس پاس آوارہ گردی کیا کرتا، اونچے اونچے کٹہروں کے پیچھے گھومتے ہوئے شیروں تیندووں کو دیکھتا اور تمنا کرتا کہ کسی رمنے کا شیر کٹہرا پھاند کر باہر آئے اور مجھے پھاڑ کھائے۔ اُس وقت یہی میرا روز کا معمول تھا، اور یہ اُس دن سے شروع ہوا تھا جب میری بیوی گیارہ مہینے کی فلک آرا کو چھوڑ کر مر گئی تھی۔ اس سے پہلے میں وقف حسین آباد مبارک میں نوکر تھا۔ امام باڑے کی روشنیوں کا انتظام میرے ذمے تھا۔ تنخواہ کم تھی لیکن گذر ہو جاتی تھی۔ بیوی سگھڑ تھی۔ اسی تنخواہ میں گھر بھی چلاتی اور پرندے پالنے کا شوق بھی پورا کرتی تھی۔ ہمارے یہاں کئی طوطے پلے ہوئے تھے جنھیں اس نے خوب پڑھایا تھا۔ دیسی مینائیں بھی تھیں، لیکن اسے پہاڑی مینا کا ارمان تھا کیوں کہ اس نے سن رکھا تھا پہاڑی مینا بالکل آدمیوں کی طرح باتیں کرتی ہے۔ اُسے خوش کرنے کے لیے میں نے وعدہ کر لیا تھا کہ اگلی تنخواہ پر اس کے لیے پہاڑی مینا لے آؤں گا۔

لیکن تنخواہ ملنے سے چار دن پہلے اس کے سینے میں درد اٹھا اور دوسرے ہی دن وہ چل بسی۔ میرا ہر شے سے جی اُچاٹ ہو گیا۔ نوکری پر جانا بھی چھوڑ دیا۔ اپنے آپ سے بیگانہ ہو گیا تھا پھر بھلا فلک آرا کی پرورش کیا کرتا۔ جمعراتی کی اماں نہ ہوتیں تو اس بچی کا جینا نہ ہوتا۔ وہ میرے ہی مکان کی باہری کوٹھری میں رہتی تھیں۔ چھ مہینے پہلے اُن کا کماتا ہوا جمعراتی گومتی کے کسی کنڈ میں پھنس کر ڈوب گیا تھا۔ اس کے بعد سے میری بیوی ان کی خبر رکھتی تھی۔ بیوی کے بعد فلک آرا کی نگہداشت انھوں نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ جب تک میں گھر سے باہر رہتا وہ میرے گھر میں رہتیں، روٹی بھی پکا دیتی تھیں اور میں دو وقت کے کھانے کے علاوہ ڈلی تمباکو کے لیے کچھ پیسے ان کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔

نوکری ختم ہو گئی تھی۔ حسین آباد کے داروغہ احمد علی خاں نے کئی بار آدمی بھی بھیجا لیکن میں نے پلٹ کر اُدھر کا رخ نہیں کیا تو ان بے چارے نے بھی مجبور ہو کر تنخواہ موقوف کرا دی اور میں مہاجنوں سے سودی قرض لے لے کر کام چلانے لگا۔ گھر صرف رات کو جاتا تھا۔ اس وقت فلک آرا سو چکی ہوتی تھی۔ صبح صبح طوطے میری بیوی کے سکھائے ہوئے بول دُہراتے تو مجھے گھر میں ٹھہرنا مشکل ہو جاتا۔ آخر ایک دن میں اٹھا اور سارے پرندوں کو چڑیا بازار میں بیچ آیا۔

اسی زمانے میں ایک دن داروغہ نبی بخش نے مجھے پاس بلایا۔ کئی دن سے وہ مجھ کو رمنوں کے پاس آوارہ گردی کرتے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے کچھ ایسی دل سوزی سے میرا حال دریافت کیا کہ میں نے سب کچھ بتا دیا۔ انھوں نے بڑی تسلی دی لیکن مہاجنوں سے قرض لینے کی بات پر بہت ناراض ہوئے۔ قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں جو کچھ ہونا تھا اس کا ایسا نقشہ کھینچا کہ میں بدحواس ہو گیا اور خود کو کبھی زنداں کی دیواروں سے سر ٹکراتے، کبھی ننھی بچی کی انگلی تھامے لکھنؤ کے گلی کوچوں میں بھیک مانگتے دیکھنے لگا۔

"دیکھو کالے خاں، ابھی سویرا ہے،" داروغہ نے کہا، "تھیں نوکری چاکری کر لو اور قرض بھگتانے کی فکر شروع کر دو، نہیں تو۔۔۔"

"داروغہ صاحب، مگر نوکری کہاں کر لوں؟"

"کیوں؟" انھوں نے کہا، "ایک تو حسین آباد مبارک ہی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔"

"وہاں مل سکتی ہے، لیکن داروغہ احمد علی خاں سے کس طرح آنکھیں چار کروں گا۔ انھوں نے کتنی بار آدمی بلانے بھیجا، میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اب کیا منھ لے کر ان سے نوکری مانگوں۔"

"اچھا، باغوں میں کام کر لو گے؟"

"کر لوں گا،" میں نے کہا، "گھاس کھودنے کا کام ہو گا وہ بھی کر لوں گا۔"

"بس، تو چلو میرے ساتھ، ابھی،" انھوں نے کہا، "ایک اسامی خالی ہے۔"

داروغہ اسی وقت مجھے بادشاہ منزل کے دفتروں میں لے گئے۔ کئی جگہ میرا نام اور حلیہ وغیرہ درج کیا گیا۔ ضمانتی کی جگہ داروغہ نے اپنا نام لکھوایا۔ پھر ہم لکھی دروازے پر پہنچے۔ یہاں سرکاری عملے کے آدمیوں، سپاہیوں وغیرہ کا ہجوم تھا۔ داروغہ نے کئی لوگوں سے صاحب سلامت کی، پھر مجھ سے کہا:

"یہیں کھڑے رہو۔ ابھی نام پکارا جائے گا۔" اور دروازے پر جھولتا ہوا عنابی زربفت کا پردہ زرا سا ہٹا کر اندر چلے گئے۔

میں لکھی دروازے کی صنعتوں کو دیکھتا اور حیران ہوتا رہا۔ آخر دفتروں سے میرے کاغذات بن کر آگئے اور میرا نام پکارا گیا۔ ایک خواجہ سرا نے مجھ سے کئی سوال کیے، میرے جوابوں کو کاغذات سے ملایا، پھر عنابی پردے کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

"طاؤس چمن میں چلے جاؤ۔"

اب میں پردے کے دوسری طرف کھڑا تھا۔ اُس وقت کی گھبراہٹ میں وہاں کی بہار کیا دیکھتا، کئی روِشوں پر مور ناچتے گھومتے نظر آئے تو سمجھا یہی طاؤس چمن ہے۔ لیکن داروغہ نبی بخش کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کدھر کا رخ کروں۔ ہر طرف سناٹا سناٹا سا تھا۔ درختوں پر اور بارہ دری کی شکل کے بڑے بڑے پنجروں میں پرندے البتہ بہت تھے۔ فاختہ اور شاما کی آوازیں رہ رہ کر آرہی تھیں۔ کبھی کبھی دور رمنوں کی طرف کوئی ہاتھی چنگھاڑ دیتا تھا۔ بس۔ میں پریشان کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ دور پر سبز رنگ کے بہت بڑے بڑے مور کھڑے نظر آئے۔ زرا غور سے دیکھا تو پتا چلا درخت ہیں جنھیں موروں کی صورت میں چھانٹا گیا ہے۔

"طاؤس چمن،" میں نے دل میں کہا اور لپکتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ چمن کے پھاٹک پر بھی چاندی کے پتروں سے مور بنائے گئے تھے۔ اندر داروغہ تلے اوپر رکھی ہوئی سنگِ مرمر کی سلوں کے پاس کھڑے تھے۔

"چلے آؤ میاں کالے خاں،" انھوں نے مجھے پھاٹک کے باہر رکا ہوا دیکھ کر آواز دی اور میں اُن کے پاس چلا گیا۔ چمن کے بیچوں بیچ میں کئی مستری ایک نیچا سا چبوترا بنا رہے تھے۔ داروغہ نے انھیں کچھ

Scanned with CamScanner

ہدایتیں دیں، پھر میرا ہاتھ پکڑ کر چمن کا ایک چکر لگایا۔ میں ان درختوں کی چھنٹائی دیکھ کر حیران تھا۔ موروا، کی ایسی سچی شکلیں بنی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا درختوں کو پگھلا کر کسی سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے۔ نکوئی کلغیاں اور نوک دار چونچیں تک صاف نظر آ رہی تھیں۔ سب سے کمال کا وہ مور بنایا تھا جو گردن پیچھے کی طرف موڑ کر اپنے پروں کو کرید رہا تھا۔ ہر مور پاس پاس لگے ہوئے پتلے تنوں والے دو درختوں کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ یہی تنے مور کے پیروں کا کام کرتے تھے، اور ان کی کچھ جڑیں اس طرح زمین پر اُبھری ہوئی چھوڑ دی گئی تھیں کہ بالکل مور کے پنجے بن گئے تھے۔ داروغہ نے بتایا کہ روز اندھیرے منھ بہت سے مالی سیڑھیاں لگا کر اور پاڑ باندھ کر ایک ایک درخت کی چھنٹائی کرتے ہیں۔ میں نے تعریفوں پر تعریفیں شروع کیں تو داروغہ ہنسنے لگے۔

"تم ننگے پیڑوں ہی کو دیکھ کر عش عش کر رہے ہو،" انھوں نے کہا، "اِسی مہینے تو ان کی بیلیں اتاری گئی ہیں۔ نئی بیلیں چڑھ کے پھولیں گی تب پروں کے رنگ دیکھنا۔"

اس کے بعد وہ مجھے قریب کے ایک اور چمن میں لے گئے جس کے سب درخت شیر کی شکل کے تھے۔

"یہ اسد چمن ہے،" انھوں نے بتایا، "بادشاہ نے اس چمن کے درختوں کے بھی نام رکھے ہیں۔"

پھر وہ مجھے طاؤس چمن میں واپس لائے۔

"تمھارا کام طاؤس چمن کو آئینے کی طرح رکھنا ہے،" انھوں نے کہا اور ادھورے چبوترے کی طرف اشارہ کیا، "اس کی تیاری کے بعد کام کچھ بڑھے گا، بڑھ کر بھی آدھے دن سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ تمھاری باری ایک ہفتہ صبح سے دوپہر، ایک ہفتہ دوپہر سے مغرب تک۔"

انھوں نے میرے کاموں کی کچھ تفصیل بتائی۔ آخر میں کہا:

"آج سے تم سلطانِ عالم کے ملازم ہوئے۔ اللہ مبارک کرے۔ بس اب گھر جاؤ۔ کل سے آنا شروع کردو، اور یہ واہی تباہی پھرنا چھوڑ دو۔"

میں اُن کو دعائیں دینے لگا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو،" انھوں نے کہا اور مستریوں کو ہدایتیں دینے لگے۔

۲

بیوی کے مرنے کے بعد اُس دن پہلی بار میں نے اپنی فلک آرا کو غور سے دیکھا۔ اس نے بالکل ماں کا رنگ روپ پایا تھا۔ یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ چینی کی گڑیا اُس کالے دیو کی بیٹی ہے جسے لوگ شیدیوں کے احاطے کا کوئی حبشی سمجھ لیتے ہیں۔ مجھے فلک آرا پر ترس آیا اور خود پر غصہ بھی کہ ماں سے بچھڑ کر یہ ننھی سی جان اتنے دن تک باپ کی محبت کو بھی ترستی رہی۔ مگر خیر، دو ہی تین دن میں وہ مجھ سے ایسا ہل

گئی کہ اپنی ماں سے بھی نہ ہلی ہو گی، اور میں بھی بس کسی کسی دن بازار کی سیر کر لینے کے سوا کام پر سے سیدھا گھر آتا اور دروازے کے پیچھے اُس کے دوڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدموں کی آہٹ کا انتظار کرتا تھا۔

میں اس کے لیے بازار سے کچھ نہیں لاتا تھا۔ تنخواہ حالاں کہ حسین آباد سے زیادہ ملتی تھی لیکن قرضوں کی واپسی میں اتنی کٹ جاتی تھی کہ بس دال روٹی بھر کا خرچ نکل پاتا تھا۔ خود اس نے ابھی فرمائشیں کرنا نہیں سیکھا تھا۔ لیکن ایک دن مجھ سے باتیں کرتے کرتے اچانک وہ بولی:

"ابا، اللہ ہمیں پہاڑی مینا لادو۔"

میں چپ رہ گیا۔ بیوی کے مرنے کے بعد میں نے قسم سی کھالی تھی کہ اب گھر میں کوئی پرندہ نہیں پالوں گا، پھر بھی جب میں نے دیکھا کہ وہ امید بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے تو میں نے کہا:

"ہم اپنی پہاڑی مینا کو اُس کی پہاڑی مینا لا کے بالکل دیں گے۔"

اُس دن سے وہ روز اپنی مینا کا انتظار کرنے لگی۔ ایک دن میں نے چڑیا بازار کا ایک پھیرا بھی کیا۔ پہاڑی مینا کے دام دیسی مینا سے زیادہ تھے، اتنے زیادہ بھی نہیں کہ میں مول نہ لے سکتا، لیکن جتنی تنخواہ اس وقت ہاتھ آتی تھی اُس میں نہیں لے سکتا تھا۔ میں چڑیوں سے زراہٹ کر پنجرے والوں کے قریب چلا گیا۔ گاہکوں کی بھیڑ تھی اور اس بھیڑ میں اُس دن پہلی بار میں نے حضورِ عالم کے ایجادی قفس کا ذکر سُنا۔ لوگوں کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ بادشاہ کو نذر کرنے کے لیے بہت دن سے ایک بڑا پنجرا بنوا رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں ہر طرف اسی کا چرچا ہے۔ چڑیا بازار کے ان گاہکوں میں سے کسی نے اسے بنتے دیکھنے کا دعویٰ کیا اور یہ بھی کہا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا اتنا بڑا پنجرا قیصر باغ میں پہنچایا کس طرح جائے گا۔ اس پر ایک پرانے بڈھے نے کہا:

"اے میاں یہ وزیروں کے معاملے ہیں۔ یہ چاہیں تو سلطنت اِدھر سے اُدھر پہنچا دیں۔ آپ اِتی سی پنجری کے لیے ہلکان ہو رہے ہیں۔"

سب لوگ ہنسنے لگے۔ پنجرا دیکھنے کا ایک دعوے دار بولا:

"بڑے میاں، آپ بے دیکھے کی بات کر رہے ہیں۔ پنجری؟ اجی اگر آپ نے اس کی اونچائی۔۔۔"

"کتنی ہو گی؟ رومی دروازے سے زیادہ؟"

"رومی دروازہ تو خیر، لیکن حسین آباد کے پھاٹکوں سے کم نہ ہو گی۔"

"بس؟" بڑے میاں بولے، "پھر اسے تو وہ بائیں ہاتھ کی چھنگلیا میں اٹکا کر رومی دروازے کے اوپر۔۔۔"

قہقہے لگنے لگے اور میں وہاں سے گھر چلا گیا۔

***

دوسرے ہی دن میں نے طاؤس چمن میں بھی حضورِعالم کے ایجادی قفس کا ذکر سنا۔ چبوترا تیار ہو گیا تھا۔ چمن کی ہریالی میں اس کی چمکیلی سنگین سفیدی آنکھوں کو بھلی بھی لگتی تھی اور چبھتی بھی تھی۔ داروغہ نبی بخش نے مجھے بتایا کہ قفس اسی چبوترے پر رکھا جائے گا۔

"مگر داروغہ صاحب،" میں نے پوچھا، "اتنا بڑا قفس یہاں تک پہنچے گا کس طرح؟"

"ٹکڑوں ٹکڑوں میں آ رہا ہے، بھائی،" داروغہ نے بتایا، "پھر یہیں جوڑا جائے گا۔ حضورِعالم کے آدمی آتے ہوں گے۔ اب یہاں اُن کا تصرّف ہو گا۔ رات بھر کام کریں گے، کل قفس میں جانور چھوڑے جائیں گے۔۔۔"

"جانور چھوڑے جائیں گے یا بند کیے جائیں گے؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"ایک ہی بات ہے۔ اماں زبان کے کھیل چھوڑو اور مطلب کی سنو۔ حضورِعالم تو خیر آ ہی رہے ہیں، عجب نہیں حضرت سلطانِ عالم بھی تشریف لائیں۔ کل سے تمھارا اصلی کام شروع ہو گا۔ تمھیں ایجادی قفس اور اس کے جانوروں کی نگاہ داری پر رکھا گیا ہے۔ کیا سمجھے؟ اور کل آیئے گا ضرور۔ کہیں چھٹی نہ لے بیٹھیے گا۔"

اُسی وقت ایک چوبدار طاؤس چمن میں داخل ہوا۔ اُس نے داروغہ کے پاس جا کر چپکے چپکے کچھ باتیں کیں۔ داروغہ نے جواب میں کہا:

"سر آنکھوں پر آئیں۔ ہمارا کام پورا ہو گیا۔" انھوں نے چبوترے کی طرف اشارہ کیا، پھر مجھ سے کہا، "چلو بھائی۔ قفس کے لیے چمن چھوڑو۔"

***

دوسرے دن میں وقت سے بہت پہلے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ننھی فلک آرا نے روز کی طرح چلتے چلتے یاد دلایا:

"ابّا، ہماری پہاڑی مینا۔۔۔"

"ہاں بیٹی، بالکل لائیں گے۔"

"آپ روز بھول جاتے ہیں گے،" اُس نے ٹھنک کر کہا اور میں دروازے سے باہر آ گیا۔

کچھ دور جانے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دروازے کا ایک پٹ پکڑے مجھ کو دیکھ رہی تھی، بالکل اسی طرح جیسے اس کی ماں مجھے نوکری پر جاتے دیکھا کرتی تھی۔

رمنوں کے پاس سے ہوتا ہوا میں قیصر باغ کے شمالی پھاٹک میں، وہاں سے لکھی دروازے میں داخل ہوا اور سیدھا طاؤس چمن پہنچا۔ آج وہاں بڑی چہل پہل تھی۔ چمن کے باہر سپاہیوں کا پہرا تھا اور داروغہ نبی بخش اُن سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے:

Scanned with CamScanner

"آؤ بھئی کالے خاں، دیکھا میں نے کیا کہا تھا؟ حضرت سلطانِ عالم تشریف لا رہے ہیں۔ تم نے اچھا کیا جو آج سویرے سے آگئے۔ میں آدمی دوڑایا ہی چاہتا تھا۔"

پھر وہ مجھے لے کر طاؤس چمن میں داخل ہوئے۔ سامنے ہی چبوترے پر حضورِ عالم کا ایجادی قفس نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھتا تھا یہ قفس کوئی بڑا سا، خوب صورت پنجرا ہو گا، بس۔ مگر اسے دیکھ کر میری تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ قفس کیا تھا ایک عمارت تھی۔ اس کا ڈھانچ کوئی چار چار انگل چوڑی پٹریوں سے تیار کیا گیا تھا۔ پٹریاں ایک رُخ سے لال، دوسرے رُخ سے سبز تھیں۔ معلوم نہیں لکڑی کی تھیں یا لوہے کی، لیکن ان پر روغن ایسا کیا گیا تھا کہ لعل اور زمرّد کا دھوکا ہوتا تھا۔ جس دیوار کی پٹریاں باہر لال، اندر سبز تھیں اس کے مقابل والی دیوار کی پٹریاں باہر سبز، اندر لال رکھی گئی تھیں۔ اس طرح ایک طرف سے دیکھنے پر پورا قفس لال نظر آتا تھا، دوسری طرف سے جا کر دیکھو تو سبز۔ پٹریوں کے بیچ کی جگھوں میں پھولوں اور پرندوں کی شکلیں بناتی ہوئی روپہلی تیلیاں اور تیلیوں کی بیچ کی جگھوں میں سنہرے تاروں کی نازک جالیاں تھیں۔ ہر طرف چھوٹے دروازے اور کھڑکیاں بنائی گئی تھیں۔ اصل دروازہ قدِ آدم سے اونچا تھا اور اس کی پیشانی پر دو جل پریاں شاہی تاج کو تھامے ہوئے تھیں۔ چھت کے چاروں کونوں پر روپہلی بُرجیاں اور بیچ میں بڑا سا سنہرا گنبد تھا۔ گنبد کے کلس پر بہت بڑا چاند تھا۔ برجیوں کی کلسیاں تلے اوپر بٹھائے ہوئے ستاروں سے بنائی گئی تھیں۔

قفس کے بڑے دروازے سے کچھ ہٹ کر دس دس کی چار قطاروں میں چھوٹے چھوٹے گول پنجرے رکھے ہوئے تھے اور ہر پنجرے میں ایک پہاڑی مینا تھی۔ داروغہ نے کہا:

"انھیں اچھی طرح دیکھ لو کالے خاں، اصیل پہاڑی مینائیں ہیں، مینائیں نہیں سونے کی چڑیاں ہیں، بادشاہ نے خاص اس قفس کے لیے مہیا کرائی ہیں۔ انھیں شہزادیاں سمجھو۔"

پنجروں کے سامنے صندل کی ایک اونچی نازک سی میز تھی جس پر ہاتھی دانت سے پھول پتیاں اور طرح طرح کی چڑیاں بنی ہوئی تھیں۔

"اچھا اب اِدھر دیکھو،" داروغہ نے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "اس پر ایک ایک پنجرا رکھا جائے گا۔ حضرت ملاحظہ فرماتے جائیں گے۔ تم یہاں دروازے کے پاس کھڑے ہو گے۔ حضرت کے ملاحظے کے بعد ہر پنجرا ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہوا تمھارے پاس آئے گا۔ تمھارا کام جانور کو پنجرے سے نکال کر قفس میں ڈالنا ہو گا۔ یہ بہت چوکسی کا کام ہے۔ ذرا ڈھیلے پڑے اور چڑیا پھُرررر..."

"فکر نہ کیجیے اُستاد،" میں نے کہا، "ہزار چڑیا اِس پنجرے سے اُس پنجرے میں کر دوں، مجال ہے جو ہاتھ بہک جائے۔"

"سچ کہتے ہو بھائی،" داروغہ بولے، "پھر بھی، حضرت کا سامنا ہو گا، ذرا اوسان ٹھکانے رکھنا۔"

اس کے بعد وہ باہر چلے گئے اور میں پھر قفس کو دیکھنے لگا۔ اندر سے وہ ایک چھوٹا سا قیصر باغ ہو رہا تھا۔ فرش پر سنگِ سُرخ کی بجری بچھی ہوئی تھی۔ بیچ میں پانی سے بھرا ہوا حوض جس میں چھوٹی چھوٹی

سنہری کشتیاں تیر رہی تھیں اور ان کشتیوں میں بھی تھوڑا تھوڑا پانی تھا۔ فرش پر لال سبز چینی کی نیچی نیچی ناندوں میں پتلی لمبی شاخوں والے چھوٹے قد کے درخت تھے۔ دیواروں سے ملی ملی بسنت مالتی، جشن کانتا، جُوہی اور کچھ ولایتی پھولوں کی بیلیں تھیں۔ ان میں ٹہنیوں سے زیادہ پھول تھے اور انھیں اس طرح چھانٹا گیا تھا کہ قفس کی صنعتیں ان میں چھُپ جانے کے بجاے اَور اُبھر آئی تھیں۔ جگہ جگہ ستاروں کی وضع کے آئینے جڑے تھے جن کی وجہ سے قفس میں جدھر دیکھو پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ پانی کے کاسے، دانے کی کٹوریاں، ہانڈیاں، چھوٹے چھوٹے جھولے، گھومنے والے اڈے، پتلے پتلے مچان اور آشیانے ہر طرف تھے اور انھیں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ جگہ پرندوں کے لیے ہے۔

ہوا چل رہی تھی اور پورا قفس بہت ہلکی آوازمیں جھنجھنا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ طاوس چمن میں اچانک خاموشی چھا گئی ہے اور میں چونک پڑا۔ میں نے دیکھا بادشاہ حضورِعالم اور اپنے خاص خاص مصاحبوں کے ساتھ طاوس چمن میں داخل ہو رہے ہیں۔ سب سے پیچھے داروغہ نبی بخش سینے پر ہاتھ باندھے، سر جھکائے چل رہے تھے۔ صندل کی میز کے پاس آکر بادشاہ رُکے اور دیر تک قفس کو دیکھتے رہے۔

"واہ!" انھوں نے کہا، پھر وزیرِ اعظم کو دیکھا، "حضورِعالم، یہ ہمارے ہی یہاں کا کام ہے؟"

"جہاں پناہ،" حضورِعالم سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکے اور بولے، "ایک ایک تار لکھنؤ کے کاریگروں کا موڑا ہوا ہے۔"

"انھیں کچھ اوپر سے بھی دیا؟"

"سلطانِ عالم کے تصدق میں ایک ایک کی سات پشتیں کھائیں گی۔"

"اچھا کیا،" بادشاہ بولے، "تو کچھ بڑھا کے ہم سے بھی دلوا دیجیے۔"

حضورِعالم اَور زیادہ جھک گئے۔ میں بادشاہ کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ کوئی بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب آنکھیں جھکائے، ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ کچھ دیر بعد مجھے بادشاہ کی آواز سنائی دی:

"لاؤ بھئی نبی بخش۔"

میں نے داروغہ کی طرف دیکھا۔ انھوں نے سر اور ابروؤں کو بہت خفیف سی جنبش دے کر مجھے سنبھل جانے کا اشارہ کیا۔ اُن کے پیچھے سے کسی ملازم نے پہلا پنجرا بڑھایا۔ داروغہ نے اسے دونوں ہاتھوں میں سنبھالا اور دو قدم آگے بڑھ کر شیشے کے کسی نازک برتن کی طرح بہت احتیاط سے میز پر رکھ دیا اور پیچھے ہٹ گئے۔ بادشاہ نے پنجرا ہاتھ میں اٹھا لیا۔ مینا پنجرے میں اِدھر سے اُدھر پھُدک رہی تھی۔ بادشاہ نے ہنس کر کہا:

"زرا قرار تو لو، چُلبلی بیگم!" اور پنجرا واپس میز پر رکھ دیا۔

ایک مصاحب نے پنجرا اٹھا کر دوسرے مصاحب کو دیا، دوسرے نے تیسرے کو، اور آخر میں پنجرا میرے پاس آگیا۔ میں نے اسے قفس کے دروازے کی جھری کے قریب کیا اور بڑی پھُرتی کے ساتھ چُلبلی بیگم کو نکال کر قفس میں ڈال دیا۔ ایک اَور ملازم نے خالی پنجرا میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اتنی دیر میں

Scanned with CamScanner

میز پر دوسرا پنجرا آگیا تھا۔ بادشاہ نے اسے بھی ہاتھ میں اٹھایا۔ اس کی مینا اڈے پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بادشاہ نے اسے ہلکی سی چمکاری دی تو اس نے اَور زیادہ سر جھکا لیا۔ بادشاہ نے کہا:

"اے بی، صورت تو دکھنے دو،" پھر پنجرا میز پر رکھ کر بولے، "یہ حیادار دُلھن ہیں۔"

پھر یہ پنجرا میرے پاس آیا اور میں نے حیادار دُلھن کو بھی قفس میں پہنچا دیا۔ اسی طرح ایک کے بعد ایک مینائیں بادشاہ کے پاس آتی رہیں اور وہ اُن کے نام رکھتے رہے۔ کسی کا نام نازک قدم رکھا، کسی کا آہو چشم، کسی کا ابرو گن؛ ایک پنجرا جیسے ہی بادشاہ کے ہاتھ میں آیا اُس کی مینا نے پر پھڑپھڑا کر چہچہانا شروع کر دیا۔ بادشاہ نے اس کا نام زہرہ پری رکھا۔ دیر تک پنجرے میرے ہاتھ میں آتے اور میناؤں کے نام میرے کان میں پڑتے رہے۔ بادشاہ کی موجودگی سے شروع شروع میں مجھے جو گھبراہٹ ہو رہی تھی وہ اب کچھ کم ہو گئی تھی اور میں ہر مینا کو قفس میں ڈالنے سے پہلے ایک نظر دیکھ بھی لیتا تھا۔ مجھ کو سب مینائیں ایک سی معلوم ہو رہی تھیں، لیکن بادشاہ کو ہر ایک میں کوئی نہ کوئی بات سب سے الگ نظر آتی اور وہ اُسی کے لحاظ سے اس کا نام رکھتے تھے۔ بائیس تیئیس پنجروں کے بعد اچانک میں نے بادشاہ کی آواز سنی:

"فلک آرا۔"

اور ایک پنجرا میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے دل ہی دل میں دُہرایا، "فلک آرا"، اور اس مینا کو غور سے دیکھا۔ وہ بھی دوسری میناؤں کی طرح تھی، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بادشاہ نے اس کا نام فلک آرا کیوں رکھا ہے۔ مینا کو دیکھ کر انھوں نے جو کچھ کہا ہو گا وہ میں سن نہیں پایا تھا۔ میں نے فلک آرا کو اَور غور سے دیکھا۔ وہ گردن اٹھائے پنجرے میں بیٹھی تھی۔ اُس نے بھی مجھ کو دیکھا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں اپنی ننھی فلک آرا کو دیکھ رہا ہوں۔ اس میں مجھے کچھ دیر لگ گئی اور ابھی پنجرا میرے ہاتھ میں اور چڑیا پنجرے ہی میں تھی کہ میں نے دیکھا کہ اگلا پنجرا میری طرف آ رہا ہے۔ میں نے بوکھلا کر فلک آرا کو ایسے بے تکے پن سے قفس میں ڈالا کہ وہ میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ خیریت گذری کہ کسی نے دیکھا نہیں اور فلک آرا قفس میں پہنچ کر ایک جھولے پر بیٹھ گئی۔

اس کے بعد سولہ سترہ پنجرے اَور آئے۔ ہر مینا کو قفس میں ڈالنے سے پہلے میں ایک نظر فلک آرا پر ضرور ڈال لیتا تھا۔ وہ اسی طرح جھولے پر بیٹھی ہوئی تھی اور مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اگرچہ میں اس میں اور دوسری میناؤں میں کوئی فرق نہیں بتا سکتا لیکن اسے سب میناؤں سے الگ پہچان سکتا ہوں۔

چالیسوں مینائیں قفس میں پہنچ چکی تھیں اور ادھر سے اُدھر اُڑتی پھر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد فلک آرا نے بھی اپنے جھولے پر سے ہلکی سی اُڑان بھری اور قفس کے پوربی حصے میں ایک ٹہنی پر جا بیٹھی۔ بادشاہ دھیمی آواز میں داروغہ کو کچھ سمجھا رہے تھے کہ رمنوں کی طرف سے ایک شیر کی دہاڑ سنائی دی۔ بادشاہ نے بولتے بولتے رک کر پوچھا:

"یہ موہنی کس پر بگڑ رہی ہیں نبی بخش؟"

داروغہ چپکے سے مسکرائے اور سر زرا نیچے کر کے آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولے:

"غلام جان کی امان پاوے تو عرض کرے۔"

"بتاؤ بتاؤ۔"

"وہ سلطانِ عالم ہی پر بگڑ رہی ہیں۔"

"ارے ارے، ہم نے کیا کیا ہے بھئی؟" بادشاہ نے پوچھا، پھر اُن کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا، "اچھا اچھا، ہم سمجھ گئے۔ آج ہم اُن سے ملے بغیر سیدھے اِدھر جو چلے آئے، یہی بات ہے نہ؟"

داروغہ سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر جھک گئے اور بولے:

"سلطانِ عالم سے زیادہ اُن کی ادائیں کون پہچانے گا۔ اسی پر ناز دکھاتی ہیں۔ پھر بیماری سے اٹھی ہیں، اس سے اَور ٹھنکی ہو رہی ہیں۔ غلام کی تو بات ہی نہیں سنتیں۔"

"سچ کہتے ہو،" بادشاہ نے کہا، مصاحبوں کی طرف دیکھا، پھر حضورِ عالم کی طرف، پھر نبی بخش کی طرف، اور بولے، "تو چلو بھئی، ان کو منائیں۔"

سب لوگ اور ان کے پیچھے پیچھے داروغہ بھی چمن سے باہر نکل گئے۔ اتنی دیر میں ملازموں نے دانے کی تھیلیاں اور پانی کے بڑے بدھنے لا کر قفس کے دروازے کے پاس رکھ دیے تھے۔ میں نے دروازہ زرا سا کھولا اور ترچھا ہو کر قفس میں داخل ہو گیا۔ ایک چھوٹے دروازے سے ہاتھ بڑھا بڑھا کر تھیلیاں اور بدھنے اٹھا لیے اور سب برتنوں میں دانہ پانی بھر دیا۔ مینائیں اڑتی ہوئی ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر بیٹھ رہی تھیں۔ سب اُسی طرح ایک سی نظر آ رہی تھیں، لیکن فلک آرا کو میں نے پھر پہچان لیا اور اُس کے پاس کھڑا کچھ دیر اسے چمکارتا رہا۔

"میں تمھیں فلک مینا کہوں گا،" میں نے اسے چپکے سے بتایا۔

قفس سے باہر نکل کر میں طاؤس چمن کی حد بندی کرنے والی بَنیوں میں پہنچا جنھیں جالی سے گھیر کر اوپر جالی ہی کی چھتیں بنائی گئی تھیں۔ ان میں طرح طرح کی ہزاروں چڑیاں چہک رہی تھیں۔ یہاں بھی میں نے دانے پانی کے برتن بھرے، زمین کی صفائی کی، چھوٹی جھاڑیوں پر پانی کے چھینٹے دیے اور پھر طاؤس چمن میں چلا آیا۔

داروغہ رمنوں سے واپس آ گئے تھے اور قفس کے پاس کھڑے شاید میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔

"چلو بھائی، یہ مہم بھی سر ہوئی،" انھوں نے کہا اور قفس کو چاروں طرف سے گھوم پھر کر دیکھنے لگے۔

"ہمارے شہر میں بھی کیسا کیسا کاریگر پڑا ہے، داروغہ صاحب،" میں نے کہا۔

لیکن داروغہ قفس کی سیر دیکھنے میں محو تھے۔

"اتنا ہم کہیں گے،" آخر وہ بولے، "حضورِ عالم نے اسے دل لگا کر بنوایا ہے۔"

Scanned with CamScanner

۳

طاؤس چمن میں میرا کام کچھ مشکل نہیں تھا۔ تھوڑے دنوں میں مجھ کو ہر بات کا ڈھب آ گیا۔ میں جلدی کام ختم کر لیتا اور جتنا وقت بچتا وہ قفس کی مزید صفائی ستھرائی میں لگا دیتا تھا۔ مینائیں اب مجھ کو اچھی طرح پہچاننے لگی تھیں اور مجھے دیکھتے ہی دانے کے خالی برتنوں کے پاس بیٹھنا شروع کر دیتی تھیں۔ فلک مینا کو شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پر میری خاص توجہ ہے۔ وہ مجھ سے بہت ہل گئی تھی، مجھے قفس کے دروازے پر دیکھ کر قریب آتی اور سب میناؤں سے پہلے چہچہاتی تھی۔

ایک دن محلات میں معلوم نہیں کیا تھا کہ طاؤس چمن اور ایجادی قفس کی سیر کو کوئی نہیں آیا۔ میں نے اپنا سارا کام ختم کر لیا تھا اور اب قفس کو ذرا پیچھے ہٹ کر دیکھ رہا تھا۔ حوض میں تیرتی ہوئی دو کشتیاں آپس میں مل گئی تھیں اور دیکھنے میں اچھی نہیں معلوم ہو رہی تھیں۔ میں ایک بار پھر قفس میں داخل ہوا اور کشتیوں کو الگ الگ کر کے وہیں کھڑا رہا۔

چہچہاتی ہوئی مینائیں قفس بھر میں اڑتی پھر رہی تھیں۔ سب کے پوٹے بھرے ہوئے تھے اس لیے کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ لیکن فلک مینا بار بار میرے قریب آتی، زور زور سے بولتی، پھر دور کسی اڈے پر بیٹھ جاتی، پھر وہاں سے اڑان بھر کر میری طرف آتی، بولتی اور دور بھاگ جاتی۔ بالکل اسی طرح میری اپنی فلک آرا کسی کسی دن مجھ سے کھیل کرتی تھی۔ مجھے یہ سوچ کر اس پر بڑا ترس آیا کہ روز میں جب واپس گھر پہنچتا ہوں تو وہ مجھ سے بھاگ کر چھپنے کے بجائے دروازے ہی پر ملتی ہے اور پوچھتی ہے، "ابا، ہماری مینا لائے؟" اور میرے خالی ہاتھ دیکھ کر اُداس ہو جاتی ہے۔ اس کا اترا ہوا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اچانک میرے دل میں برائی آ گئی اور میں نے کچھ اور ہی سوچنا شروع کر دیا۔ قفس میں چالیس مینائیں اڑتی پھرتی ہیں۔ ان کی صحیح صحیح گنتی کرنا آسان نہیں۔ آسان کیا، ممکن ہی نہیں، ستاروں کی شکل والے آئینے ایک ایک کو دس دس کر کے دکھاتے ہیں۔ یوں بھی چالیس اور اُنتالیس میں فرق ہی کون سا ہے؟ ایک مینا کم ہو جائے تو کسی کو پتا بھی نہ چلے گا۔ اُسی وقت فلک مینا میرے قریب آ کر بولی اور میں نے ہاتھ لپکا کر اُسے بہت آہستگی کے ساتھ پکڑ لیا۔ اس کے پروں کو سہلاتا ہوا میں قفس کے ایک گوشے میں آ گیا اور اڑتی ہوئی میناؤں کو گننے لگا۔ بار بار گننے پر بھی پتا نہیں چل پایا کہ مینائیں چالیس ہیں یا اُنتالیس۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ فلک مینا کو میں نے ایک جھولے پر بٹھا کر ہلکا سا پینگ دیا اور قفس سے باہر نکل آیا۔

اُس دن لکھی دروازے سے نکلتے نکلتے میں فلک مینا کو گھر لے آنے کا پکا فیصلہ کر چکا تھا اور اسے ایک معمولی سا کام سمجھ رہا تھا جس میں مجھ کو شرم یا پشیمانی والی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی، بلکہ شرمندگی تھی تو صرف اپنی فلک آرا سے کہ میں اتنے دن خواہ مخواہ اسے مینا کے لیے ترساتا رہا، اور پچھتاوا تھا تو بس اس کا کہ فلک مینا کو آج ہی قفس سے کیوں نہیں نکال لایا۔

چڑیا بازار میں رک کر میں نے تھوڑے مول تول کے بعد ایک سستا سا پنجرا خرید لیا۔ پنجرے والے

Scanned with CamScanner

نے پیسے گنتے گنتے پوچھا:

"کون سا جنور ہے؟"

"پہاڑی مینا،" میں نے کہا اور میرا دل آہستہ سے دھڑکا۔

"پہاڑی مینا پالی ہے تو شیدی صاحب پنجڑا بھی ویسا ہی رکھنا تھا،" اس نے کہا، "خیر، آپ کی خوشی۔"

میں پنجرا لے کر آگے بڑھ گیا، لیکن چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے اور گلا خشک ہو گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی میرے کان میں کہہ رہا ہو، "کالے خاں! بادشاہی پرندے کی چوری؟!" راستے بھر مجھ کو یہی آواز سنائی دیتی رہی۔ کئی بار ارادہ کیا پنجرا پھیر آؤں، پھر خیال آیا فلک آرا کو کسی طرح خالی پنجرے سے بہلا لوں گا۔ گھر پہنچتے پہنچتے مجھے خود پر حیرت ہونے لگی کہ میں نے ایسی خطرناک بات کا ارادہ کیا تھا۔ خوشی بھی بہت ہو رہی تھی کہ میں نے فلک مینا کو قفس سے نکال نہیں لیا۔

یقین مجھے اب بھی تھا کہ ایک مینا کی چوری پکڑی نہیں جا سکتی تھی پر بھی معلوم ہو رہا تھا موت کے منھ سے نکل آیا ہوں۔

گھر پہنچا تو فلک آرا میرے ہاتھ میں پنجرا دیکھ کر خوشی سے چیخ پڑی:

"ہماری مینا آ گئی!"

لیکن جب وہ دوڑتی ہوئی میرے قریب آئی تو پنجرا خالی دیکھ کر پھر اس کا چہرہ اتر گیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور روہانسی ہو گئی۔ میں نے اُسے گود میں اٹھا لیا اور کہا:

"بھئی آج پنجرا آیا ہے، کل مینا بھی آ جائے گی۔"

"نہیں،" اس نے کہا، "آپ جھوٹ بہت بولتے ہیں۔"

"جھوٹ نہیں بیٹی، کل دیکھنا،" میں نے کہا، "تمھاری مینا ہم نے لے بھی لی ہے۔"

"سچ؟" وہ چہک کر بولی اور اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا، "تو وہ کہاں ہے؟"

"ایک بہت بڑے سے پنجرے میں ہے،" میں نے کہا، "وہ تو ضد کر رہی تھی کہ ہم آج ہی بہن فلک آرا پاس جائیں گے۔ ہم نے کہا، بھئی آج تو ہم تمھارے لیے پنجرا مول لیں گے۔ پھر فلک آرا پنجرے کو دھوئے گی، سجائے گی، اس میں تمھارے کھانے پینے کے برتن رکھے گی، تب ہم تم کو لے چلیں گے۔"

فلک آرا کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ فوراً میری گود سے اتر کر اس نے پنجرے کو سینے سے لگا لگا کر چوما، اُسی وقت اسے خوب اچھی طرح دھویا پونچھا، اُس کے اندر کامنی کی پتیوں کا فرش کیا، پھر مٹی کا آب خورہ اور دانے کے لیے سکوری رکھی۔ مجھ سے مینا کی ایک ایک بات پوچھتی رہی: اس کی چونچ کیسی ہے، پَر کس رنگ کے ہیں، کیا کیا باتیں کرتی ہے۔ رات کو اسے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ بار بار جاگ کر مینا کی باتیں کرنے لگتی تھی۔

Scanned with CamScanner

دوسرے دن گھر سے نکلا تو دور تک اس کی آواز سنائی دیتی رہی:

"آج ہماری مینا آئے گی، آج ہماری مینا آئے گی۔"

راستے بھر میں یہی سوچتا رہا کہ آج جب خالی ہاتھ گھر لوٹوں گا تو فلک آرا سے کیا بہانہ کروں گا۔ چمن میں میناؤں کو دانہ پانی دیتے ہوئے بھی طرح طرح کے بہانے سوچتا رہا۔ اس دن کام میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا پھر بھی مغرب تک میں نے سارے کام نپٹا دیے اور ایک بار پھر پلٹ کر قفس کے اندر آگیا۔ مجھے خیال آیا کہ آج میں نے فلک مینا کی طرف دیکھا تک نہیں ہے۔ اس وقت وہ قفس کی پچھمی جالی کے ایک مچان پر بیٹھی ہوئی تھی اور چُپ چاپ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے گردن گھمالی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اسے چمکارا۔ اُس نے دھیرے سے پر پھڑپھڑائے اور پھر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے قفس میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ سب مینائیں اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھی تھیں۔ کل مجھے شاہی مینا کی چوری کے خیال سے جو ڈر لگا تھا وہ اچانک جاتا رہا، فلک آرا کو بہلانے کے لیے جو بہانے سوچے تھے وہ بھی دماغ سے نکل گئے اور مینا کی چوری پھر ایک معمولی بات معلوم ہونے لگی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ طاؤس چمن میں سناٹا تھا، مالی کام ختم کر کے جا چکے تھے۔ کوئی مجھے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے پھر فلک مینا کو چمکارا۔ اس نے پھر دھیرے سے پر پھڑپھڑا کر میری طرف دیکھا اور میں نے ایک دم سے ہاتھ بڑھا کر اُسے پکڑ لیا۔ اس نے خود کو چھڑانے کے لیے زور کیا لیکن جب میں چمکار چمکار کر اس کے پروں پر ہاتھ پھیرنے لگا تو آنکھیں موند لیں اور بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میں کچھ دیر دم سادھے کھڑا رہا، پھر اسے اپنے کُرتے کی لمبی جیب میں ڈالا اور قفس سے باہر نکل آیا۔

لکھی دروازے تک کئی جگہ پہرے کے سپاہی ملے لیکن انھیں معلوم تھا کہ میں طاؤس چمن میں شام تک کی باری کر رہا ہوں۔ کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا اور میں جیب میں ہاتھ ڈالے ڈالے قیصر باغ سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جی تو چاہتا تھا پوری رفتار سے دوڑنے لگوں لیکن کسی طرح اپنے قدموں کو تھامے ہوئے چلتا رہا۔

گھر پہنچا۔ فلک آرا سو چکی تھی۔ جمراتی کی اماں میرا راستہ دیکھ رہی تھیں۔ انھیں کھانا دے کر رخصت کیا۔ مکان کا دروازہ اندر سے بند کر کے مینا کو جیب سے نکالا اور پنجرے کے پاس لے گیا۔ آج فلک آرا نے پنجرے کو اور بھی سجا رکھا تھا۔ تیلیوں کے بیچ بیچ میں چاندنی کے پھول اٹکائے تھے، جھاڑو کے تنکے میں رنگین کپڑے کی کترن باندھ کر اپنے خیال میں جھنڈا بنایا تھا جو پنجرے کے سہارے ٹیڑھا ٹیڑھا کھڑا تھا، پنجرے کے اندر آب خورے میں لبالب پانی بھرا ہوا تھا، سکوری میں روٹی کے ٹکڑے بھیگ رہے تھے اور پُرانی روئی کی دو تین بتیاں سی بنا کر شاہی مینا کے لیے گاؤ تکیے تیار کیے گئے تھے۔ میں نے مینا کو آہستہ سے پنجرے میں پہنچایا اور پنجرا الگنی میں لٹکا دیا۔ مینا کچھ دیر تک پنجرے میں اِدھر سے اُدھر چکر کاٹتی رہی، پھر آرام سے ایک جگہ ٹھہر گئی۔

صبح فلک آرا کے کھلکھلانے اور مینا کے چہچہانے کی آوازوں سے میری آنکھ کھلی۔ فلک آرا نے

معلوم نہیں کس وقت الگنی کے نیچے مونڈھا رکھ کر پنجرا اتار لیا تھا اور اب اُسی مونڈھے پر پنجرا رکھے، زمین پر گھٹنے ٹیکے بار بار پنجرے کو چومتی تھی اور مینا بار بار بول رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی فلک آرا نے خبر سنائی:

"ابا، ہماری مینا آ گئی۔"

دیر تک وہ مجھے بتاتی رہی کہ مینا کیا کہہ رہی ہے۔ میں نے بھی پنجرے کے پاس بیٹھ کر مینا سے دو تین باتیں کیں، لیکن اس نے اِس طرح میری طرف دیکھا گویا مجھے پہچانتی ہی نہیں۔ اتنے میں فلک آرا نے پوچھا:

"ابا، اس کا نام کیا ہے؟"

"فلک آرا،" میرے منھ سے نکلا، پھر میں رکا اور بولا، "فلک آرا بیٹی، اس کا نام مینا ہے۔"

"واہ، مینا تو یہ خود ہے۔"

"اسی لیے تو اس کا نام مینا ہے۔"

"تو مینا تو سب کا نام ہوتا ہے۔"

"اسی لیے اس کا بھی نام مینا ہے۔"

اس طرح میں اس کے چھوٹے سے دماغ کو الجھاتا رہا۔ اصل میں خود میرا دماغ الجھا ہوا تھا۔

کئی دن تک میں ڈرتا ہوا طاؤس چمن پہنچتا اور ڈرا ہوا وہاں سے واپس آتا۔ ہر وقت چوکنا رہتا۔ قیصر باغ میں کوئی مجھے زرا غور سے دیکھتا تو جی چاہتا بھاگ کھڑا ہوں۔ گھر پر دیکھتا کہ فلک آرا مینا کا پنجرا سامنے رکھے اس سے دنیا جہان کی باتیں کر رہی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بتانا شروع کر دیتی کہ آج مینا نے اس سے کیا کیا باتیں کی ہیں۔ دھیرے دھیرے میری وحشت کم ہونے لگی، اور ایک دن، جب فلک آرا مینا کی باتیں بتا رہی تھی، میں نے کہا:

"مگر تمھاری مینا ہم سے تو بولتی نہیں۔"

"آپ بھی تو اس سے نہیں بولتے، وہ شکایت کر رہی تھی۔"

"اچھا؟ کیا کہہ رہی تھی بھلا؟"

"کہہ رہی تھی تمھارے ابا تم کو چاہتے ہیں، ہم کو نہیں چاہتے۔"

"مگر اس کی بہن تو اسے بہت چاہتی ہے۔"

"کون بہن؟"

"فلک آرا شہزادی!"

اس پر وہ اس طرح ہنسی کہ میرا سارا ڈر ختم ہو گیا اور دوسرے دن میں بے دھڑک طاؤس چمن میں داخل ہوا۔ شام کے وقت میں نے کئی مرتبہ میناؤں کو گنا مگر صحیح صحیح نہیں گن سکا۔ صفائی کے بہانے سے قفس کے سارے آئینوں کو اتار لیا، پھر گنا، پھر بھی گنتی غلط ہو گئی۔ اس کے بعد میں روز کسی نہ کسی حیلے سے دو ایک مالیوں کو طاؤس چمن میں بلاتا اور ان سے میناؤں کی گنتی کراتا۔ ان کی بتائی ہوئی تعدادیں ایسی

Scanned with CamScanner

ہوتیں کہ مجھے ہنسی آجاتی تھی۔

مالیوں سے میناؤں کو گنوانے میں اتنا ہی مزہ آنے لگا جتنا فلک آرا کو اپنی مینا سے باتیں کرنے میں آتا ہوگا، اور یہ میرا روز کا معمول ہو چلا تھا کہ ایک دن بادشاہ پھر طاؤس چمن میں تشریف لائے۔

ایجادی قفس کے پاس رک کر وہ درباریوں اور داروغہ نبی بخش سے باتیں کرنے لگے۔ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن میرا دل دھڑدھڑ کر رہا تھا۔ بادشاہ نبی بخش کو رمنے کے ہاتھیوں کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ ایک نظر قفس پر بھی ڈال لیتے اور اس کی میناؤں کو ادھر سے اُدھر اڑتے دیکھتے تھے۔ ایک بار انھوں نے ذرا زیادہ دیر تک میناؤں کو دیکھا، پھر نبی بخش سے پوچھا:

"ان کی تعلیم شروع کرادی؟"

"عالم پناہ،" داروغہ ہاتھ جوڑ کر بولے، "میر داود روز فجر کے وقت آکر سکھاتے ہیں۔"

اب بادشاہ نے اپنے مصاحبوں سے قفس کی باتیں شروع کر دیں۔ اس کے بنانے میں کاریگروں نے جو جو صنعتیں دکھائی تھیں ان کا ذکر ہوا۔ کچھ کاریگروں کے نام بھی لیے گئے جن میں بعض لکھنؤ کے مشہور سُنار تھے۔ میری گھبراہٹ اب دور ہو چکی تھی۔ میں سوچ رہا تھا ہمارے بادشاہ اپنے نوکروں سے بھی کیسے التفات کے ساتھ بات کرتے ہیں اور اُن کی آواز کس قدر نرم ہے۔ اُسی وقت مجھے بادشاہ کی نرم آواز سنائی دی:

"بھئی نبی بخش، آج فلک آرا نہیں دکھائی دے رہی ہیں۔"

ایک دم سے جیسے کسی نے میرے بدن سے سارا خون کھینچ لیا۔ داروغہ نے کہا:

"جہاں پناہ، کہیں ٹہنیوں میں چھپ گئی ہیں۔ ابھی تو سارے میں اڑتی پھر رہی تھیں۔"

بادشاہ دھیرے سے ہنسے اور بولے:

"ہم سے شرما تو نہیں رہی ہیں؟ اور انھیں دیکھو، حیادار دُلھن کو، کیسی چُہلیں کر رہی ہیں۔ بھئی حیادار دُلھن، یہی تمھارے لچھن رہے تو ہم تمھارا نام بدل کر شوخ ادا رکھ دیں گے۔"

سب لوگوں نے سر جھکا کر منھ پر رومال رکھ لیے اور بے آواز ہنسنے لگے۔ کوئی اَور وقت ہوتا تو میں بھی بادشاہ کو اس طرح مزے مزے کی باتیں کرتے دیکھ کر نہال ہو جاتا اور اپنے تمام جاننے والوں کے سامنے ان کا ایک ایک لفظ دُہراتا، لیکن اِس وقت تو میرے کانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی: "بھئی نبی بخش، آج فلک آرا نہیں دکھائی دے رہی ہیں۔"

بادشاہ اب پھر ہاتھیوں کی باتیں کر رہے تھے اور میں قفس سے کچھ ہٹ کر کھڑا ہوا تھا۔ بادشاہ کی بات سن کر پہلے تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میں اچانک سکڑ کر بالشت بھر کا رہ گیا ہوں، لیکن اب یہ معلوم ہو رہا تھا کہ میرا بدن پھیل کر اتنا بڑا ہوا جا رہا ہے کہ میں کسی کی بھی نظروں سے خود کو چھپا نہیں پاؤں گا۔ میں مٹھیاں بھینچ بھینچ کر سکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کش مکش میں مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ بادشاہ کب واپس گئے۔ جب میں چونکا تو طاؤس چمن میں سناٹا تھا، صرف قفس کے اندر اڑتی میناؤں کے پروں کی آواز

Scanned with CamScanner

آرہی تھی۔

میرا بس نہیں تھا کہ ابھی اُڑ کر گھر پہنچ جاؤں اور شاہی مینا کو لا کر قفس میں ڈال دوں۔ مغرب کے وقت تک کسی طرح کام ختم کر کے گھر واپس ہوا۔ راستے بھر تو اسی فکر میں رہا کہ مینا کو کسی طرح قفس میں پہنچا دوں۔ لیکن جب گھر پہنچا اور فلک آرا نے روز کی طرح چہک چہک کر مینا کا دن بھر کا حال سنانا شروع کیا تو مجھے یہ فکر بھی لگ گئی کہ مینا کو تو لے جاؤں مگر فلک آرا سے کیا کہوں گا۔ اُس رات بہت دیر تک جاگتا اور کروٹیں بدلتا رہا۔

دن چڑھے سو کر اٹھا تو خیال آیا کہ کل سے طاؤس چمن میں میری باری صبح کی ہو جائے گی۔ پھر ایک ہفتے تک مینا کو قفس میں پہنچانا آسان نہ ہو گا، جو کچھ کرنا ہے آج ہی کرنا ہے۔ فلک آرا اس وقت بھی مینا سے کھیل رہی تھی۔ دونوں میں جدائی ڈال دینے کا خیال مجھے تکلیف دے رہا تھا لیکن اسی وقت ایک تدبیر میرے دماغ میں آ گئی۔ میں نے پنجرے کے پاس بیٹھ کر مینا کو غور سے دیکھا، اور فلک آرا سے کہا:

"بیٹی، یہ تمھاری مینا کی آنکھیں کیسی ہو رہی ہیں؟"

"ٹھیک تو ہیں،" فلک آرا نے مینا کی آنکھیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں بھی نہیں ٹھیک ہیں۔ کیسی مَیلی مَیلی تو ہو رہی ہیں، اور دیکھو کنارے کنارے زردی بھی ہے۔ اُفوہ اسے بھی یرقان ہو گیا ہے۔"

"اَرقان کیا؟" فلک آرا نے گھبرا کر پوچھا۔

"بہت بُری بیماری ہوتی ہے۔ بادشاہ کے باغ کی کتنی مینائیں اس میں مر چکی ہیں۔"

فلک آرا اور بھی گھبرا گئی، بولی:

"تو حکیم صاحب سے دوا لے آؤ۔"

"حکیم صاحب چڑیوں کی دوائیں تھوڑی دیتے ہیں،" میں نے کہا، "اسے تو نصیر الدین حیدر بادشاہ کے انگریزی اسپتال میں بھرتی کرانا ہو گا۔ شاید بچ ہی جائے۔ اس کی حالت تو بہت خراب ہے، پھر بھی شاید --- دیکھو کہیں راستے ہی میں نہ مر جائے۔"

غرض میں نے بھولی بھالی بچی کو اتنا دہلایا کہ وہ رو کر کہنے لگی:

"اللہ ابا اسے جلدی لے کر جاؤ۔"

"ابھی تو اسپتال بند ہو گا،" میں نے اسے بتایا، "جب کام پر جائیں گے تو اسے لیتے جائیں گے۔"

جانے کا وقت آیا تو میں نے مینا کو پنجرے سے نکالا۔ فلک آرا بولی:

"ابا، پنجرے ہی میں لے جاؤ۔"

"وہاں چڑیاں پنجروں میں نہیں رکھی جاتیں۔ ان کے لیے پورا مکان بنا ہوا ہے۔ تم پنجرا صاف کر کے رکھو۔ جب یہ اسپتال سے اچھی ہو کر آئے گی تو مزے سے اپنے پنجرے میں رہے گی۔"

Scanned with CamScanner

فلک آرا نے مینا کو میرے ہاتھ سے لے لیا۔ دیر تک اسے پیار کرتی رہی، پھر بولی:

"ابا، اس پر کوئی دعا پھونک دو۔"

"راستے میں پھونک دیں گے،" میں نے کہا، "لاؤ دیر ہو رہی ہے۔ اسپتال بند ہو جائے گا۔"

مینا کو اس کے ہاتھ سے لے کر میں نے کُرتے کی جیب میں ڈال لیا اور جلدی سے دروازے کے باہر نکل آیا۔ جانتا تھا کہ فلک آرا ہر روز کی طرح دروازے کا ایک پٹ پکڑے کھڑی ہوئی مجھے جاتے دیکھ رہی ہے، لیکن میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

***

قسمت نے ساتھ دیا اور طاؤس چمن میں داخل ہوتے ہی موقع مل گیا۔ مالیوں میں سے کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں قفس کے اندر آ گیا۔ مالی اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بار زور سے کھانس کر گلا صاف کیا پھر بھی کسی نے میری طرف نہیں دیکھا۔ اب قفس کے ایک کنارے پر جا کر میں نے فلک مینا کو جیب سے نکالا اور ہلکے سے اُچھال دیا۔ اُس نے پر پھٹ پھٹا کر خود کو ہوا میں ٹکایا، پھر ایک جھولے پر بیٹھ گئی، وہاں سے اڑی، ایک مچان پر پہنچی، مچان سے نیچے غوطہ مارا اور حوض کے کنارے آ بیٹھی۔ جہاں بھی وہ بیٹھتی دوسری کئی مینائیں اس کے پاس آ بیٹھتیں اور اس طرح چہچہاتیں جیسے پوچھ رہی ہوں، بہن اتنے دن کہاں رہیں؟

جس دن طاؤس چمن میں مینائیں آئی ہیں اس کے بعد سے آج پہلا دن تھا کہ میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ ننھی فلک آرا کو بہلانے کے لیے بہت سی باتیں میں نے راستے ہی میں سوچ لی تھیں اور مجھے یقین تھا کہ کئی دن وہ اسی میں خوش رہے گی کہ اس کی مینا اسپتال میں اچھی ہو رہی ہے، پھر اسے بھول بھال جائے گی۔ آج میں نے قفس کی ساری میناؤں کو غور سے دیکھا اور مجھے بھی اُن میں کچھ کچھ فرق نظر آیا، اور فلک مینا کو تو میں ہزاروں میناؤں میں پہچان سکتا تھا۔ اس وقت وہ سب سے الگ تھلگ ایک ٹہنی پر بیٹھی تھی اور ٹہنی دھیرے دھیرے نیچے اوپر ہو رہی تھی۔ میں نے قریب جا کر اس کو چمکارا۔ وہ چپ چاپ میری طرف دیکھنے لگی۔

"فلک آرا یاد آ رہی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

وہ اسی طرح میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے کہا:

"ہم سے ناراض تو نہیں ہو؟"

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں بالکل بادشاہ کی طرح بول رہا ہوں۔ میں آپ ہی آپ ڈر گیا اور جلدی جلدی قفس کا کام ختم کر کے باہر نکل آیا۔

Scanned with CamScanner

۴

گھر آ کر، جیسا کہ میرا خیال تھا، مجھے فلک آرا کو بہلانے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ میں نے خوب مزے لے لے کر اسے بتایا کہ کس طرح اس کی مینا نے کڑوی دوا پینے سے انکار کر دیا اور اس کے لیے میٹھی میٹھی دوا بنوائی گئی۔

"اور بھیا جب اُسے مونگ کی کھچڑی کھانے کو دی گئی،" میں نے بتایا، "تو اس نے کہا ہم مونگ کی کھچڑی نہیں کھاتے، تو ڈاکٹر نے پوچھا پھر کیا کھاتی ہو۔"

"اس نے کہا ہو گا ہم تو دودھ جلیبی کھاتے ہیں،" فلک آرا بیچ میں بول پڑی۔

"ہاں،" میں نے کہا، "ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آیا، بچارا انگریز تھا نا؟ ہم سے پوچھنے لگا وِل مسٹر کالے خاں، یہ جلیبی کیا ہوتا ہے۔"

فلک آرا ہنسی سے لوٹ گئی۔ اس نے خالی پنجرے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور "جلیبی کیا ہوتا ہے" کہہ کہہ کر دیر تک ہنستی رہی۔ رات گئے تک میں نے اسے اسپتال اور اس کی مینا کے قصے سنائے۔

جب وہ سو گئی تو میں نے اٹھ کر پنجرے کو اس کی سجاوٹوں سمیت کوٹھری کے کباڑ میں چھپا دیا۔ میں چاہتا تھا کہ فلک آرا اپنی مینا کو بالکل بھول جائے۔

صبح وہ سو کر اٹھی تو چپ چپ تھی۔ دیر کے بعد اُس نے مجھ سے صرف اتنا پوچھا:

"ابا، ہماری مینا اچھی ہو جائے گی؟"

"ہاں، اچھی ہو جائے گی،" میں نے جواب دیا، "لیکن بیٹی، بیمار کی زیادہ باتیں نہیں کرتے ہیں، اس سے بیماری بڑھ جاتی ہے۔"

اس کے بعد اُس نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس کی مینا کا پنجرا کیا ہوا۔

میں اسے بہلانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں باہر نکلا۔ داروغہ نبی بخش کا آدمی کھڑا تھا۔

"خیریت تو ہے، محرم علی؟" میں نے پوچھا۔

"داروغہ صاحب نے آج سویرے سے بلایا ہے،" اس نے کہا، "حضرت سلطانِ عالم طاؤس چمن میں تشریف لا رہے ہیں۔"

"آج؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا، "ابھی پرسوں ہی تو ـــ"

"چڑیاں بڑھ گئی ہیں نا؟" محرم علی بولا، "وہی سننے ـــ"

"اچھا تم چلو۔"

میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے۔ باہر نکل کر جمعراتی کی ماں سے فلک آرا کے پاس جانے کو کہا اور لپکتا ہوا طاؤس چمن پہنچ گیا۔ راستے میں کئی بار میں نے خود کو فلک مینا کو قفس میں پہنچا دینے پر خود کو شاباشی بھی دی۔

Scanned with CamScanner

آج ابجادی قفس کے سامنے چاندی کی منقش چوبوں پر سبز اطلس کا مقیشی جھالروں والا چھوٹا شامیانہ تنا ہوا تھا۔ داروغہ اور بہت سے ملازم قفس کے پاس جمع تھے۔ اُن کے بیچ میں بوڑھے میر داؤد اس طرح اینٹھے ہوئے کھڑے تھے جیسے وہ بادشاہ ہوں اور ہم سب اُن کے غلام۔ میر داؤد کی نازک مزاجیوں اور اکڑ کے قصے لکھنؤ بھر میں مشہور تھے، لیکن سب مانتے تھے کہ پرندوں کو پڑھانے میں ان کا جواب نہیں ہے۔

"ہاں میاں کالے خاں،" داروغہ نے مجھے دیکھتے ہی کہا، "قفس کو دیکھ بھال لو، زرا جلدی ۔۔۔"

میں نے بڑی پھرتی کے ساتھ قفس کا فرش صاف کیا، پودوں پر پانی چھڑکا، گرے پڑے پھول پتے سمیٹے اور باہر نکلا ہی تھا کہ جلوخانے کی طرف شہنائیاں اور نقارے بجنے لگے۔ ہم سب ہوشیار ہو کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے میر داؤد کی آواز سنائی دی:

"میں پھر کہتا ہوں، سبق کے بیچ میں کوئی نہ بولے، نہیں جانور بھٹک جائیں گے۔"

داروغہ کو کچھ غصہ آ گیا۔ بولے:

"میر صاحب، ایک بار کہہ دیا، حضرت کے سامنے کسی کی مجال ہے جو چوں بھی کر جائے، مگر آپ ہیں کہ جب سے یہی رٹ لگائے ہیں۔"

جواب میں میر صاحب نے بڑے اطمینان کے ساتھ داروغہ کے سینے پر انگلی رکھ کر پھر وہی کہا:

"سبق کے بیچ میں کوئی نہ بولے، نہیں جانور بھٹک جائیں گے۔"

"کاں جاؤ میر صاحب،" داروغہ منہ بنا کر بولے، "کیا مٹھوؤں کی سی باتیں کر رہے ہو۔"

میر صاحب تلملا کر کچھ کہنے چلے تھے کہ شاہی جلوس دور پر نظر آنے لگا۔ ہم سب طاؤس چمن کے پھاٹک پر دو قطاریں بنا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر میں جلوس پھاٹک پر آ پہنچا۔ آج بادشاہ کے ساتھ حضورِ عالم اور مصاحبوں کے علاوہ بیلی گارد کے کئی انگریز افسر بھی تھے۔ حضورِ عالم انھیں قفس کی ایک ایک چیز دکھانے لگے۔ پھر بادشاہ نے ان سے دھیرے دھیرے کچھ کہا اور میر داؤد کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ میر صاحب تسلیم بجالائے اور بڑھ کر قفس کے قریب آ گئے۔ انھوں نے منہ سے کچھ سیٹی سی بجائی۔ قفس میں اڑتی ہوئی مینائیں اُن کی طرف آ کر جھولوں اور اڈوں پر بیٹھ گئیں اور زور زور سے چہچہانے لگیں۔ میر صاحب نے گلے پھلائے، پچکائے، اور ایک عجیب سی آواز منہ سے نکالی۔ مینائیں زرا دیر کو چپ ہو گئیں، پھر سب کے گلے پھول گئے اور ان کی آوازیں ایک آواز ہو کر سنائی دیں:

"سلامت، شاہ اختر، جانِ عالم سلیمانِ زماں، سلطانِ عالم"

ایک ایک لفظ اتنا سچا نکل رہا تھا کہ مجھ کو حیرت ہو گئی۔ بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بہت سی گانے والیاں ایک ساتھ مل کر مبارکبادی گا رہی ہیں۔ میناؤں نے دو بار یہی شعر پڑھا، دم بھر کو رکیں، پھر بھاری آواز اور مردانے لہجے میں بولیں:

"ول کم ٹو طاؤس چمن!"

اس پر انگریز افسروں کو اتنا مزہ آیا کہ وہ بار بار مٹھیاں باندھ کر ہاتھ اوپر اچھالنے لگے۔ میناؤں نے

Scanned with CamScanner

پھر پہلا شعر پڑھا، پھر ایک اور شعر، پھر ایک اور۔ بادشاہ کچھ کچھ دیر بعد مسکرا کر میر داؤد کی طرف دیکھتے، اور میر صاحب عجب تماشا سا دکھار ہے تھے۔ سینہ پُھلا کر تن جاتے اور فوراً ہی اس قدر جھک کر تسلیم کرتے کہ معلوم ہوتا قلابازی کھا جائیں گے۔

میناؤں نے ایک نیا شعر پڑھا اور پھر پہلا شعر پڑھنا شروع کیا:

"سلامت، شاہ اختر، جانِ عالم۔۔۔"

لیکن ابھی شعر پورا نہیں ہوا تھا کہ قفس کے پوربی حصے سے ایک تیز بچکانی آواز آئی:

"فلک آرا شہزادی ہے!"

سب مینائیں ایک دم سے چُپ ہو گئیں اور میر داؤد کا منھ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ فلک مینا ایک ٹہنی پر اکیلی بیٹھی تھی اور اس کا گلا پھُولا ہوا تھا۔ اس نے پھر کہا:

"فلک آرا شہزادی ہے۔ دودھ جلیبی کھاتی ہے۔"

بالکل میری ننھی فلک آرا کی آواز تھی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ دوسروں پر ان بولوں کا کیا اثر ہوا لیکن میں یہ سوچ کر تھرا گیا کہ محل کی گھوڑیاں بھی دودھ جلیبی کو زیادہ منھ نہیں لگاتیں اور یہ ظالم مینا شہزادی کو دودھ جلیبی کھلائے دے رہی ہے، وہ بھی بادشاہ کے سامنے۔ مجھے کچھ لوگوں کے دھیرے دھیرے بولنے کی آوازیں سنائی دیں لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ کون کیا کہہ رہا ہے اس لیے کہ میرے کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ اور اب مجھے ان سیٹیوں سے بھی زیادہ تیز سیٹی کی آواز سنائی دی:

"فلک آرا شہزادی ہے۔ دودھ جلیبی کھاتی ہے۔ کالے خاں کی گوری گوری بیٹی ہے۔"

پھر فلک آرا کے کھلکھلا کر ہنسنے اور تالیاں بجانے کی آواز، اور پھر وہی:

"کالے خاں کی گوری گوری بیٹی ہے۔ کالے خاں کی گوری گوری بیٹی ہے۔"

اپنی آنکھوں کے آگے چھائے ہوئے اندھیرے میں بھی میں نے دیکھا کہ داروغہ نبی بخش آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ بادشاہ نے داروغہ کو دیکھا، پھر آہستہ آہستہ گردن گھمائی اور اُن کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ میرا بدن زور سے تھر تھرایا اور دانت بیٹھ گئے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ قفس کا سفید پتھریلا چبوترا اوپر اچھلا اور میرے سر سے ٹکرا گیا۔

***

دوسرے دن ہوش آیا تو میں نصیر الدین حیدر کے انگریزی اسپتال میں لیٹا ہوا تھا اور داروغہ نبی بخش جھک کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ داروغہ پر نظر پڑتے ہی مجھ کو سب کچھ یاد آ گیا اور میں اٹھ کر بیٹھنے لگا لیکن داروغہ نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

Scanned with CamScanner

"لیٹے رہو، لیٹے رہو،" انھوں نے کہا، "اب سر کی چوٹ کیسی ہے؟"

"چوٹ؟" میں نے پوچھا اور سر پر ہاتھ پھیرا تو معلوم ہوا کئی پٹیاں بندھی ہوئی ہیں، کچھ تکلیف بھی ہو رہی تھی۔ لیکن اس وقت مجھے تکلیف کی پروا نہیں تھی۔ میں نے داروغہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا:

"داروغہ صاحب، آپ کو قسم ہے، سچ سچ بتایئے، وہاں کیا ہوا تھا؟"

"سب معلوم ہو جائے گا، بھائی، سب معلوم ہو جائے گا۔ پہلے اچھے تو ہو جاؤ۔"

"میں بالکل اچھا ہوں، داروغہ صاحب،" میں نے کہا، "آپ کو قسم ہے۔"

داروغہ کچھ دیر ٹالتے رہے، آخر مجبور ہو گئے۔

"کیا پوچھتے ہو میاں کالے خاں،" انھوں نے کہنا شروع کیا، "تم تو غش کھا کے آرام پا گئے، وہاں ہم لوگوں پر جو گذر گئی۔۔۔ مگر پہلے یہ بتاؤ، تم اس کو کس وقت پڑھا دیتے تھے؟"

"کس کو؟"

"فلک آرا مینا کو، اور کس کو۔"

"میں نے اسے کچھ نہیں پڑھایا، داروغہ صاحب، قسم ہے۔"

"پھر؟" انھوں نے پوچھا، "پھر یہ بیہودہ کلام اس نے کہاں سن لیے؟"

میں کچھ دیر ہچکچاتا رہا، آخر بولا:

"میرے گھر پر۔"

داروغہ ہکا بکا رہ گئے۔

"کیا کہہ رہے ہو!"

تب میں نے انھیں اوّل سے آخر تک پورا قصہ سنا دیا۔ داروغہ سناٹے میں آ گئے۔ دیر تک منھ سے آواز نہیں نکل سکی۔ آخر بولے:

"غضب کر دیا تم نے، کالے خاں۔ بادشاہی پرندے کی چوری! اچھا اس دن جو حضرت نے فرمایا تھا کہ فلک آرا دکھائی نہیں دے رہی ہیں، تو کیا اس دن بھی وہ تمھارے گھر تھی؟"

میں نے سر جھکا لیا۔

"تم نے مجھے مار ڈالا،" داروغہ نے کہا، "مجھے کچھ پتا نہیں، میں نے کہہ دیا ابھی تو یہیں اڑتی پھر رہی تھی۔ واہ بھائی، تم تو ہماری بھی نوکری لے گئے تھے۔ اب کل جو اس نے صاحبوں کے سامنے آؤ باؤ بکنا شروع کیا تو حضرت پر سب کچھ روشن ہو گیا۔ اُف اُف، اس کی کل کی لن ترانیاں سن کر حضرت نے جو بات کہی۔۔۔ وہی میں کہوں کہ یہ کیا زبانِ مبارک سے ارشاد ہو رہا ہے۔"

"کیا؟" میں اٹھ کر بیٹھ گیا، "حضرت نے کیا فرمایا؟"

"فرمایا تو بس اتنا کہ داروغہ صاحب، ہمارے جانوروں کو باہر نہ بھیجا کیجیے،" داروغہ نے بتایا اور ٹھنڈی سانس بھری، "داروغہ صاحب! آج تک حضرت نے نبی بخش کے سوا داروغہ نہیں کہا تھا، نہ کہ

داروغہ صاحب۔ اتنے دن کی نمک خواری کے بعد تمھارے سبب یہ بھی سننا پڑا۔ ابھی تک کان کڑوے ہو رہے ہیں۔"

"داروغہ صاحب،" میں نے لجاجت کے ساتھ کہا، "اب تو قصور ہوا، جو سزا چاہیے۔۔۔"

"اچھا خیر،" انھوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے چپ کرا دیا، "تو حضرت توررزیڈنٹی کے صاحبوں کو لیے ہوے سدھار گئے، یہاں طاؤس چمن میں غدر مچ گیا۔ حضور عالم ایک ایک کو پھاڑے کھاتے ہیں۔ اُدھر میر داؤد صاحب گزوں اچھل رہے ہیں کہ دشمنوں نے اُن کی میناؤں کو بُھٹکانے کے لیے باہر کا جانور لا کے قفس میں چھوڑ دیا۔ میں کہہ رہا ہوں یہ باہر کا جانور نہیں، حضرت کی پہچانی ہوئی مینا ہے۔ حضور عالم سامنے کھڑے ہیں، میر صاحب نے ان کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ لگے چلّانے کہ میں نے اسے نہیں پڑھایا ہے، میں نے اسے نہیں پڑھایا ہے۔ اوپر سے حضور عالم نے اور یہ کہہ کے ان کے مرچیں لگا دیں کہ میر صاحب، وہ تو ظاہر ہے کہ تم نے اسے نہیں پڑھایا ہے، کس واسطے کہ یہ تمھاری میناؤں سے اچھا بولتی ہے۔ اب تو میر صاحب۔۔۔ کیا بتاؤں، قفس سے سر تو وہیں ٹکرا دیا، پیادوں کے ہاتھ گھر کو روانہ کیے گئے تو گومتی میں پھاندے پڑتے تھے۔ جو کنواں راستے میں آیا۔۔۔ درشن سنگھ کی باولی میں تو سمجھو کُود ہی گئے تھے۔"

مجھے میر صاحب کی کُود پھاند سے کیا لینا دینا تھا۔ میں نے کہا:

"داروغہ صاحب، یہ بتائیے، وہاں میرا کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا،" وہ بولے، "جہاں پناہ یہ مقدمہ حضور عالم کو سونپ کر سدھارے۔ سب پر کُھلا ہوا تھا کہ یہ کچھ تمھاری ہی کارستانی ہے۔ اُس علامہ چڑیا نے کوئی کسر چھوڑی تھی؟ حضور عالم نے تو وہیں کھڑے کھڑے تمھارا فیصلہ کر دیا تھا۔ میں نے ٹوپی اتار کے ان کے پیروں میں ڈال دی۔ خیر، وہ کسی طرح ٹھنڈے پڑے، ضمانت منظور کی، گرفتاری کا حکم واپس لیا۔ اب مقدمہ بنوا کے اظہار لیں گے۔ دیکھو کیا فیصلہ کرتے ہیں، جرمانہ تو ہوا ہی سمجھو، اوپر سے۔۔۔"

"داروغہ صاحب،" میں گھبرا کر بولا، "یہاں پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ جرمانہ کہاں سے بھروں گا؟"

"ارے بھائی، کیوں پریشان ہوتے ہو،" داروغہ نے کہا، "آخر ہم کس دن کے لیے ہیں؟ لیکن بات جرمانے ہی پر ٹل جائے تب نا؟ حضور عالم کھسیائے ہوے ہیں، صاحبوں کے آگے کِرکِری ہوئی ہے، کیا پتا بند ہی کرا دیں، یا گنگا پار اتروا دیں۔"

قید خانے سے زیادہ مجھے گنگا پار ہونے کے خیال سے وحشت ہوئی۔ ساری عمر لکھنؤ میں گذری تھی، باہر کہیں جاتا تو پاگل ہو جاتا۔ میں نے کہا:

"داروغہ صاحب، اس سے تو اچھا ہے کہ حضور عالم مجھے توپ دم کرا دیں۔ خدا کے واسطے کوئی ترکیب نکالیے۔" پھر مجھے ایک خیال آیا۔ "کیوں داروغہ صاحب، بادشاہ کو عرضی لکھوں؟ شاید معافی مل جائے۔"

"عرضیاں بادشاہ کو پہنچتی کہاں ہیں، میرے بھائی،" داروغہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے،

Scanned with CamScanner

"ایکوں ایک کاغذ پہلے حضورِ عالم کے ملاحظے سے گذرتا ہے۔ اب وہ جس پر چاہیں آپ حکم صادر کریں، جسے چاہیں حضرت کی خدمت میں پیش کریں۔"

داروغہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے زرا رُکے اور بولے:

"مگر یہ ضرور ہے کالے خاں، عرضی کی تمھیں سُوجھی اچھی ہے۔"

"داروغہ صاحب، لیکن مجھے خدارا یہاں سے نکلوائیے،" میں نے کہا، "نہیں دواؤں کے یہ بھپکے مار ڈالیں گے۔"

"سچ کہتے ہو۔ اچھا تو چھٹی میں ابھی دلائے دیتا ہوں۔ تم گھر جا کر ایک دن دو دن آرام کر لو۔ پھر کسی اچھے منشی سے عرضی لکھوانا۔ آپ نہ لکھنے بیٹھ جائیے گا۔"

"میں داروغہ صاحب، جاہل آدمی، آپ لکھ کر بنتا کام بگاڑوں گا؟"

"اور ہم کہہ کیا رہے ہیں۔"

داروغہ صاحب اسپتال والوں سے بات کر کے اُدھر نکل گئے اور میں کچھ دیر بعد چھٹی پا کے گھر آگیا۔

ننھی فلک آرا کو گود میں بٹھا کر میں دیر تک بہلاتا رہا، لیکن مجھے خبر کچھ نہیں تھی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور وہ کیا کہہ رہی ہے۔

۵

دوسرے ہی دن میں مُنشیوں کی فکر میں نکل کھڑا ہوا۔ اُس وقت لکھنؤ میں ایک سے ایک لکھنے والا پڑا تھا۔ منشی کالکا پرشاد تو میرے ہی محلے میں تھے۔ تین کو میں جانتا تھا کہ بادشاہ کی خدمت میں رسائی رکھتے ہیں، ایک مرزا رجب علی صاحب، ایک منشی ظہیر الدین صاحب، ایک منشی امیر احمد صاحب۔ مرزا صاحب بڑی چیز تھے، ایک عالم میں اُن کے قلم کی دھوم تھی، اُن سے کہنے کی تو میری ہمّت نہ ہوئی، منشی ظہیر الدین کو پوچھتا پاچھتا اُن کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا بلگرام گئے ہوئے ہیں۔ اب منشی امیر احمد صاحب رہ گئے۔ ان کا گھر بتانے والا کوئی نہ ملا لیکن یہ معلوم ہوا کہ وہ جمعرات کے جمعرات شاہ مینا صاحب کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ اتفاق کی بات، اس دن جمعرات ہی تھی، وہ بھی نوچندی جمعرات۔ مغرب کے وقت مجھی بھوَن کے پہلو سے ہوتا ہوا میں شاہ مینا صاحب پہنچ گیا۔ آدمیوں کی ریل پیل تھی، کسی طرح مزار تک پہنچا۔ وہاں قوّالی ہو رہی تھی۔ منشی صاحب ہی کا کلام گایا جا رہا تھا۔ وہ خود بھی وہیں تشریف رکھتے تھے۔ میں انھیں قیصر باغ میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ ایک کونے میں کھڑا ہو کر قوّالی سننے لگا۔ رات گئے محفل برخواست ہوئی تو منشی صاحب کو لوگوں نے گھیر لیا۔ اب باتیں ہو رہی ہیں۔ خدا خدا کر کے منشی صاحب اٹھے، باہر نکلے۔ میں پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اب منشی صاحب تسبیح گھماتے ہوئے ایک گلی سے دوسری، دوسری سے

Scanned with CamScanner

تیسری میں مڑتے جا رہے ہیں اور میں سائے کی طرح ساتھ ساتھ۔ آخر وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ میں نے سامنے آ کر سلام کیا۔ انھوں نے جواب دے کر مجھے غور سے دیکھا۔

"آپ کے کرم کا محتاج ہوں،" میں نے کہا۔

منشی صاحب جیب میں ہاتھ ڈالنے لگے۔ میں نے ہاتھ جوڑ لیے۔

"حضور، فقیر نہیں ہوں۔"

"اچھا تو پھر؟"

"فقیروں سے بھی بدتر ہوں۔ آپ چاہیں تو خانہ خرابی سے بچ جاؤں۔"

"ارے بندۂ خدا، کیوں پہیلیاں بھجوا رہے ہو؟ کچھ کھُل کر نہیں کہو گے؟"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنا قصّہ شروع کر دیا مگر منشی صاحب نے تھوڑی ہی دیر میں مجھے روک دیا۔ ان کا مکان قریب آ گیا تھا، وہاں لے گئے۔ میں نے کتنا کتنا کہا کہ رات بہت آ گئی ہے، میں کل حاضر ہو جاؤں گا، مگر انھوں نے اسی وقت سارا حال سنا، بیچ بیچ میں کبھی افسوس کرتے، کبھی حیرت، کبھی ہنس پڑتے، کبھی بادشاہ کی تعریف کرنے لگتے۔ میں نے پورا قصّہ سنا کر اپنا مطلب عرض کیا تو وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے، پھر بولے:

"سنو بھائی کالے خاں، تمھارا قصّہ ہمارے دل کو لگ گیا۔ عرضی تو تمھاری ہم لکھ دیں گے، اور جی لگا کے لکھیں گے، لیکن وہ حضرت تک پہنچے تو کیوں کر پہنچے؟ یہ تمھارے بس کا کام نہیں، کوئی وسیلہ ہے تمھارے پاس؟"

"وسیلہ؟" میں نے کہا، "منشی صاحب، میرا تو جو کچھ وسیلہ ہیں آپ ہی ہیں۔ آپ حضرت سلطانِ عالم کی خدمت میں ---"

"ہاں بھائی، گاہے گاہے حاضری تو دیتا ہوں۔ غریب پروری ہے حضرت کی کہ یاد فرما لیتے ہیں۔"

"تو پھر منشی صاحب،" میں نے کچھ خوش ہو کر، کچھ ڈرتے ڈرتے کہا، "اگر وہ عرضی آپ ہی ---"

منشی صاحب ہنسنے لگے۔

"بھئی کالے خاں --- مگر سچ ہے، تم بادشاہی کارخانے کو کیا جانو۔ وہاں یہ تھوڑی ہوتا ہے کہ حضرت ظلِ سبحانی، آداب، یہ چٹھی لے لیجیے، اور حضرت نے ہاتھ بڑھا کر ---"

میں جھینپ گیا، بولا:

"منشی صاحب، یہ میرا مطلب نہیں تھا۔ اصل یہ ہے کہ سلطانِ عالم کو عرضی پہنچوانے کے لیے میں آپ کے سوا اور کسی سے نہیں کہہ سکتا۔"

"عرضی بادشاہ تک پہنچی بھی تو ہزار ہاتھوں سے ہوتی ہوئی پہنچے گی۔ پھر مقدمہ تمھارا حضورِ عالم کے حوالے ہوا ہے۔ وہ کاہے کو پسند کریں گے کہ ---"

منشی صاحب رک کر دیر تک کچھ سوچتے رہے۔ بیچ بیچ میں اپنے آپ سے باتیں بھی کرنے لگتے تھے،

Scanned with CamScanner

کچھ لوگوں کے نام بھی لیتے جاتے تھے، میاں صاحبان، مقبول الدولہ، راحت السلطان، امامن، اور معلوم نہیں کون کون۔ آخر میں کہنے لگے:

"اچھا میاں کالے خاں، اللہ نے چاہا تو عرضی تمھاری حضرت کے ملاحظے سے گذر جائے گی، آگے تمھاری قسمت۔۔۔"

میں نے منشی صاحب کو دعائیں دے دے کر ان کی تعریفیں شروع کر دیں تو گھبرا کر بولے:

"ارے بھائی، ارے بھائی، کیوں گنابگار کرتے ہو؟ کام بنانے والا اللہ ہے۔ لو بس اب تم اپنے گھر کو سدھارو۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوے۔ میں چلنے لگا تو دروازے تک پہنچانے آئے۔ میں نے رخصت ہوتے وقت کہا:

"منشی صاحب، اس کا اجر اللہ آپ کو دے گا۔ غریب آدمی ہوں، آپ کا حقِ محنت۔۔۔"

"ہا!" منشی صاحب نے زبان دانتوں تلے دبالی، "اس کا تو نام بھی منھ سے نہ لینا،" اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پھر وہی کہا، "بات یہ ہے کالے خاں، تمھارا قصہ ہمارے دل کو لگ گیا ہے۔"

آصف الدولہ بہادر کے امام باڑے کا نوبت خانہ رات کا پچھلا پہر بجا رہا تھا۔ جمراتی کی اماں بےچاری، میں نے سوچا، میرا رستہ دیکھتے دیکھتے سو گئی ہوں گی۔ انھیں جگانا اچھا نہیں معلوم ہوا، صبح تک شہر میں آوارہ گردی کرتا رہا۔

۶

تین چار دن گذرے ہوں گے کہ کیا دیکھتا ہوں داروغہ نبی بخش دروازے پر کھڑے ہیں۔ میں گھبرا گیا، لیکن انھوں نے مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا، کہنے لگے:

"ارے میاں کالے خاں، بھائی تم تو قیامت نکلے!"

میں اور بھی گھبرا گیا، بولا:

"داروغہ صاحب، واللہ مجھے کچھ خبر نہیں، کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" داروغہ بولے، "یہ ہوا کہ تمھاری عرضی حضرت سلطانِ عالم کی خدمت میں پہنچ گئی اور ملاحظے سے گذرتے ہی اُس پر حکم بھی ہو گیا۔"

"حکم ہو گیا؟" میں نے بےتاب ہو کر کہا، "کیا حکم ہوا داروغہ صاحب؟"

"سُلطانی فیصلے ہم لوگوں کو بتائے جائیں گے؟ کیا بات کرتے ہو کالے خاں، لیکن اسے لکھ رکھو۔۔۔ اچھا، پہلے یہ بتاؤ، عرضی میں سارا حال لکھوا دیا تھا؟ بِٹیا کا بِن ماں کی ہونا، پہاڑی مینا کے لیے تمھیں دِق کرنا، اور۔۔۔"

Scanned with CamScanner

"اوّل سے آخر تک، عرضی میں نے دیکھی تو نہیں لیکن منشی امیر احمد صاحب نے کہا تھا جی لگا کر لکھوں گا۔"

"منشی امیر احمد صاحب؟" داروغہ تعجب سے بولے، "انھیں پکڑلیا؟ اماں ہم تمھیں ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ وہی ہم کہیں یہ عرضی حضرتِ سلطانِ عالم تک پہنچ کیوں کر گئی؟"

"داروغہ صاحب، وہ ابھی آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"اماں جو کہہ رہے تھے وہ کہہ رہے ہیں۔"

"نہیں، وہ آپ نے کیا کہا تھا، اسے لکھ رکھو۔"

"وہ، ہاں،" داروغہ کو یاد آگیا، "ہم کہہ رہے تھے اسے لکھ رکھو کہ تمھیں معافی مل گئی اور تمھاری بٹیا کو بینا۔"

"بٹیا کو بینا؟" میں حیران ہو کر بولا، "یہ کیا کہہ رہے ہیں، داروغہ صاحب؟"

"تم ابھی بادشاہ کے مزاج سے واقف نہیں ہو،" داروغہ بولے، "آج جو سویرے سویرے بندے علی، ان کا چوبدار، مجھ سے تمھارا گھر پوچھنے آیا تو میں بھانپ گیا۔ بھئی جی خوش ہو گیا۔"

لیکن میں نے دیکھا داروغہ بہت خوش نہیں ہیں۔ رُکے رُکے سے تھے اور معلوم ہوتا تھا کچھ اَور بھی کہنا چاہتے ہیں۔ مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میں نے کہا:

"داروغہ صاحب، آپ نے ہمیشہ میرے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔ اِس وقت آپ خوش نہ ہوں گے تو کون ہو گا۔ لیکن --- داروغہ صاحب --- کیا کچھ اَور بات بھی ہے؟"

داروغہ ذرا کسمسائے، پھر بولے:

"کہہ نہیں سکتے کالے خاں، ہو سکتا ہے کوئی بات نہ ہو، ہو سکتا ہے بہت بڑی بات ہو جائے۔ مگر تمھاری خیر رہے گی۔"

"داروغہ صاحب، خدا کے لیے ---"

اب داروغہ صاف پریشان نظر آرہے تھے۔

"بھائی،" انھوں نے کہا، "تازہ واردات بھی سُن لو۔ آج نواب صاحب کے تین آدمی طاؤس چمن میں آئے تھے۔"

"نواب صاحب؟"

"ارے، حضورِ عالم، دستورِ معظم، وزیرِ اعظم، مدارالدولہ، نواب علی نقی خاں بہادر، کہو سمجھے۔"

"سمجھا۔"

"یا شاید چار آدمی تھے،" داروغہ نے یاد کرنے کی کوشش کی، "خیر، ہو گا، انھیں نے مجھے طاؤس چمن میں بلوایا۔ میں گیا تو دیکھا، لجادی قفس کے سامنے تنے ہوئے کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بڑے تیوروں کے ساتھ پوچھنے لگے، ان میں فلک آرا کون سی بینا ہے۔ میں جل گیا، بولا انھیں میں کہیں ہو گی، میں کوئی

Scanned with CamScanner

سب کے نام یاد رکھتا پھرتا ہوں؟ اُن کے بھی دماغ آسمان پر تھے، کہنے لگے اتنے دن سے داروغہ ہو اور جانور کو نہیں پہچانتے؟ میں نے کہا چلیے پہچانتے ہیں، نہیں بتاتے۔ آپ پوچھنے والے کون؟ بات بڑھنے لگی۔ اُن میں ایک شاید نئے نئے مصاحبی میں آئے تھے، مونچھیں نکل رہی تھیں، زرا صورت دار بھی تھے، انھوں نے کچھ زیادہ رنگ دکھانا شروع کیا تو میں نے کہا صاحبزادے صاحب، اپنا جوبن سنبھال رکھیے، جب تک ڈاڑھی مونچھیں پوری نہ نکل آئیں میرے سامنے آگا پیچھا دیکھ کر آیئے گا۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔

"داروغہ صاحب، بھئی آپ کی زبان سے اللہ کی پناہ!"

"ہاں نہیں تو،" داروغہ واقعی تاؤ میں آئے ہوئے تھے، "اب وہ لگے ڈکارنے۔ میں نے کہا میرے شہزادے، ہم خاصے کے شیروں کو نوالہ کھلاتے ہیں۔ لے بس اب چونچ بند کیجیے، نہیں اٹھا کر موہنی کے کٹہرے میں پھینکوں گا پہلے، نام پوچھوں گا بعد میں۔ شور سُن کر محلات کے بہت سے آدمی نکل آئے، معاملہ رفع دفع کرایا۔"

کچھ دیر ہم دونوں سوچ میں ڈوبے رہے، پھر میں نے کہا:

"بری واردات ہوئی، داروغہ صاحب۔"

"واردات؟" داروغہ بولے، "واردات میرے یار ابھی تم نے سنی کہاں۔ اب سُنو۔ محلات والوں میں نواب صاحب کے آدمیوں کے دوست آشنا بھی تھے، وہ اُن کو الگ لے گئے۔ تب بھید کھُلا کہ اُس دن رزیڈنٹی کے جو صاحبان طاؤس چمن میں آئے تھے، اُن میں سے کسی کو تمھاری مینا کے بے ہنگام بول بھا گئے۔ اُس نے نواب صاحب سے اس کی تعریف کی۔ نواب صاحب کھٹ سے وعدہ کر بیٹھے کہ مینا رزیڈنٹی پہنچا دی جائے گی۔ یہی نہیں، اس کے لیے ایجادی قفس کے نمونے کا چھوٹا پنجرا بھی بنوا لیا ہے۔"

میں اتنی ہی دیر میں فلک مینا کو اپنے گھر کا مال سمجھنے لگا تھا۔ میں نے کہا:

"لیکن مینا تو حضرت نے میری بیٹی کو عنایت کی ہے۔"

"کی ہے، درست، مگر نواب صاحب نے بھی تو گورے صاحب بہادر سے وعدہ کیا ہے۔"

"تو کیا نواب اپنے بادشاہ کا حکم نہیں مانیں گے اور اُس۔۔۔"

"بس بس، آگے کچھ نہ کہو، کالے خاں۔ تمھیں خبر نہیں یہاں کیا ہو رہا ہے۔ مگر خیر، نواب صاحب بادشاہ کے فیصلے پر اپنا حکم تو کیا چلائیں گے، البتہ وہ مینا کو تم سے مول ضرور لے لیں گے، وہ بھی منھ مانگے داموں۔ اچھا ٹھیک ہے، بادشاہی تحفے اسی لیے ہوتے ہیں کہ آدمی انھیں بیچ باچ کے پیسے بنا لے۔ لیکن اتنا یاد رکھو کالے خاں، مینا اگر رزیڈنٹی پہنچ گئی تو بادشاہ کو ملال ہو گا۔"

"ملال ہو اُن کے دشمنوں کو،" میں نے کہا، "نواب صاحب خرید کا ڈول ڈالیں گے تو کہلا دوں گا میری بیٹی راضی نہیں، اُس نے مینا کو بہن بنایا ہے۔"

"اور نواب صاحب چُپ ہو کے بیٹھ جائیں گے؟" داروغہ فوراً بولے، "کہاں رہتے ہو بھائی؟ اچھا اب جو ہم کہہ رہے ہیں، زرا دھیان سے سُنو۔ چھوٹے میاں یاد ہیں؟"

"کون چھوٹے میاں؟"

"اماں وہی جن کے پاس تصویریں اتارنے والا ولایتی بکسا ہے۔ نام لو بھئی، ہمیں تو عُرفیت ہی یاد رہتی ہے۔"

"اچھا وہ سے چھوٹے میاں؟ داروغہ احمد علی خاں،" میں نے کہا، "انھیں بھول جاؤں گا؟ حسین آباد مبارک میں کام کر چکا ہوں۔"

"بس تو اگر مینا تمھارے پاس پہنچ گئی تو وہ تمھارے گھر آئیں گے۔ جو وہ کہیں وہی کرنا۔ زرا اس میں خلاف نہ ہو۔ اور دیکھو، پریشان نہ ہونا، تمھارا بھلا ہی بھلا ہو گا۔ اچھا ہم چلے۔ باقی چھوٹے میاں بتائیں گے۔"

"داروغہ صاحب، کچھ آپ بھی تو بتاتے جائیے،" میں نے کہا، "مجھے ابھی سے ہَول ہو رہی ہے۔"

"تو سنو کالے خاں، ہم نہیں چاہتے کہ بادشاہی پرندہ رزیڈنٹی میں جائے۔ تم چاہتے ہو؟"

"زندگی بھر نہیں۔"

"جاؤ بس، چَین سے بیٹھو۔"

داروغہ رخصت ہوئے تو میں گھر میں آیا۔ طاؤس چمن والے قصّے کے بعد آج پہلی بار میں نے اپنی فلک آرا کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت جھِجک گئی تھی۔ میں سمجھ گیا اپنی مینا کے لیے ہُڑک رہی ہے لیکن اس کا نام لیتے ڈرتی ہے۔ جی چاہا اسے ابھی بتا دوں کہ تمھاری مینا تمھارے پاس آ رہی ہے۔ لیکن ابھی مجھے خود ہی ٹھیک کچھ نہیں معلوم تھا، اس کو کیا بتاتا۔ بس اسے گود میں لیے دیر تک ٹہلتا رہا۔

***

داروغہ نبی بخش کا خیال صحیح تھا۔ دوسرے ہی دن سویرے سویرے شاہی چوبدار اور دو سرکاری اہلکار میرے دروازے پر آموجود ہوئے۔ داروغہ خود بھی اُن کے ساتھ تھے، اُن سے میری شناخت کرا کے ایک اہلکار نے شاہی حکم نامہ پڑھنا شروع کیا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

> "کالے خاں ولد یوسف خاں کو معلوم ہو کہ عرض داشت اس کی حضور میں گذری۔ ہرگاہ طاؤس چمن کی مینا اسمی فلک آرا کو چُرا کر اپنے گھر لے جانا اس کا بہ موجب اقرار اس کے ثابت ہے، بنا بریں اس کو ملازمتِ سلطانی سے برطرف کیا گیا مگر تنخواہ اس کی بحال رہے گی۔
>
> مینا اسمی فلک آرا کو تعلیم دینے کے جلدو میں مینا مذکورہ مسماۃ فلک آرا

بیگم بنت کالے خاں کو بر سبیل انعام عطا ہوئی، و نیز خزانۂ عامرہ سے مینا مذکورہ کے دانے پانی کا خرچ ایک اشرفی ماہانہ مقرر ہوا۔

و نیز کالے خاں ولد یوسف خاں کو معلوم ہو کہ چوری اس گھر میں کرتے ہیں جہاں مانگے سے ملتا نہ ہو۔"

اس آخری فقرے نے مجھے پانی پانی کر دیا۔ سر جھکا کر رہ گیا۔ اتنے میں دوسرے اہل کار نے سُرخ بانات کے غلاف سے ڈھکا ہوا پنجرا چوبدار کے ہاتھ سے لے کر میرے ہاتھ میں دیا۔ پھر کمر سے ایک چھوٹی سی تھیلی کھول کر مجھے دی اور اس کے اندر کی بارہ اشرفیاں میرے ہاتھ سے گِنوائیں۔ بتایا یہ مینا کا سال بھر کا خرچ ہے، اور رسید نویسی کی مختصر کارروائی کے بعد مجھے مبارکباد دی۔ داروغہ نبی بخش نے بھی مبارکباد دی، پھر چوبدار سے کہا:

"اچھا میاں بندے علی، ہمارا کام ختم ہوا؟"

"کام ہمارا ابھی ختم ہوا، " اس نے جواب دیا، "کیوں داروغہ صاحب، ساتھ نہ چلیے گا؟"

"نہیں بھائی، سوچتے ہیں حسین آباد مبارک میں حاضری دے آویں۔"

"ہاں ہاں، ضرور جائیے، " بندے علی نے بڑے تپاک سے کہا، "ہمارے لیے بھی دعا کر دیجیے گا۔"

"لو، یہ بھی کہنے کی بات ہے؟"

داروغہ نے میری طرف دیکھا اور سر کے ہلکے سے اشارے سے پوچھا یاد ہے؟ میں نے بھی آہستہ سے سر ہلا دیا کہ یاد ہے۔

اُن لوگوں کے جانے کے بعد گھر میں آیا تو معلوم ہوتا تھا خواب میں ہوا پر چل رہا ہوں۔ فلک آرا ابھی سو رہی تھی۔ میں نے پنجرا صحن میں رکھ کر اُس پر سے غلاف ہٹایا تو آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔

"سونا!" میرے منھ سے نکلا اور پنجرے کی خوب صورتی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

میں اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ اس کی مالیت کتنی ہو گی۔ اُسی وقت مجھے فلک مینا کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ وہ میری طرف پچی پچی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے سر اوپر نیچے کیا اور پر پھلا کر زور زور سے چہچہانے لگی۔ میں دوڑتا ہوا کوٹھری میں گیا اور اس کا پُرانا پنجرا نکال لایا۔ مینا کو اس پنجرے سے اُس پنجرے میں کر کے نیا پنجرا کوٹھری میں چھپا رہا تھا کہ باہر سے فلک آرا کی آواز سنائی دی:

"ہماری مینا اچھی ہو گئی، ہماری مینا اچھی ہو گئی۔"

میں کوٹھری سے باہر آیا تو اُس نے چہک چہک کر مجھے بھی یہ خبر سنائی۔ لیکن میں دوسری فکروں میں تھا۔

"اچھا پہلے منھ ہاتھ دھو لو، پھر اس سے جی بھر کے باتیں کرنا، " میں نے اُس سے کہا اور باہر دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

گھر کے اندر سے مینا کے چہچہانے اور فلک آرا کے کھلکھلانے کی آوازیں ملی آ رہی تھیں۔ واقعی

Scanned with CamScanner

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو بہنیں بہت دن بعد ملی ہیں۔ آوازیں دم بھر کو رُکیں، پھر میں نے سُنا:

"فلک آرا شہزادی ہے، دودھ جلیبی کھاتی ہے، کالے خاں کی گوری بیٹی ہے۔"

پھر ہنسی، پھر تالیوں کی آواز۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ یہ فلک آرا تھی یا اُس کی مینا۔

۷

دن بھر میں کبھی گھر میں آتا، کبھی دروازے پر جاتا۔ ہر وقت مجھے گمان تھا کہ داروغہ احمد علی خاں آتے ہی ہوں گے، لیکن دروازے پر دیر تک اُن کی راہ دیکھنے کے بعد پھر گھر میں آ جاتا۔ آخر قریب شام وہ آتے دکھائی دیے۔ اُن کے ساتھ ایک آدمی اَور تھا۔ کچھ دیہاتی سا معلوم ہوتا تھا، لنگی باندھے، موٹا کُرتا پہنے، کمر میں چادر لپٹا ہوا اور سر پر بڑا سا صافہ جس کا شملہ اس نے منھ پر اس طرح لپیٹ لیا تھا کہ صرف آنکھیں اور ناک کا آدھا بانسہ کھُلا رہ گیا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں کی چمک سے کچھ ڈر سا لگا۔ اتنی دیر میں وہ دونوں دروازے پر آ پہنچے۔ علیک سلیک ہوئی۔ احمد علی خاں نے جلدی جلدی میرا حال احوال پوچھا، پھر صافے والے آدمی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا:

"انھیں پہچانتے ہو کالے خاں؟"

"صورت دیکھوں تو شاید پہچان لوں۔"

"نہیں، یوں ہی پہچانتے ہو؟" انھوں نے پوچھا، پھر پوچھا، "آگے کبھی کہیں دیکھو گے تو پہچان لو گے؟"

"ان کے ڈھانٹے کو پہچانوں تو پہچانوں۔"

"قاعدے کی کہی،" داروغہ بولے، "اچھا دیکھو، یہ بادشاہی مینا اور انعامی پنجرے کے خریدار ہیں۔ بولو، کیا کہتے ہو؟"

میرے منھ سے صاف انکار نکلتے نکلتے رہ گیا۔ میں نے کہا:

"میں کیا کہوں، داروغہ صاحب، آپ مختار ہیں۔"

"اچھا تو تم نے ہمیں اپنا مختار کیا؟"

"کیا۔"

"تو مینا تمھاری ہم نے اِن کے ہاتھ بیچی۔ پنجرا بھی بیچا۔ پیسے سوچ سمجھ کر طے کر لیں گے،" داروغہ نے کہا، پھر اُس آدمی سے بولے، "لیجیے انھیں بیعانہ دیجے۔ قسم بھی دیجے۔"

آدمی نے ایک روپیہ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور بولا:

"کالے خاں ولد یوسف خاں، کلامِ پاک کی قسم کھاؤ، کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ مینا تم نے کتنے کو بیچی۔ پنجرے کے پیسے البتہ بتا دینا۔ مینا کے پیسے کوئی پوچھے تو کہہ دینا ہم پر قسم پڑ چکی ہے۔"

Scanned with CamScanner

میں نے قسم کھائی۔ چھوٹے میاں نے مجھ سے کہا:

"جاؤ، زرا بٹیا کو بہلا کر مینا اور پنجرا لے آؤ۔"

میں گھر کے اندر آیا۔ فلک آرا پنجرے کے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے اس سے کہا:

"فلک آرا بیٹی، اب اس کے بسیرے کا وقت ہے۔ نیند خراب کرو گی تو پھر بیمار ہو جائے گی۔ ہم اسے ہوا کھلا کے لاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے۔"

فلک آرا جلدی سے اٹھ کر اندر دالان میں چلی گئی۔ میں نے کوٹھری سے شاہی پنجرا نکالا، فلک مینا کا بھی پنجرا اٹھایا اور باہر آگیا۔ داروغہ چھوٹے میاں خوش ہو کر بولے:

"پنجرا بدل دیا؟ اچھا کیا کالے خاں۔"

انھوں نے دونوں چیزیں آدمی کو دے دیں اور پوچھا:

"پنجرا پایا؟"

"پایا،" وہ بولا۔

"مینا پائی؟"

"پائی۔"

"سدھاریے۔"

آدمی دونوں پنجرے اٹھائے ہوئے مڑا اور روانہ ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے لپکنے ہی کو تھا کہ چھوٹے میاں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں بولا:

"داروغہ صاحب، مینا کے بغیر میری بیٹی۔۔۔"

"غم کھاؤ، کالے خاں، غم کھاؤ۔" انھوں نے کہا اور سامنے اشارہ کیا۔

ڈھانٹے والا آدمی واپس آرہا تھا۔ شاہی پنجرا اس نے کمر کے چادرے میں لپیٹ کر سر پر رکھ لیا تھا اور بالکل دھوبی معلوم ہو رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے مینا والا پنجرا چھوٹے میاں کے ہاتھ میں دے دیا اور تیز قدموں سے واپس چلا گیا۔

سورج ڈوب چکا تھا اور چھوٹے میاں کا چہرہ مجھے ٹھیک سے نظر نہیں آرہا تھا۔ انھوں نے پنجرا میرے ہاتھ میں دے دیا۔ مجھے کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی۔ وہ بولے:

"تمھاری خیر ہی خیر ہے، کالے خاں، بہ شرط ٹھنڈے ٹھنڈے بات کرو۔ نہ آپ غصے میں آؤ نہ دوسرے کو غصہ دلاؤ۔ اور بھائی آج سویرے سے نہ سو جانا۔"

"سویرے سے؟" میں نے کہا، "آج نیند کس کو آتی ہے، داروغہ صاحب۔"

"ارے بھائی کہہ جو دیا تمھاری خیر ہے۔ بس ٹھنڈے رہنا پر ضرور ہے۔"

وہ واپس گئے۔ میں پنجرا لیے گھر میں آیا۔ اسے صحن کی الگنی میں ٹانگتے ٹانگتے میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ فلک آرا دالان کے کھمبے کی اوٹ سے جھانک رہی تھی۔ میں نے جا کر اُسے تخت پر لٹا دیا۔ مینا

کی باتیں کرتے کرتے وہ جلدی ہی سو گئی۔ میں اُسے کچھ اُڑھانے کے لیے اٹھا تھا کہ داروغہ نبی بخش نے دھیرے سے دروازہ تھپتھپایا۔

"سب انتظام ہو گیا،" انھوں نے کہا، "کچھ کھو نہیں، بس چلے چلو۔ بٹیا اور اس کی مَینا کو لے لو۔ گھر میں کوئی اور تو نہیں ہے؟"

"کوئی نہیں،" میں نے کہا، پھر مجھے یاد آ گیا، "بس جمعراتی کی اماں ہیں۔"

"یہ کون ہیں؟ خیر، انھیں بھی لو، ڈولی ساتھ لایا ہوں۔ اور زرا جلدی کرو کالے خاں۔"

"اور داروغہ صاحب، گھر کا سامان؟"

"تم تو ابھی واپس آؤ گے۔ بس بٹیا، اور وہ کس کی اماں ہیں، اُن کا سامان اٹھاؤ۔ ایک دو عدد چاہے اپنے بھی رکھ لو۔"

۸

حسین آباد میں ست کھنڈے کے پیچھے زرکوں کے ایک قطعے کے نشیب میں چھوٹا سا محمد علی شاہی مکان تھا۔ وہاں ہم لوگ اترے۔ صاف ستھری جگہ تھی، جھاڑو دی ہوئی، لوٹوں گھڑوں میں تازہ پانی بھرا ہوا، دالان میں چوکی پر کنول جل رہا تھا۔ فلک آرا سو رہی تھی۔ میں نے اسے ایک پلنگڑی پر لٹا کر مینا کا پنجرا سرہانے ٹانگ دیا۔ سامان رکھنے دھرنے میں کچھ دیر نہیں لگی۔ داروغہ ہمیں اتار کر کہیں چلے گئے تھے۔ زرا دیر میں واپس آئے۔ مجھے دروازے پر بلایا۔ کمر سے ایک تھیلی کھول کر مجھے دی اور بولے:

"پنجرا بک گیا۔ رقم چھوٹے میاں کی تحویل میں ہے۔ اوپر کے خرچے کے واسطے یہ سو روپے گنو۔ یا کہو پوری رقم ابھی دلوا دوں؟"

"نہیں داروغہ صاحب،" میں گھبرا کر بولا، "میرا تو اتنی ہی چاندی دیکھ کر دم اُلٹا جا رہا ہے۔"

داروغہ ہنسنے لگے، پھر بولے:

"اور دانے پانی کی اشرفیوں کو بھول گئے؟"

میں واقعی بھول گیا تھا، بلکہ اس وقت مجھ کو یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اشرفیاں کیا کیں؟ داروغہ نے میری سراسیمگی دیکھی تو پوچھنے لگے:

"کیا ہو گیا بھائی؟"

اُسی وقت مجھے یاد آ گیا۔ دوڑتا ہوا مکان میں گیا، ایک بُقچہ کھولا، شاہی پنجرے کے غلاف میں لپٹی ہوئی اشرفیاں اٹھائیں اور باہر آ کر داروغہ کی طرف بڑھا دیں۔

"داروغہ صاحب، میں انھیں کہاں رکھوں گا؟" میں نے کہا، "ان کو اپنی تحویل میں لیجیے، خواہ چھوٹے میاں کے پاس رکھا دیجیے۔"

Scanned with CamScanner

"اوروں پر اتنا اعتبار نہ کیا کرو، کالے خاں،" انھوں نے کہا۔

"شرمندہ نہ کیجیے، داروغہ صاحب،" میں نے کہا، "آپ لوگ کوئی اَور ہیں؟"

"شاباش ہے تم کو،" داروغہ نے کہا اور اشرفیاں کمر بند میں رکھ لیں، پھر بولے، "اچھا، کھانا آتا ہو گا، کھا پی کر اپنے مکان کو سدھارو۔ رات کو وہیں رہا کرنا، دن کا تمھیں اختیار ہے۔ حضورِ عالم کے آدمی اگر آئیں تو دل جمعی کے ساتھ اُن سے بات کرنا، اور دیکھو، چھوٹے میاں کا نام نہ آنے پائے۔ وہ تو کہتے ہیں آئے اور مقرر آئے، بگڑے دل آدمی ہیں، لیکن خواہی نخواہی کا تہوّر دکھانے سے فائدہ؟ تم خیال رکھنا۔ سمجھو وہ تمھارے گھر آئے ہی نہیں تھے۔ اچھا، اللہ حافظ۔"

زیادہ رات نہیں گئی تھی کہ میں اپنے مکان پر پہنچ گیا۔ فلک آرا کے بغیر اچھا نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ دل بول رہا تھا کچھ ہونے والا ہے۔ آخر مجھ سے لیٹا نہ گیا۔ اٹھ کر مکان سے باہر نکل آیا۔ دروازے کے سامنے ٹہلنے لگا۔

رات تھوڑی اَور گئی تو میں نے دیکھا دو جلتی ہوئی مشعلیں میرے مکان کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ میں تیزی سے گھر میں داخل ہوا اور دروازہ اندر سے بند کر کے بستر پر جا لیٹا۔ ذرا دیر میں دستک ہوئی۔

مشعلچیوں کے علاوہ چار آدمی اَور تھے۔ انھوں نے میرا نام وغیرہ دریافت کیا، روکھے پن سے شاہی انعام کی مبارکباد دی، پھر مینا کو پوچھا کہاں ہے۔

"بک گئی،" میں نے کہا۔

"بک گئی؟" ایک نے حیرت سے پوچھا، "آج کے آج؟"

"مَیں فقیر آدمی، بادشاہی پرندے کو گھر میں کہاں رکھتا؟"

اس کے بعد ان لوگوں نے سوالوں کی بوچھار کر دی۔ مشعلوں کی روشنی سیدھی میرے منھ پر پڑ رہی تھی اور میرا ڈر بڑھتا جا رہا تھا، لیکن میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور ہر سوال کا فوراً جواب دیا۔

"کس نے خریدی؟"

"معلوم نہیں، وہ چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔"

"دیکھو گے تو پہچان لو گے؟"

"نہیں، وہ چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔"

"کتنے میں بیچی؟"

"نہیں بتا سکتا، اس نے قسم دے دی ہے۔"

"کیوں؟"

"وہ جانے۔"

"چھوٹے میاں آئے تھے؟"

"کون سے چھوٹے میاں؟"

Scanned with CamScanner

اس کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی، پھر پوچھا گیا:

"تو پنجرا بک گیا؟"

"بک گیا۔"

"پیسے کیا کیے؟" ایک نے پوچھا، "ہم مدارالدولہ بہادر کے آدمی ہیں، زرا سوچ سمجھ کر بات کرنا۔ پیسے کیا کیے، کالے خاں؟"

"ابھی صرف بیعانہ لیا ہے۔"

"کتنا؟"

"ایک روپیہ،" میرے منھ سے نکل گیا۔

پھر مجھے پسینے چھوٹنے لگے۔ کون مان سکتا تھا کہ میں نے صرف ایک روپیہ لے کر سونے کا پنجرا اور بادشاہی پرندہ کسی انجانے آدمی کے ہاتھ میں پکڑا دیا ہوگا۔ اسی وقت کسی نے کڑک کر کہا:

"کالے خاں، سوچ سمجھ کر بات کرو۔"

ایسی آواز تھی کہ گلی کے کئی گھروں سے آدمی باہر نکل آئے۔ میں خاموش کھڑا تھا۔ آگے والے مشعلچی نے اپنی مشعل اس ہاتھ سے اُس ہاتھ میں لی۔ مشعل کا شعلہ لہرایا، بولنے والے کے منھ پر روشنی پڑی۔ نوجوان آدمی تھا۔ نوجوان کیا، لڑکا کہنا چاہیے۔ پوری مونچھیں بھی نہیں نکلی تھیں۔ صورت اچھی تھی۔ اس نے پھر کڑک کر کہا:

"کالے خاں، تم اُس آدمی کو نہیں پہچانتے؟"

اچانک میرا ڈر ہوا ہو گیا۔

"چلیے پہچانتے ہیں،" میں نے کہا، "مگر نہیں بتاتے۔ آپ پوچھنے والے کون؟"

وہ لوگ کچھ دیر تک خاموش کھڑے مجھے گھورتے رہے، پھر سب ایک ساتھ مڑے اور واپس چلے گئے۔ محلے والے بڑھ کر میرے قریب آگئے۔ پوچھنے لگے کیا ہوا، کیا ہوا۔

"کچھ نہیں،" میں نے کہا، "بُرا زمانہ آگیا ہے۔"

میں نے گھر کا دروازہ بھی اندر سے بند نہیں کیا۔ بستر پر لیٹ کر سوچتا رہا۔

"بات بگڑ گئی، کالے خاں،" آخر میں نے خود سے کہا۔

اور سچ کہا۔ دوسرے دن سویرے سویرے مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میرے گھر سے ایجادی قفس کی ایک گنگا جمنی کٹوری برآمد ہوئی تھی۔

Scanned with CamScanner

۹

میں بھول چکا ہوں کہ میں نے قید خانے میں کتنی مدّت گذاری۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری ساری عمر اسی پنجرے میں گزری جا رہی ہے۔ قیدیوں میں زیادہ تر لکھنؤ کے اوباش اور اٹھائی گیرے تھے۔ اُن سے میرا دل نہیں ملا۔ سب سے الگ تھلگ رہتا۔ فلک آرا بہت یاد آتی تھی۔ کبھی کبھی تو کہیں بالکل قریب سے اس کے کھلکھلانے اور فلک مینا کے چہچہانے کی آوازیں کانوں میں آنے لگتیں، بڑی بے چینی ہوتی، لیکن یہ سوچ کر کچھ اطمینان ہو جاتا تھا کہ اپنی مینا کے ساتھ اُس کا جی بہلا رہتا ہو گا، اور نبی بخش اور چھوٹے میاں اس کی خبر گیری مجھ سے زیادہ کر رہے ہوں گے۔ سب سے بڑھ کر پیسے کا اطمینان تھا۔ اپنی تنخواہ تو خیر اب کیا ملتی، لیکن فلک مینا کی ماہانہ ایک اشرفی اور شاہی پنجرے کی قیمت ملا کر میرے لیے اتنی دولت تھی کہ کبھی سوچتا تو سمجھ میں نہ آتا تھا اسے خرچ کیسے کروں گا۔ پھر سوچنے لگتا کہ اسے خرچ کرنے کی نوبت بھی آئے گی یا قید خانے ہی میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گا۔ بڑا جی چاہتا کہ کسی طرح پھر بادشاہ کو عرضی پہنچوا دوں۔ ابھی تو میرا مقدمہ ہی نہیں بنا تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ مقدمہ کب شروع ہو گا، اور اس کے بعد اگر قید کی سزا ملے گی تو کتنے دن کی ملے گی۔

لیکن ایک دن کچھ کہے سُنے بغیر اچانک مَیں رہا کر دیا گیا۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید داروغہ نبی بخش نے منشی امیر احمد صاحب کو پکڑ لیا، لیکن باہر نکلنے لگا تو دیکھا میری طرح اَور بھی، شاید سبھی، قیدی چھوڑ دیے گئے ہیں۔ بڑا شور ہو رہا تھا مگر میں ایک کنارے ہو کر باہر نکل آیا اور سیدھا ست کھنڈے کی طرف چلا۔

کچھ دور تو میں اپنی دُھن میں نکلا چلا گیا، پھر مجھے سب کچھ بدلا بدلا معلوم ہونے لگا۔ شہر پر عجب مُردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ چوڑے راستوں پر گوروں کے فوجی دستے گشت کر رہے تھے، اور میں جس گلی میں مڑتا اس کے دہانے پر انگریزی فوج کے دو تین سپاہی تنے ہوئے کھڑے نظر آتے تھے۔ گلیوں کے اندر لوگ ٹولیاں بنائے چپکے چپکے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی اس لیے کہیں رکا نہیں۔ لیکن ہر طرف ایک ہی گفتگو تھی، رُکے بغیر بھی مجھے معلوم ہو گیا کہ اودھ کی بادشاہی ختم ہو گئی، سلطانِ عالم واجد علی شاہ کو تخت سے اتار دیا گیا ہے، وہ لکھنؤ چھوڑ کر چلے گئے ہیں، اودھ کی سلطنت انگریزوں کے ہاتھ میں آ گئی ہے اور اس خوشی میں انھوں نے بہت سے قیدیوں کو آزاد کیا ہے۔

از آنجملہ مَیں بھی تھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ایک پنجرے سے نکل کر دوسرے پنجرے میں آ گیا ہوں۔ جی چاہا لوٹ کر قید خانے میں چلا جاؤں، پھر فلک آرا کا خیال آیا اور میں ست کھنڈے کی سیدھی سڑک پر دوڑنے لگا۔

گھر پہنچا تو سب کچھ پہلے کی طرح نظر آیا۔ فلک آرا پہلے تو مجھ سے کچھ کھنچی کھنچی رہی، پھر میری گود میں بیٹھ کر اپنی مینا کے نئے نئے قصّے سنانے لگی۔

***

Scanned with CamScanner

لکھنؤ میں میرا دل نہ لگنا اور ایک مہینے کے اندر بنارس میں آ رہنا، ستاون کی لڑائی، سلطانِ عالم کا کلکتے میں قید ہونا، چھوٹے میاں کا انگریزوں سے ٹکرانا، لکھنؤ کا تباہ ہونا، قیصرباغ پر گوروں کا دھاوا کرنا، کٹہروں میں بند شاہی جانوروں کا شکار کھیلنا، ایک شیرنی کا اپنے گورے شکاری کو گھائل کر کے بھاگ نکلنا، گوروں کا طیش میں آ کر داروغہ نبی بخش کو گولی مارنا، یہ سب دوسرے قصّے ہیں اور اِن قصّوں کے اندر بھی قصّے ہیں۔

لیکن طاؤس چمن کی مینا کا قصہ وہیں پر ختم ہو جاتا ہے جہاں ننھی فلک آرا میری گود میں بیٹھ کر اس کے نئے نئے قصّے سنانا شروع کرتی ہے۔

**

Scanned with CamScanner

سہ ماہی

سویرا

ترتیب: محمد سلیم الرحمٰن، سہیل احمد خاں

۱۵، سرکلر روڈ، لاہور

ادب اور فنونِ لطیفہ کا ترجمان

سہ ماہی

ذہنِ جدید

مرتب: زبیر رضوی

فلیٹ ۷، بی ۷ ۱۳، لین ۱۲، ذاکر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اردو ادب کا شش ماہی انتخاب

سوغات

مدیر: محمود ایاز

۸۴، تھرڈ مین، سیکنڈ کراس، ڈیفنس کالونی، اندرا نگر، بنگلور ۵۶۰۰۳۸

ادبی ماہ نامہ

دریافت

مدیر: قمر جمیل

بی ۵، قمر پلازا، گلشنِ اقبال، بلاک ۳، کراچی ۷۵۳۰۰

Scanned with CamScanner

ذی شان ساحل

توہین

کسی بھی اچھی گھڑی میں
پیدائش کے بعد
اگر آپ خود کو ایک محل میں پائیں
پھر شاہی نجومیوں کے سارے زائچے
اور آپ کی دیکھ بھال پر مقرر
کنیزوں کا حسن
آپ کی خوش قسمتی کی گواہی دے
تو آپ شہزادہ عالم، شہزادہ عالم
سنتے رہنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں
شاہی تخت و تاج کا بوجھ اٹھانے سے پہلے
مملکت کی حدود میں ہونے والی
کسی بھی واقعے کی ذمے داری
یا متاثرین کی دادرسی کا فرض
آپ پر کسی بھی طرح عائد نہیں ہوتا
صوبائی دارالحکومت میں رہنے والے
ایک عام شہری کی بیٹی کی
اجتماعی بے حُرمتی
آپ کے لیے ایک معمولی

Scanned with CamScanner

واقعے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی
لیکن پھر بھی
شکار سے واپسی پر
آپ کو گھوڑے پر بیٹھا دیکھ کے
جب لڑکی کے باپ نے
آسمان کی طرف تھوکا
تو اس کا تھوک
اس کے اپنے منہ پر گرا
سارے سپاہی ہنسنے لگے
مگر آپ نے
اس چھوٹی سی حرکت کو بھی
اپنی توہین سمجھا
کیوں شہزادۂ عالم
شہزادۂ عالم کیوں ؟

فائرنگ

فائرنگ ہو رہی ہے
فائرنگ ہو رہی ہے
کرکٹ کھیلتے ہوئے بچے
گیند کے پیچھے بھاگتے ہیں
شور مچاتے ہیں
مگر گھر میں نہیں جاتے
جیسے فائرنگ ایک جدید لوک گیت ہے
جس کی دُھن پر
شور مچاتے دوڑتے ہوئے
کرکٹ کھیلی جا سکتی ہے
یا پھر

Scanned with CamScanner

بچوں کو گنتی سکھانے کا
کوئی نیا طریقہ
وہ روزانہ ایک سے دس
دس سے سو
اور پھر بغیر رُکے سو سے ہزار تک جا پہنچتے ہیں
مگر فائرنگ بند نہیں ہوتی
وہ مسلسل جاری رہتی ہے

ہمیں پتا چلتا ہے
بہت معمولی وجہ سے
فائرنگ ہوتی رہتی ہے
دو دوست ایک چڑیا کو
کپڑے سے بنی ایک ڈری ہوئی چڑیا کو مارنے کے لیے
نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے
یا دو بھائی چھت پر رکھے ہوئے
گھی کے خالی ڈبوں، شربت کی بوتلوں کو
آسانی سے نیچے لانا چاہ رہے تھے
یا دیوار پر چپکے ہوئے
پچاس پیسے کے کھوٹے سکے کو
زمین پر گرانے کے لیے
اتنی گولیاں چلائی گئیں
کہ لوگ ڈر گئے

انھیں ڈرنا نہیں چاہیے
ہم کہتے ہیں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر
انھیں ڈرنا نہیں چاہیے
فائرنگ تو آغاز ہے
کچھوے اور خرگوش کی دوڑ کا
چوہے اور بلی کے مقابلے کا

اگر آپ اسے موسیقی سمجھتے ہیں
تو پھر پوری طرح اس سے لطف اندوز ہوں
شور سمجھتے ہیں
تو اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لیں
دستک سمجھتے ہیں
تو اپنے گھر کا دروازہ
دل کی طرح بند رکھیں
اور جب تک
فائرنگ ہو رہی ہے
باہر نہ نکلیں

سُرخ ہیئر بینڈ والی لڑکی

ایک ایسے شہر میں
جہاں ہر صبح
ڈرے ہوئے چہروں کا
نیا جلوس لیے
طلوع ہوتی ہے
بے دھیانی سے چائے کا پانی کیتلی میں بھرتے ہوئے
سُرخ ہیئر بینڈ والی لڑکی
کتنی بھلی لگتی ہے
آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے

ہر روز
ہڑتالوں، اندھا دھند فائرنگ
اور مایوس لوگوں سے بھری بستی میں
وہ اپنے آپ میں مگن
چاولوں میں نمک ڈالتی رہتی ہے

اور باروچی خانے کی کھڑکی سے
اپنے بھیگے ہاتھ جھٹک جھٹک کے
خوشی
پانی کے قطروں کی طرح
پڑوسیوں میں بانٹتی رہتی ہے

پرندے اس کے فلیٹ پر سے
ہمیشہ کی طرح چہچہاتے ہوئے
گزرتے ہیں
شہر کے خراب حالات کے باوجود
بہت سے سرمئی اور سفید بادل
اسے چائے کی پیالیوں میں
شکر ڈالتے دیکھتے ہیں
اور اطمینان سے چلے جاتے ہیں

اُن کے جانے کے بعد ستارے
ایک ایک کر کے
اُسے دیکھنا شروع کرتے ہیں
اپنا سارا کام ختم کر کے
سُرخ ہیئر بینڈ والی لڑکی
نیچے دیکھتی ہے
مجھے لکھتا دیکھ کے
سیٹی بجاتی ہے اور
میرے چونکنے پر چھپ جاتی ہے
میرے دوبارہ دیکھنے پر ہنستی ہے
اور اپنی کھڑکی
اگلی صبح تک کے لیے
شہر کے بارے میں کچھ سوچے بغیر
بند کر دیتی ہے

Scanned with CamScanner

ایک آدمی

ہر روز
اپنے ادھورے خوابوں سے
باہر نکلنے پر
اخبار اور چائے کی پیالی ملنے کے بعد
ایک آدمی
شروع ہونے والے دن کے بارے میں
سوچتا ہے

کل شام تک شہر میں
کتنے لوگ مارے گئے؟
وہ انھیں نہیں جانتا
دو ڈاکٹر، ہاکی کا کھلاڑی،
سیاسی کارکن، دودھ والا
اور پتا نہیں کون کون

ایک آدمی زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا
اپنی توجہ شہر کے حالات سے
کسی اور طرف ہٹانے کے لیے
وہ ٹی وی کھولتا ہے
اسکرین پر اسرائیلی پولیس
فلسطینی عورتوں کو سڑک پر
گھسیٹتی لیے جا رہی ہے
سرائیوو کے شہری
بکتر بند گاڑیوں کی مدد سے
سڑک پار کرتے ہیں

میں ان سے زیادہ خوش قسمت ہوں

Scanned with CamScanner

ایک آدمی سوچتا ہے اور
پھر ٹی وی کی طرف دیکھتا ہے
مائیکل جیکسن کا نیا البم
ریلیز ہو گیا ہے
اس خوشی میں ایک آدمی
ٹی وی بند کر کے
پرانے گانے گانے لگتا ہے

آج اُسے کہاں جانا تھا
وہ بھول جاتا ہے
کام پر
دوستوں کے پاس
یا اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے
ایک آدمی ہمیشہ کیے جانے والے
وعدوں کے بارے میں سوچتا ہے
اور ان کے پورا نہ ہونے کے خیال سے
ڈر جاتا ہے

وہ باہر دیکھتا ہے
شہر کو جانے والا راستا ویران پڑا ہے
پل پر سناٹا ہے

اچانک کہیں سے
فائرنگ کی آواز آنے لگتی ہے
ایک آدمی اپنی دنیا میں
لوٹ آتا ہے اپنے ادھورے خوابوں کو
پھر سے جوڑ دیتا ہے

Scanned with CamScanner

ہنسی

لڑکے ہنستے ہیں
اور چل پڑتے ہیں
ٹولیوں کی شکل میں

انھیں اپنے گھر کی طرف آتا دیکھ کر
نابالغ لڑکیاں رونے لگتی ہیں
انھیں روتا دیکھ کر
لڑکوں پر کچھ اثر نہیں ہوتا
وہ ہنستے ہوے چلتے رہتے ہیں
اپنے ہاتھوں میں
پستولوں کو گھماتے ہوے
اپنی بندوقوں کی نوکوں سے
دکانوں کے شٹر بجاتے
اپنے اپنے ہتھیار لہراتے
وہ بڑے فخر سے
ہنستے رہتے ہیں

وہ جہاں سے گزرتے ہیں
لوگوں کے چہرے
خوف اور دہشت سے
غیر معمولی حد تک پھیل جاتے ہیں
وہ جہاں ٹھہرتے ہیں
موت اُن کے ساتھ
تھوڑی دیر کے لیے وہیں ٹھہر جاتی ہے

موت کو اتنا قریب دیکھ کر بھی
اُن کی ہنسی بند نہیں ہوتی

Scanned with CamScanner

اُن کے قدم نہیں لڑکھڑاتے
وہ ہنستے ہی رہتے ہیں
وہ چلتے ہی رہتے ہیں
ہر سمت میں بے شمار
گولیاں چلاتے
ہر دیوار، ہر دروازے پر
بہت سے سوراخ کرتے
سیاہ سڑک پر انسانی خون سے
سُرخ نشان ڈالتے
اپنے پیچھے تروتازہ پھولوں سے بھری
قبروں کی جنّت
اپنے پیچھے
لاتعداد آنسوؤں سے بھرا
شفاف دریا چھوڑتے
ہنستے ہوئے
وہ گزر جاتے ہیں

کبھی کبھی اُن میں سے ایک آدھ لڑکا
اپنے کسی ساتھی کی غلطی
یا مخالف سمت سے آنے والی گولیوں کی وجہ سے
رُکتا ہے
اور ہنستے ہوئے
ایک کار کے پیچھے چھپنے کی کوشش میں
زمین پر گر جاتا ہے
ہمیشہ کے لیے

ہر طرف خاموشی ہو جانے پر
باقی لڑکے
اُس کے ٹھنڈے، بے جان جسم کے چاروں طرف

جمع ہو جاتے ہیں
وہ دیکھتے ہیں
لڑکے کے چہرے پر
موت کی ہنسی
اب تک موجود ہے

مختلف لوگوں کے لیے نظم

ہم مختلف ہیں
ہمارے سروں کے اوپر
آہستہ آہستہ اڑنے والا آسمان
ہمارے پیروں کے نیچے سے
دھیرے دھیرے کھسکتی زمین
مختلف ہے

ہماری نیلی رگوں میں
دوڑنے والا خون
سرخ نہیں سفید رنگ کا ہے
ہمارے جسموں کی رنگت گندمی نہیں
مسلسل دھوپ اور غصّے کی وجہ سے
ہمارے بدن
سیاہ ہو گئے ہیں

خوف کی حالت میں ہمارا دل
ایک منٹ میں
شاید ایک سو بیس دفعہ دھڑکتا ہے
ڈھول کی طرح
دھڑکنے والے اس دل کو بجا بجا کر

ہم اعلان کرتے ہیں
کہ ہم مختلف ہیں

ہمارے آباواجداد
براعظم انٹارکٹیکا میں رہتے تھے
صرف اسکیمو ہی
ہمارے دکھ سکھ کے ساتھی
ہمارے قریبی رشتے دار ہیں
برف کی سلوں سے بنے گھر
اگلو
ہماری آبائی رہائش گاہ
اور پنگوئن ہمارا
قومی پرندہ ہے

ہمارے آس پاس
جب کوئی نہیں ہوتا
پنگوئن کی یاد میں ہم
لڑھک لڑھک کر چلنے لگتے ہیں
اور آنکھیں بند کر کے
قطب شمالی جا پہنچتے ہیں
وہاں جو زبان بولی جاتی ہے
ہمارے ترانے اُس کے سرد لفظوں سے
بھرے پڑے ہیں

گرم علاقوں میں
کوئی ہماری بات نہیں سمجھتا
اسی لیے جب ہم کہتے ہیں
ہم مختلف ہیں
سب خاموش ہو جاتے ہیں

Scanned with CamScanner

ہم اپنی بات دُہراتے ہیں
اور دُہراتے ہی چلے جاتے ہیں
سب ہنستے ہیں اور
ہمیشہ ہنستے ہی رہتے ہیں

گھنٹی کا مسئلہ

پہلی بار جب چوہوں کی تعداد
لوگوں سے زیادہ بڑھ گئی
تو چوہے دان ایجاد ہوا
مگر جب چوہے دان میں لگائی جانے والی روٹیاں
ناکافی ہو گئیں تو
چوہے مارنے کی دوا دریافت کی گئی
مگر تبدیلیِ آب و ہوا
اور چوہوں کی جسمانی قوتِ مدافعت کے باعث
جب چوہے مار دوا بے اثر ہو گئی
تو فیصلہ کیا گیا
کہ جادوئی بانسری والے کی مدد سے
چوہوں کو لے جا کر
سمندر میں غرق کر دیا جائے
جب بانسری بجی
اور بانسری والا چوہوں کو لے کر
سمندر کی طرف چلا
تو تھوڑی دور چل کر
چوہے مست ہو گئے اور گانے لگے
وہ گانے لگے
اور بانسری والے کے چاروں طرف

ناچنے لگے
چوہوں کے ناچ گانے سے گھبرا کر
بانسری والے نے
سمندر میں چھلانگ لگا دی
اور چوہے دوبارہ شہر لوٹ آئے
اب آخری تدبیر کے طور پر
ایک تربیت یافتہ
کمانڈو بلی کو بلوایا گیا
جس نے دیکھتے ہی دیکھتے
چوہوں کا صفایا کرنا شروع کر دیا
بہادر چوہے اُس سے مقابلہ کر رہے تھے
مگر کر نہ سکے
وہ ڈر کر بھاگے
اور اپنے بِلوں میں جا گھسے
وہ اپنی تعداد میں مزید اضافہ کرنے میں مشغول ہو گئے
اور کمانڈو بلی اس خوشی میں
اپنے گلے میں گھنٹی باندھ کر
چوہوں کا پیچھا کرنے لگی
گھنٹی کی وجہ سے
چوہوں اور بلی کے لیے
جو مسائل پیدا ہوئے
اُن کا ذکر پھر کبھی سہی

لاش

ہر روز
شہر کے مختلف علاقوں سے
اکٹھا کیے جانے والے

ناکارہ جسموں کو
آخر کیا کہا جا سکتا ہے
شیکسپیئر کے فارمولے کے مطابق
صرف لاش

لاش کا کوئی نام نہیں ہوتا
نہ کوئی رنگ
ہم اسے زمین پر پڑنے والے دھبّوں
اور سفید چادر سے
پہچان سکتے ہیں
لاش کا کوئی گھر نہیں ہوتا
مردہ خانے کی ٹھنڈک
یا زمین کی گہرائی کے سوا
اُسے کوئی جگہ نہیں دیتا
لاش کا کوئی مذہب نہیں ہوتا
اس کے عقیدے کے مطابق
آسمانوں تک صرف روح جا سکتی ہے
جسم تو بہت دن تک
پرائمری اسکول کے پیچھے
خشک گٹر میں
چیونٹیوں، چوہوں
یا پولیس کا انتظار کرتا ہے

اس ناانصافی پر لاش
کسی سے فریاد نہیں کر سکتی
وہ کچھ بتا نہیں سکتی
نہ اپنا نام اور نہ اُن لوگوں کا
جنھوں نے اُس کے دونوں ہاتھ
اور پاؤں باندھ کر

Scanned with CamScanner

لا تعداد گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں
اب وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں
اب وہ ہماری
یا ہم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے

اب وہ ایک لاش ہے
شہر میں چلتی پھرتی
بے شمار لاشوں کی طرح
صرف لاش

چڑیاں

یہ جھوٹ ہے
کہ کراچی میں
بارش کے بعد نکلنے والی
گھاس کی کونپلیں
گہری سبز اور نرم نہیں ہوتیں
یا یہ کہ درخت
بادلوں کی مدد کے بغیر
سایہ فراہم نہیں کرتے
یہ بھی جھوٹ ہے
کہ یہاں خرگوشوں کی آنکھیں
اندھیرے میں نہیں چمکتیں
اور گلہریاں
بادام اور اخروٹ کے چھلکوں سے
نہیں کھیلتیں
یا یہ کہ ہتھیلی پر رکھنے سے
بیر بہوٹیاں زرد پڑ جاتی ہیں

Scanned with CamScanner

سانپ اپنے حصے کا دودھ
کاغذی اژدہوں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں

ہمارے علاوہ
کراچی میں چڑیاں بھی رہتی ہیں
جو گولیوں کی آواز اور دھماکوں کے باوجود
درختوں پر سے اڑتی ہیں
دیواروں پر بیٹھتی ہیں
کہیں نہ کہیں جمع ہو کر
بلاناغہ دعائیں مانگتی ہیں
یا ہماری طرح رات بھر
اپنے اپنے ٹھکانے میں چھپی رہتی ہیں
اور صبح ہونے تک
باہر نہیں نکلتیں

شہری سہولتیں

ہمارے شہر میں
جتنا خون بہتا ہے
اُس سے کچھ زیادہ پانی
تھوڑی دیر کے لیے
ہمارے گھروں میں فراہم کیا جاتا ہے

جتنی بار ہم
آپریٹر کی مدد سے
کسی پڑوسی یا دوست کے لیے
ہنگامی امداد طلب کرتے ہیں
اُس سے بہت زیادہ کا بل

ہر مہینے ہمیں موصول ہوتا ہے

جتنی دیر
لاوارث لاشیں اور زخمی
مُردہ خانے، اسپتال یا سڑک پر
ایمبولینس کا انتظار کرتے ہیں
اُس سے کچھ زیادہ دیر
ہم اپنے بچنے کی دعائیں مانگتے ہیں
جتنے دن انسانی جسم
جھاڑیوں یا مین ہول میں چھپے رہتے ہیں
اُن سے کچھ زیادہ دن
ہم خوف کے عالم میں
اپنی دیوار کے پیچھے
کھڑکیاں دروازے بند کرتے ہوئے
گزارتے ہیں

ہماری خاموشی یا ہمارے چلّانے پر
بچوں کی طرح
ہمیں بہلایا جاتا ہے
پس ماندگان کی طرح
ہمیں مرنے والوں کا
معاوضہ دیا جاتا ہے
سوگواروں کی طرح
ہمیں دلاسا دیا جاتا ہے
دوستوں کی طرح ہمیشہ
ہمیں اپنے قریب رکھا جاتا ہے
دشمنوں کی طرح
ایک ایک کرکے
ختم کیا جاتا ہے

Scanned with CamScanner

مرنے والوں کی طرح
جنت میں جگہ ملنے کی دعا کے ساتھ
دوسری لاشوں کے ہمراہ
اوپر تلے دفن کیا جاتا ہے

قطب الدین واپس آتا ہے

اپنی خودساختہ روپوشی کے
ڈھائی سال بعد
دیر سے شروع ہونے والے مون سُون میں
قطب الدین واپس آتا ہے
کوئی اسے خوش آمدید نہیں کہتا
اس کی بہنیں اسے دیکھتے ہی
دروازہ بند کرلیتی ہیں
لیکن اس کی غم زدہ ماں
دوبارہ دروازہ کھول دیتی ہے
اور وہ اندر آجاتا ہے
ماں رونے لگتی ہے
بھائی گھر سے باہر چلے جاتے ہیں
اور دونوں بہنیں اپنے چھوٹے سے کمرے میں
چھپ جاتی ہیں
بھائیوں کی طرح
وہ بھی اسے معاف کردیتی ہیں
پھر سب ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں
اور سوجاتے ہیں
دیر سے شروع ہونے والی بارشوں کا پانی
گھر میں آنے لگتا ہے
سب گھر والوں کے ساتھ مل کر

وہ پانی باہر نکالنے لگتا ہے
غیر معمولی اُجرت پر کام کرنے والے
اُسے دیکھ لیتے ہیں
وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں
جب گھر میں جمع ہونے والا پانی
باہر چلا جاتا ہے
بارش رک جاتی ہے
اور دھوپ نکلتی ہے
گندم کی خالی بوری میں بند
ایک بے جان جسم کی صورت میں
قطب الدین واپس آتا ہے

لُو

ساری رات بارش ہوتی ہے
اور وہ پلک نہیں جھپکاتا
اپنے چاروں طرف اندھیرے کو
تکتا رہتا ہے
سارا دن دھوپ نکلی رہتی ہے
اور وہ چھتری کھولے بغیر
دھوپ میں چلتا رہتا ہے
اصل میں اس کے پاس
کوئی چھتری نہیں ہے
اور نہ کوئی دھوپ کی عینک
اور نہ کوئی چھوٹی سی پیاز
جسے جیب میں رکھ کے
وہ باہر نکلے
اور لُو سے بچ سکے

ہلکی اور بھاری چیزیں

ایک گولی
بہت ہلکی ہوتی ہے
گلی کے کونے پر کھڑے لڑکے کی
بندوق سے نکلنے کے بعد
دور فلیٹوں میں
کھڑکی سے نکلے بازو تک پہنچتے پہنچتے
وہ اپنا سارا وزن
اپنی ساری طاقت کھو دیتی ہے
اور بازو میں سوراخ کرنے کے بعد
آگے نہیں بڑھ پاتی وہیں
رہ جاتی ہے

گولی کے بازو میں رہ جانے سے
آدمی کو بہت تکلیف ہوتی ہے
اگر اس گولی کے ساتھ
دو تین گولیاں اَور بھی ہوتیں
تو شاید آدمی کو اَور زیادہ تکلیف ہو رہی ہوتی
وہ یہ بات نہیں سوچتا
اور کراہنے لگتا ہے
زیادہ گولیوں سے اس کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی
وہ یہ بات بھی نہیں سوچتا
اور رونے لگتا ہے

گولیوں سے بھی کم وزن رکھنے والے آنسو
بستر کی چادر اور پروں سے بھرے تکیے میں
جذب ہو جاتے ہیں
بازو میں اٹکی ہوئی گولی کے خیال سے

Scanned with CamScanner

وہ یہ بھی نہیں سوچتا
کہ اگر اس کے بہت ہلکے آنسو
تکیے یا چادر پر گرنے کے بجائے
بھاری بندوق پر گرتے رہتے
تو ایک نہ ایک دن
اُسے زنگ لگ جاتا
یا پھر اس کی طرف گولی بھیجنے والے
لڑکے کا سخت دل
اس کے آنسو دیکھ کر
موم ہو جاتا

بھاری چیزوں کی جگہ
ہلکی چیزیں لے لیتیں
ہلکی چیزوں کی جگہ
کچھ اور نہ آ پاتا

شہر

تم ایک چاند ہو
جو زمین کے گرد
متواتر چکر لگاتے لگاتے
تھک گیا ہے
ستاروں کے ساتھ چمکتے چمکتے
تم اُکتا چکے ہو
سورج سے روشنی مانگتے مانگتے
تمھیں شرم آنے لگی ہے

اس قدر دور سے نظر آنے والے

Scanned with CamScanner

تمھارے دودھیا کنارے
مٹیالے ہو رہے ہیں
اب تمھیں پھر سے
سمندر میں اُتر کر
نہانا چاہیے

مگر جب بھی تم
اس کا ارادہ کرتے ہو
سمندر تم سے دور ہٹنے لگتا ہے
رات ختم ہونے لگتی ہے
صبح شروع ہوتی ہے

مگر کسی نہ کسی شہر میں
سات گہرے سمندروں کے پار
تم نظر آتے رہتے ہو
لوگ اُس بُڑھیا کو دیکھ دیکھ کے
ہنستے رہتے ہیں
جو تمھاری ناہموار سطح پر بیٹھی
چرخا کاتتی رہتی ہے
ناراض مت ہونا
لوگ تمھیں دیکھ کر نہیں ہنس رہے

جب تم نظر نہیں آتے
سیاہ گہرے بادلوں
یا کسی اور وجہ سے
کئی دنوں تک
تمھارے دوست
اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی لے کر
تمھیں ڈھونڈنے نکل پڑتے ہیں

انھیں تمھاری پھیکی ہنسی کی بھی فکر ہے
اور تمھارے چمک دار آنسوؤں کی بھی
جب یہ آنسو گرتے ہیں
وہ اپنی ہتھیلیاں آسمان کی طرف اٹھا کر
انھیں سمندر میں گرنے
یا مٹی میں جذب ہو جانے سے
روکنے کی کوشش کرتے ہیں
مگر پھر بھی ایک آدھ قطرہ
ریت کے اندر
گہرائی تک
چلا ہی جاتا ہے

ہمیں کچھ عرصے بعد پتا چلتا ہے
جب ہم چھٹی کے دن
سمندر کے کنارے
بچوں کی طرح
گیلی ریت سے بس اسٹاپ
سُپر مارکیٹ، اونچی نیچی عمارتیں،
کھڑکیوں دروازوں والے بہت سے
چھوٹے بڑے گھر
بنا رہے ہوتے ہیں

اچانک انھیں سجانے کے لیے
ہمیں رنگ برنگی سیپیاں
اور چمک دار موتی
ریت میں سے ملنے لگتے ہیں

تمھاری اس مہربانی پر
خوش ہوتے ہوے

Scanned with CamScanner

ہم اِدھر اُدھر
تمھیں ڈھونڈتے ہیں
مگر تم کہیں نظر نہیں آتے
زمین کا چکر لگاتے
دکھائی ہی نہیں دیتے

**

حسن منظر

ایک اور آدمی

وکٹوریا ہمارے زُو کے تحقیقی سینٹر میں کیمیرون میں کہیں سے لائی گئی تھی۔

ہم آپس میں اُس کے حُسن کے بارے میں مذاق کیا کرتے تھے اور باتوں ہی باتوں میں اُسے نہ جانے کب ایفروڈائٹی (Aphrodite) کہنے لگے تھے۔ دراصل یہ نام اسے ہمارے ذہین ساتھی نیٹ نے دیا تھا، اور اس کی وجہ میں ابھی بتاتا ہوں۔ خوب صورت جانور تھی۔ اُس کے دانت فطرت سے لڑنے اور اپنا رزق ڈھونڈنے میں ابھی خراب نہیں ہوئے تھے۔ بال صاف ستھرے، چمکیلے، سلیٹی اور چھوٹے تھے جیسے نچلی زمین کے گوریلوں کے ہوتے ہیں۔ اور اس کے بالوں سے ہم نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کے زاد بُوم کی نباتات میں وٹامن اے اور ڈی کی کمی نہیں تھی۔ کھال میں کہیں بھی وہ بے بال دھبے نہیں تھے جو خارش کا نتیجہ ہو سکتے ہیں اور جو ہم میں سے ایک کو ہمیشہ گھاس کے میدان میں چٹیل گولف لنکس نظر آتے تھے۔ ہم سب گولف کھیلتے ہیں، اُس ساتھی کو گولف سے نفرت ہے۔

ایفروڈائٹی سے مراد تھی حُسن کی دیوی، جس کی اولاد سے زُو تو خیر بھر ہی جائے گا، ہم اس کے بچے دوسرے ملکوں کو بھی بھیج سکیں گے۔ اور تھوڑا اس طرف بھی اشارہ تھا کہ وہ گوریلوں کی دنیا میں جنسی عشق کے جھنڈے گاڑ دے گی اور گوریلے اس کا نیوڈ بنوائیں گے جسے اُن کی دنیا میں سراہا بھی جائے گا اور چُھپایا بھی جائے گا۔ ان اوّلیں خیالات کے بہت جلد بعد ہم میں سے ہر ایک کو وہ تصویرِ حُزن نظر آنے لگی، کیوں کہ چشم خانوں کی گہرائی سے اُس کی آنکھیں ہر آنے جانے والے کو بے بسی سے دیکھا کرتی تھیں اور چہرے کی سلوٹیں ایسے میں کچھ زیادہ ہی گہری ہو جاتی تھیں۔ لگتا تھا وہ سوچ میں ہے۔ لیکن اس بات کو ہم نے زیادہ اہمیت نہیں دی کیوں کہ گوریلے یوں بھی سنجیدہ طبع ہوتے ہیں۔

وکٹوریا کا کھانا اکثر اِدھر اُدھر پڑا رہتا تھا۔ اس کی شروعات پھلوں، سیلیری اور کیلے کے تنے کی

Scanned with CamScanner

چھال سے کرائی گئی تھی جنھیں وہ بے دلی سے کھاتی تھی۔ پھر ہمیں خیال آیا شاید گوشت کی عادی ہے۔ اُسے مختلف قسم کے گوشت دیے گئے؛ انھیں اس نے بس سونگھ کر چھوڑ دیا۔ اس کا وزن گر رہا تھا اور ہمیں ڈر ہوا کہ اس کے بالوں کی چمک بھی مٹنے والی ہے۔ اُسے مچھلی کے جگر کے تیل کے کیپسول دینے کی کوشش کی گئی لیکن اس معاملے میں وہ ہیومن مادائوں سے کم نہیں تھی جنھیں اکثر وائٹامنز کی بُو سے متلی ہونے لگتی ہے۔ وکٹوریا کیپسول کے بعد اُلٹی کر دیتی تھی۔

وہ دن ڈھلے بستر بنانے کی بھی عادی نہیں تھی حالاں کہ اس کے لیے قفس میں ڈنٹھل، شاخیں، پتے سب ہی پڑے ہوتے تھے۔ اکثر پتا چلتا تھا وہ رات کو بہت کم سوئی ہے، اور کبھی کبھی کھڑی ہو کر چلنے لگتی تھی جیسے دور کی کوئی چیز دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ دن میں زیادہ تر وہ چاروں ہاتھ پیروں پر چلتی تھی یا زو میں آنے والوں سے پیٹھ موڑ کر بیٹھی رہتی تھی۔ اس میں وہ کھلاڑپن نہیں تھا جو اس عمر کے گوریلوں یا گوریلاؤں میں ہوتا ہے، یعنی جنھیں کم عمری میں زو کی دنیا میں لے آیا جاتا ہے، جس طرح انسان کے وہ بچے تھوڑا بڑے ہونے پر کھلنڈرے نکلتے ہیں جو قید خانے میں پیدا ہوئے ہوں یا جو ماں کے ساتھ جیل میں آئے ہوں۔

نیٹ جو گفتگو میں سب سے زیادہ آزادی برتتا ہے، شروع کے دنوں میں وکٹوریا کے بارے میں کہا کرتا تھا: "نہ جانے کتنے نوجوان ڈینڈی (چھبیلے) گوریلے اس کی یاد میں افریقہ کی جھاڑی (bush) میں دم توڑ رہے ہوں گے، کتنوں نے خودکشی کی ہو گی۔ شی از اے بیوٹی!"

وہ ہم میں سب سے زیادہ ذہین ہے اور اس کا گوریلوں کی نفسیات پر پچھلے دس بیس برس کا کام بہت اہم مانا جاتا ہے۔ وکٹوریا کے قفس کے جنگلے کو پکڑے وہ دیر تک آنکھیں بھینچے اسے دیکھتا رہتا تھا اور سگریٹ کا دھواں قفس کے اندر چھوڑتا رہتا تھا۔ کسی رفیق کے پاس آ جانے پر وہ وکٹوریا کے بارے میں کوئی ایسی بات بک دیتا تھا جو مہذب لوگ بدچلن عورتوں کے بارے میں بھی نہیں کہتے ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں اُسے تمام گوریلوں سے کتنی اُلفت ہے، کتنا وہ اُن کا خیال رکھتا ہے۔

ایک دن اس نے کوفی بریک میں بڑی فکرمندی سے کہا، "وکٹوریا ڈپریسڈ ہے۔"

ہم سب چپ رہے۔

تھوڑی دیر بعد آنکھیں بند کیے کیے اس نے کہا، "وکٹوریا عمر کی آ گئی ہے۔ اُسے ایسٹرس (estrus) ہوتا ہے۔"

"پھر؟" کسی نے کہا۔

"علاج بہت آسان ہے،" اس نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔ "ہمیں اس کی تنہائی کو ختم کرنا چاہیے۔"

زو میں نئے آنے والے جانوروں کو ایک مدت تک پرانے باسیوں سے دور رکھا جاتا ہے، لیکن وکٹوریا کے معاملے میں یہ پابندی اٹھالی گئی۔

Scanned with CamScanner

لیکن وکٹوریا نے اپنے نئے، جوان ساتھی ہیکٹر کا کھلے بازوؤں سے سواگت نہیں کیا جو زو ہی میں پل کر بڑا ہوا ہے اور ہم سب سے کافی آزاد ہے۔ وکٹوریا کی سرد مہری کی وجہ سے ہیکٹر کو دوبارہ اس کے کٹھرے میں بھیج دیا گیا اور بظاہر یہ معاملہ ختم ہو گیا۔

لیکن ہمارے ذہین ساتھی نے ایک اور دن کوفی بریک میں اعلان کیا: "وکٹوریا خاندان بنانے کے رستے میں ہے۔"

ہم اتنی دیر تک نیٹ کو مبارک باد دیتے رہے کہ اسے کہنا پڑا، "مگر میں تو باپ نہیں ہوں۔ جا کر ہیکٹر کو مبارک باد دو۔" اس جیسا منہ پھٹ ہم میں سے کوئی دوسرا نہیں تھا۔

وکٹوریا کے قفس میں دوسرا متنفّس نہیں تھا، نہ ہی وہ جہاں تھی وہاں دوسرے گوریلوں کی آواز پہنچتی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی خوش نظر آتی تھی۔ وہ پھل، جڑیں، کونپلیں اور ہری چھالیں سب شوق سے کھانے لگی۔ اس کا وزن بڑھ رہا تھا — اور ہمارے خیال میں نیٹ کا بھی۔ لوگوں میں اب بھی اُسے دل چسپی نہیں تھی لیکن تھوڑی بہت اُچھل پھاند کرنے لگی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دن اسے اسقاط ہو گیا اور قفس میں بڑا دلدر رہا۔

کوفی بریک میں نیٹ نے کہا:

"یہاں اسے گائیڈ کرنے والی کوئی دوسری ہستی نہیں ہے۔ بیچاری ایک دم معصوم ہے۔"

پھر اس نے کہا، "ہمارے پاس کوئی اور تجربہ کار مادہ بھی نہیں ہے۔"

کسی نے کہا، "ہم سب کی بیویاں تجربہ کار ہیں، تمہاری بھی۔"

نیٹ نے مذاق کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا، "اس وقت وہ کسی عورت کو اپنے پاس بھٹکنے دیتی؟ پھاڑ کھاتی۔"

اور یہی باتیں اس نے بڑی سنجیدگی سے وکٹوریا کے دوسرے اسقاط پر کہیں۔ اب وہ وکٹوریا کے لیے پیار میں کوئی چار حرفی لفظ استعمال نہیں کرتا تھا۔ اسے جنس کی بھوکی کتیا کہنا وہ بہت پہلے چھوڑ چکا تھا کیوں کہ اس نے دیکھ لیا تھا اس معاملے میں بقول اس کے وکٹوریا برف میں لگی شمپین کی طرح سرد تھی۔ دوسرے ساتھی بھی اُسے ایفروڈائٹی کہنا ترک کر چکے تھے، جو وہ بے وجہ کہنے لگے تھے۔

لیکن ہم جانتے تھے معاملہ زو میں گوریلا کی افزائشِ نسل کا تھا جو بہت کم کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ حمل کے دوران اچھل پھاند تو جنگل میں سب ہی مادائیں کرتی ہیں؛ میلوں خوراک کی تلاش میں پھرتی ہیں اور کسی کو اسقاط نہیں ہوتا۔

یہ بات بار آوری (fecundity) کے تجربے کرنے والے انسٹی ٹیوٹ کے دو پُرجوش ڈاکٹروں جُوڈی اور بوب سے بھی گفتگو میں آئی جن کے اپنے کوئی بچہ نہیں ہے لیکن جو عورت کے انڈے کو رحم سے باہر مرد کے اسپرم میں فرٹی لائز کرانے میں مہارت رکھتے ہیں۔

وکٹوریا کے ڈپریسڈ اور بے اولاد ہونے کا سن کر دونوں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہوئی اور

ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کے بعد دونوں نے ایک ساتھ یہ چند جملے کہے:

"ہوسکتا ہے اس کا ڈپریشن بے اولاد ہونے کی وجہ سے ہو۔"

"ہوسکتا ہے اس کا رحم یا انڈا اسپرم کو رد کردیتا ہو۔"

"گوریلا اسپرم کو۔"

"ہوسکتا ہے کسی دوسرے میمل کے اسپرم کو رد نہ کرے۔"

"انسانی اسپرم کو۔"

شوہر اور بیوی نے تجربہ کرنے والوں کی بے اختیار خوشی اور اتنے جوش کے ساتھ یہ جملے کہے کہ ہم سب بھی ان کے ولولے کی لپیٹ میں آگئے۔ یہ حقیقت تھی سوٗر کا دل انسان کی چھاتی میں لگانے کا تجربہ کیا جاچکا تھا اور جانوروں کا اور بہت کچھ انسانی جسموں میں وقتاًفوقتاً منتقل کیا جاتا رہا تھا۔ کیا ہوا اگر وصول کرنے والے کے جسم نے اسے تھوڑے ہی دن بعد ٹھکرا دیا تھا۔ یہاں ٹھکرائے جانے سے وکٹوریا کی جان پر تو بن نہ آتی۔ تجربہ محفوظ نوعیت کا تھا۔ لیکن نیٹ کچھ پُرجوش نظر نہیں آرہا تھا۔

وکٹوریا کا وزن تیزی سے گر رہا تھا۔ کیلے اور بھٹے اور اناناس اس کے آس پاس پڑے رہتے تھے لیکن چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتے ہوئے وہ انھیں رک کر سونگھتی بھی نہیں تھی۔ زیادہ وقت اس کا قفس کے جنگلے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھے رہنے میں گزرتا تھا جیسے اُسے آس پاس کی دنیا سے نفرت ہو۔ اس کا راتوں کا رونا اور بڑھ گیا تھا جو گھری گونجنے والی آواز میں دور تک سنا جاسکتا تھا۔ جس عورت کو کبھی حمل نہ ہوا ہو وہ اولاد کے لیے اتنا نہیں روتی ہے جتنا وہ جس کا حمل ضائع ہوگیا ہو۔

آخر ایک دن سیڈیٹوز (sedatives) دے کر وکٹوریا کو اوپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ اسے وہاں لے جانے جانے میں جوڈی اور بوب اس کی ٹرولی کے ساتھ بے تابی سے چل رہے تھے۔ نیند میں ڈوبی ہوئی وکٹوریا آہستہ سے آنکھیں کھول کر بدلتے ہوئے کوریڈورز کو دیکھتی تھی اور پھر آنکھیں بند کرلیتی تھی۔

اوپریشن میں خاصی دیر لگی اور ہم میں سے اکثر مذہب میں اعتقاد نہ رکھنے والے بھی اس کے ہوش میں آنے کی دعا مانگتے رہے۔ آنکھیں کھولنے پر وکٹوریا نے اُلٹی کی۔ اپنے جسم کو اِدھر اُدھر سے ٹٹول کر دیکھا جیسے اُسے پتا چل گیا ہو کہ اس کے ساتھ بے ہوشی میں کوئی حرکت کی گئی ہے۔

تجربہ ہماری امید کے مطابق ناکام رہا۔ لیکن تجربہ کرنے والوں کی دنیا میں ناکام تجربے بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں اور ان سے تجربہ کرنے والے کی امنگ اور بُج کی دھار کند نہیں ہوتی، اور تیز ہو جاتی ہے۔ "سائنٹفک جرنل آوف بایولوجیکل ریسرچ" اور "آرکائیوز آوف پروبلمز ان اوبسٹیٹرکس اینڈ جینے کولوجی" میں دو مقالوں کے شائع ہونے پر ہمارے پُرجوش ساتھی چند روز بے حد خوش رہے اور، جیسا کہ ہوا کرتا ہے ایک تحقیقی کام دوسرے کام کی راہ کھول دیتا ہے، ایک دن ہمارے جواں سال ساتھیوں

نے کہا:

"ہمیں معلوم ہے کیا غلط ہوا۔"

"وکٹوریا کا انڈا ناقص ہے۔ قصور صرف ہیکٹر یا مرد کے اسپرم کا نہیں تھا۔"

"ہم چاہتے ہیں اس دفعہ ہیومن مادہ کا انڈا استعمال کیا جائے۔"

نیٹ جو اَب تک جلا بھُنا خاموش بیٹھا تھا، اپنی ہنسی روک نہیں سکا۔ پہلے اس نے کس کر اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا کہ بدمعاشی کا جو خیال اسے آیا تھا کہیں بات بن کر عورت کی موجودگی میں اس کے منھ سے نکل نہ جائے۔ پھر قہقہہ لگا کر بولا، "میں ضبط نہیں کر سکتا۔" اور معذرت کرتے ہوئے اس نے جو مشورہ بوب کو دیا وہ اس کی ہنسی میں کھو کر رہ گیا۔ لیکن ہم نیٹ کی بات سمجھ گئے اور ہنسنے لگے۔ جوڈی بھی سمجھ گئی اور اس نے بوب کو کہنی ماری کہ اشارہ اس کی طرف تھا۔ وہ اٹھارہ بیس سال کے لڑکے کی طرح جھینپ گیا اور اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

وکٹوریا اُن دنوں سخت بے زاری، اداسی میں گرفتار تھی اور اس کی کھال میں جھول پڑ گئے تھے۔

دوسرے تجربے کے لیے سوچ بچار ہوا۔ اوپریشن میں وکٹوریا کے لیے یقیناً خطرہ تھا۔ ہو سکتا تھا وہ اَنیستھیزیا سے واپس ہوش ہی میں نہ آئے۔ اس کے دوبارہ کیمیرون بھیجے جانے کے امکان پر بھی غور کیا گیا اور ہوائی جہاز سے سفر کے خطرے اور جھاڑی میں اس کے آزاد گوریلاؤں کے ہاتھوں مارے جانے کے احتمال کے پیشِ نظر اس تجویز کو بھی رد کر دیا گیا۔ دنیا میں یہ امن پسند جانور اتنے کم رہ گئے ہیں کہ ہم ایک اَور کو جان بوجھ کر موت کے حوالے کرنے کو تیار نہیں تھے۔ یہ ہمیں معلوم تھا کیمیرون میں وہ جہاں سے لائی گئی تھی گوریلوں کے کئی گروپ ایسے تھے جن کا لیڈر شکاریوں کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا اور باقی جانوروں میں بکھرے ہوئے خاندانوں کے افراد کی طرح ایک دوسرے سے لگاو نہیں تھا۔ ایسے کسی گروپ میں اُسے چھوڑنا جان بوجھ کر اس کی ہتیا کرنے کے مترادف ہوتا۔ سمندری سفر طویل ہوتا اور راستے ہی میں دم توڑ دینے کی وجہ سے بے چاری کی قبر پانی میں بنتی جس کے لیے ہم میں سے کوئی تیار نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ وکٹوریا ہم سب کے دل میں گھر کر چکی تھی۔

لیکن تحقیق کا جوش کسی چھوت والی بیماری سے کم نہیں ہوتا ہے اور ساتھ میں کام کرنے والوں کو آسانی سے لگ جاتا ہے۔ ہمیں بھی لگا اور ہماری مرضی اور فہم کے خلاف لگا۔

جب وکٹوریا دوسری بار اوپریشن تھیئٹر میں تھی، ہم سب اس طرح باہر لاؤنج میں بیٹھے تھے جیسے کسی اپنی عزیز کے اوپریشن کی کامیابی یا ناکامی کی خبر سننے کے منتظر ہوں۔ اور انھیں کی طرح ہم توجہ ہٹانے کو اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ نیٹ نے اوپریشن کے وقت اندر موجود رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔

کچھ دیر خاموش بیٹھ کر ہم مختلف ملکوں کے سیاسی حالات پر گفتگو کرنے لگے اور ہمیں تعجب ہوا اتنے دنوں ہم خبریں پڑھتے، سنتے اور دیکھتے تو رہے تھے لیکن جیسے اُن حالات سے خود انسولیٹڈ (insulated) تھے۔ نہ روانڈا میں ایک نسلی گروہ کے دوسرے گروہ کے ہاتھوں مٹائے جانے کی

خبروں کا ہم پر کوئی زبردست جذباتی اثر ہوا تھا نہ چیچنیا میں مہیب روسی طاقت کے ایک انتہائی قلیل قوم کو بے دردی سے کچلنے کا۔ اجودھیا بھارت میں چند سال پہلے ایک اقلیت کی عبادت گاہ کو ایک کثیر اکثریت والے مجنونوں نے ڈھایا تھا۔ اُس نفرت کے جوالامکھی کی راکھ ابھی تک وہاں کی آبادی پر گر رہی تھی۔ پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کا حال پندرہ بیس سال پہلے کے بیروت سے بد تر تھا جہاں وہ جنہیں زمین کے بیٹے نہیں مانا جاتا تھا اور بے اقتدار بے بس تھے، چند سالوں سے اپنے دس بیس افراد کی لاشیں روزانہ سوکھی ندیوں کی تلہٹی اور سڑکوں سے اٹھانے پر مجبور تھے اور کہا جا رہا تھا وہ خود اپنے قاتل تھے، اپنے ہی گھروں اور محلوں میں دہشت پھیلا رہے تھے۔ سومالیا، عراق، لیبیا، بوسنیا ہرزگووینا، اسرائیل، کشمیر سب، جہاں جہاں طاقت ور کم زور کو ختم کر کے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ جگہ بنا رہے تھے، عالمی خبریں تھیں، لیکن وکٹوریا کی بڑھتی ہوئی اُداسی اور گرتی ہوئی جسمانی صحت نے ہم کو سب کچھ بُھلا رکھا تھا۔ اور اس وقت جب وہ اندر لیٹی ہوگی، ہم جو اس کے لواحقین تھے، باہر بیٹھے ان خبروں پر تبصرہ کر رہے تھے، جیسے آج ہی ایک ساتھ یہ خبریں سنی ہوں۔

پھر چرس، ہیروئن، کوکین اور اسلحے کے بڑے پیمانے پر اسمگل کیے جانے کی خبریں چھڑ گئیں اور فوراً ہی مزدور بچوں اور بینکاک کی طوائف بچیوں کا ذکر آ گیا۔ ہم نے ان ملکوں کے نام اپنے ذہنوں میں ڈھونڈے جہاں جہاں یہ کاروبار ہو رہا ہے اور وہاں کی حکومتوں کی ایما سے ہو رہا ہے۔ یہ کہتے ہوئے ہمیں خیال آیا کہ کونگو، یوگینڈا، کیمیرون کی وہ دنیا جو وکٹوریا سے چھین لی گئی ہے، اس دنیا سے کتنی مختلف ہے جس کی خبروں سے اخبار پٹے پڑے ہیں۔ کسی نے کہا، "اچھا ہے اُسے خبر ہے کہ وہ کہاں آ گئی ہے۔" اُسی وقت اوپریشن تھیئٹر سے پہلے میاں بیوی کی ٹیم باہر نکلی اور ان کے جلو میں ہمارا ذہین ساتھی نیٹ اور اوپریشن تھیئٹر کا عملہ۔

"وکی کا اوپریشن کے دوران ایک دفعہ دل رک گیا تھا،" ہمارے ساتھی نے فیس ماسک سے ماتھے کا پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

"اب وہ کیسی ہے؟" ہمارے منھ سے ایک ساتھ نکلا۔

"کچھ کچھ ہوش میں آ چلی ہے۔"

اپنے قفس میں پہنچ کر وکٹوریا نے دو تین بار اُلٹیاں کیں جن میں صرف پانی تھا، اپنے نچلے جسم کا جائزہ لیا اور غفلت میں چلی گئی۔

بعد کے دنوں میں وکٹوریا سے زیادہ ہم منتظر رہے کہ دیکھیں کیا پیش آتا ہے۔ جیوں جیوں اس کا پیٹ بڑھ رہا تھا اس کا چونچلاپن واپس آتا جا رہا تھا۔ زیادہ اُچھل کود سے روکنے کے لیے اسے سیڈیٹوز دیے جا رہے تھے۔ اب وہ کھڑی ہو کر پیروں پر چلتی ہوئی جنگلے تک آ جاتی تھی اور ہاتھ بڑھا کر بسکٹ، مکئی کی کھیلیں یا جو کچھ بھی دیا جائے لے لیتی تھی۔ اس کی نیند درست تھی، راتوں کا ماتم رک چکا تھا، بول و براز کے نظام صحیح کام کر رہے تھے، بالوں میں بھی دوبارہ چمک آ چلی تھی۔ مختصر یہ کہ وکٹوریا خوش تھی۔

Scanned with CamScanner

وقت آنے پر اس کے لیے زچگی کا انتظام کیا گیا، ایسا کہ اُسے اس وقت نہ کوئی انسان دیکھ رہا ہو نہ کوئی جانور۔ اس کے پاس اوڑھنے، بچھانے کو بہت کچھ تھا اور ہر وہ چیز جس کی اُسے ضرورت ہو سکتی تھی۔ اس کے قفس میں چند اور چیزیں بھی تھیں جن کی اُسے خبر نہیں تھی: چھپے ہوئے کیمرے اور مائیکروفون۔ اُس رات ہلکی دودھیا روشنی میں تکلیف کے عالم میں وہ ٹہلے جا رہی تھی اور شاید جگہ کا انتخاب بھی کر رہی تھی۔ آخر کار فرش پر ایک جگہ اُس نے ادھر اُدھر سے اٹھا اٹھا کر ملائم ڈنڈیوں، شاخوں اور پتوں کا ڈھیر کر دیا اور اس پر بیٹھ گئی۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بوب نے فتح مندی کے اظہار میں ایک انگوٹھا کھڑا کر کے اپنا اٹھا ہاتھ ہماری آنکھوں میں لہرایا۔ وہ بائیں ہتا تھا۔

وکٹوریا نے خود کو رات کے دو بج کر پینتیس پر تکلیف سے چھڑایا۔ ہم مین آوفس میں بیٹھے پورے عمل کو دیکھ رہے تھے اور متعجب تھے وہ سب کام اس طرح کر رہی تھی جیسے اس کی عمر چھ سات سال نہ ہو دس پندرہ سال ہو اور ساری زندگی وہ بچے جنوانے ہی کا کام کرتی رہی ہو۔

تکلیف سے فارغ ہو کر اس نے روتے ہوئے بچے کو گھبرا کر اٹھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ کبھی اس کے ہاتھ بچے کے سر پر جاتے تھے اور کبھی کانوں پر جو شاید اس کی توقع سے بہت زیادہ بڑے تھے۔ اس نے جلدی جلدی کئی بار بچے کی انگلیوں کو کھولا اور بند کیا، گھبراہٹ میں دو ایک بار اُسے سونگھا اور پھر ہاتھوں میں اٹھا کر روشنی کی طرف بلند کیا۔ اُس وقت اس کے منھ سے وہی گونجنے والی گہری آواز نکلی جو رات کو سنی جاتی تھی لیکن اس سے ہزار گنا تیز، جو سینے کی گہرائی سے نکلی تھی۔

ہماری نظریں وکٹوریا سے ہٹ کر اس کے کرم فرماؤں پر گئیں۔ دونوں بڑے انہماک سے اس سین کو دیکھ رہے تھے اور نوٹس لیتے جا رہے تھے کہ زچگی کی کون سی اسٹیج کتنے منٹ یا گھنٹے کی تھی۔

وکٹوریا نے بچے کو نرمی سے اپنے پتوں اور شاخوں کے بستر پر لٹا دیا اور قفس کی پشت کی طرف جاتے ہوئے غیر مسلسل بھونکنے کی سی چند آوازیں نکالیں۔

جب ہم اُس کی آوازیں اچانک بند ہونے پر اس کے قفس میں پہنچے تو بچہ پتوں اور کونپلوں کی ڈھیری پر سو رہا تھا۔ وکٹوریا کے بارے میں بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ شہر کے مُردہ عجائب گھر کی زینت بنے گی کیوں کہ اس کی لاش ٹیکسی ڈرمسٹ کے حوالے کر دی گئی ہے۔

وکٹوریا کا ہمارا کُل ۵۶۰ دن کا ساتھ رہا۔

**

افضال احمد سیّد

ایک افتتاحی تقریب

فلورا لک
لہریے دار اسکرٹ،
نیم برہنہ شانوں
اور کالی کروشیا کی بیرٹ میں
مختصر جلوس کے ساتھ
کیماڑی تک گئی

وہ اسکاچ چرچ میں رکی
اس نے دل چسپ تقریریں سنیں

صبح اُسے
ٹرالیوں کے گلوانا ئزڈ لوہے کی چھتوں والے گودام
اور ساٹھ گھوڑوں کے اصطبل کا دورہ کرایا گیا

ٹرام وے کی افتتاحی تقریب میں
کراچی کی سب سے خوب صورت لڑکی
خوش نظر آرہی تھی

Scanned with CamScanner

اگر اس کا کوئی محبوب ہوتا
وہ اُسے اُس دن بہت بوسے دیتی

اُس کی خوشی کے احترام میں
کراچی ٹرام وے
نوّے سال تک پٹریوں پر دوڑتی رہی

اور جب
مضبوط ٹرانسپورٹروں نے
ٹرام کی پٹریاں اکھاڑ دیں
شہر اُجڑنا شروع ہو گیا

شہر میں بہار لوٹ آئے گی

وزیرِ اعظم کی
فوٹوجینک مسکراہٹ کے نتیجے میں
ایڈونس کی طرح
قتل کیا گیا نوجوان موت کی سرزمین سے لوٹ آئے گا
اور دوسرے مرنے والے بھی

صدر کے کھنکھارتے ہی
دہشت گرد ہتھیار پھینک دیں گے
اور مہران بینک میں ملازمت اختیار کر لیں گے

سہ پہر کو
وزیرِ اعلیٰ کی جماہی رُکتے ہی
لوگ سنیماؤں اور تھیٹروں کو چل پڑیں گے
فریچ بیچ پر نمفو لڑکیاں ٹاپ لیس چہل قدمی کریں گی

مضبوط شاخوں پر
پھانسی پانے کے بعد
ہماری آنکھیں اور زبان اُبل آنے کے بعد
شہر میں بہار لوٹ آئے گی

ہمیں بہت سارے پھول چاہییں

ہمیں بہت سارے پھول چاہییں
مارے جانے والے لوگوں کے قدموں میں رکھنے کے لیے
ہمیں بہت سارے پھول چاہییں
بوریوں میں پائی جانے والی لاشوں کے چہرے ڈھانکنے کے لیے
ایک پوری سالانہ پھولوں کی نمائش
ابھی سرد خانے میں محفوظ کر لینی چاہیے
نامزد مرنے والوں کی
پولیس قبرستان میں کھدی قبروں کے پاس رکھنے کے لیے
خوب صورت بالکنی میں اُگنے والے پھولوں کا ایک گچھا چاہیے
بس اسٹاپ کے سامنے
گولی لگ کر مرنے والی عورت کے لیے
آسمانی نیلے پھول چاہییں
یلو کیب میں ہمیشہ کی نیند سوئے ہوئے دو نوجوانوں کو
گدگدانے کے لیے
ہمیں خشک پھول چاہییں
مسخ کیے ہوئے جسم کو سجا کر
اصلی صورت میں لانے کے لیے
ہمیں بہت سارے پھول چاہییں
اُن زخمیوں کے لیے
جو اُن اسپتالوں میں پڑے ہیں
جہاں جاپانی یا کسی اور طرح کے راک گارڈنز نہیں ہیں

ہمیں بہت سارے پھول چاہییں
کیوں کہ ان میں سے آدھے مر جائیں گے
ہمیں رات کو کھِلنے والے پھولوں کا ایک جنگل چاہیے
اُن لوگوں کے لیے
جو فائرنگ کی وجہ سے نہیں سو سکے
ہمیں بہت سارے پھول چاہییں
بہت سارے افسردہ لوگوں کے لیے
ہمیں گُم نام پھول چاہییں
بے ستر کی گئی ایک لڑکی کو ڈھانپنے کے لیے

ہمیں بہت سارے پھول چاہییں

ہمیں بہت سارے پھول چاہییں
بہت ساری رقص کرتی بیلوں پر لگے
جن سے ہم اس پورے شہر کو چھپانے کی کوشش کرسکیں

ہمارے لیے

پولی نیشین آنکھوں والی
ایک خوب صورت لڑکی
نارتھ امریکا کے ایک شہر میں
ہمارے لیے امدادی ڈنر کے کارڈ فروخت کر رہی ہو گی

ویانا کی معمر عورتیں
ہمارے لیے پرانے کپڑے جمع کریں گی
جو مارسیلز سے
کراچی کے لیے جہاز پر چڑھائے جائیں گے

Scanned with CamScanner

برونائی دارالسلام
کراچی کے پچاس لاوارث بچوں کو
قبول کرے گا

ایک حقیر اقلیت
بنگلادیش میں
ہمارے حق میں مظاہرے کرے گی

سرائیوو کے استیفانووسکی سے
کراچی میں مارے جانے والوں کی ڈائرکٹری
مرتب کرنے کو کہا جائے گا

ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا

اعلیٰ لباس ڈِزائن کرنے والوں سے
اُس کی محبت
اس کا ایمبرو ئڈرڈ بولیرو
اس کا ابدی زندگی کا مصری تعویذ
اس کی اسلام اور چاکولیٹ چِپ آئس کریم سے
رغبت
اس کا عروسی اور سبز اور نیلی حلف برداریوں کا جوڑا
اس کے حکم پر لوگوں کو برہنہ کیا جانا
ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا

Scanned with CamScanner

کھیل

صدرِ مملکت
آنکھوں پر پٹی باندھ کر
کِن فیسٹر میں بورڈ پر بنے گدھے کے خاکے میں
اُس کی دُم پن سے لگانے کی کوشش کر رہے ہیں
تین لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس رہی ہیں
ان میں سے ایک بہت
خوب صورت ہے

ایک اہم شخص کی محبوبہ
اس کے کمرے میں دبے پاؤں آنے کے بعد
اس کی آنکھیں موند کر
اسے گیس کرنے کو کہتی ہے
اس وقت اس کی انگلی میں اس کی دی ہوئی انگوٹھی نہیں ہے

وزیرِ اعظم
آنکھوں کی پٹی باندھ کر
اپنے بچوں کے ساتھ سر سبز لان پر
بلائنڈ مین بَف کھیل رہی ہیں

ہم لوگوں کو
آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر
قیدیوں کی گاڑیوں میں دھکیلا جا رہا ہے

افتتاحی تختی چوری ہو گئی ہے

ایک ہزار امریکی ڈالر کی
تختی
جو ایک منصوبے کے افتتاح پر نصب کی گئی تھی
چوری ہو گئی ہے

یہ سنگین مسئلہ ہے
نامعلوم چوروں کے خلاف ابتدائی رپورٹ درج کر کے
خاموش نہیں رہنا چاہیے

اسلام آباد کو چاہیے
پانچ ہزار پولیس اور رینجرز کی نفری
علاقے کے محاصرے کے لیے روانہ کرے
گھر گھر تلاشی لی جائے
نوجوانوں کو گرفتار کیا جائے
بچوں کو طمانچے مارے جائیں
بوڑھوں کے سر دیوار سے ٹکرائے جائیں
ہر پسند آنے والی چیز چھین لی جائے

تختی نہ مل سکنے کی صورت میں
اُس حفاظتی دستے کو برطرف کیا جائے
جس نے
افتتاح کرنے والی شخصیت کی واپسی پر
اس کی سیاہ مرسیڈیز کی تلاشی نہیں لی تھی

ہدایات کے مطابق

وزیر اعظم جنوب کی طرف نہیں جائیں گی
صدر
صرف عمودی پرواز کریں گے
سپاہی
ڈھائی گھر چلیں گے
جلاوطن رہنما
ساڑھے بائیس ڈگری پر گھومیں گے
لوگ
گھروں سے نہیں نکلیں گے
ایمبولینسیں
زگ زیگ چلیں گی
تاریخ
پہلے ہی اینٹی کلاک وائز چل رہی ہے

خداوند خدا کی روح

خداوند خدا کی روح پانیوں پر چل رہی ہے
رنگین پانیوں پر
اسکاٹ لینڈ سے آئے ہوئے بارہ سال پرانے پانیوں پر
خداوند خدا کی روح دوڑ رہی ہے
رقص کر رہی ہے
قلابازی کھا رہی ہے
بانہیں پھیلا رہی ہے
علامتی بوسے دے رہی ہے

Scanned with CamScanner

ایک شخص کے حوصلے کو برقرار رکھنے کے لیے
جسے صبح
اپنی آقا کی جگہ
ایک بائی پاس کا افتتاح کرنے جانا ہے

ایک لڑکی

لذت کی انتہا پر
اُس کی سسکیاں
دنیا کے تمام قومی ترانوں سے زیادہ
موسیقی رکھتی ہیں

جنسی عمل کے دوران
وہ کسی بھی ملکۂ حسن سے زیادہ
خوب صورت قرار پا سکتی ہے

اُس کے بلو پرنٹ کا کیسٹ
حاصل کرنے کے لیے
کسی بھی فسادزدہ علاقے تک جانے کا
خطرہ لیا جا سکتا ہے

صرف اُس سے ملنا
ناممکن ہے
پاکستان کی طرح
بالہ فاروقی بھی
پولیس کی تحویل میں ہے

**

Scanned with CamScanner

محمد انور خالد

نظم

میں نے فرمان کے حاشیے پر لکھا "مسترد"
جھوٹ بازار تک ٹھیک ہے
جھوٹ بازار تک ٹھیک ہے
یا راہی کی رفتار تک
جس کا دشمن کسی اور ہی شہر میں
اور ہی دشمنوں کے تعاقب میں مصروف ہے
جھوٹ بازار تک ٹھیک ہے
یا سپاہی کی تلوار تک
جس کا دشمن اسی شہر میں اس کے گھر خوانِ نعمت پہ موجود ہے
جھوٹ تلوار تک ٹھیک ہے
یا معلم کی دستار تک
جس کی مشکیں کسی جا چکی ہیں مگر سر پہ دستار کارِ فضیلت پہ مامور ہے
جھوٹ دستار تک ٹھیک ہے
جھوٹ دستار تک ٹھیک ہے
یا دبستاں کی دیوار تک
جس کی گرتی ہوئی اینٹ کو روک لیتی ہے ویسی ہی اک اینٹ گھستے ہوئے
جھوٹ اس بار تک ٹھیک ہے
جھوٹ اس بار تک ٹھیک ہے

ایک گرتی ہوئی اینٹ کہتی ہے دیوار سے
اور بچا لیتی ہے ہم سے کتنے ہی اہلِ قلم کو
جو ہر صبح لکھتے ہیں دیوار پر
میں نے فرمان کے حاشیے پر لکھا "مسترد"
اور ہر صبح اک اینٹ کہتی ہے گرتے ہوئے
جھوٹ اِس بار تک ٹھیک ہے

نظم

اب ایسے بھی کوئی دن آور جی لیں گے
منڈیروں پر جو سوتے ہیں اُنھیں کروٹ بدلنا کیا ضروری ہے
ہم ایسے بھی کوئی دن آور جی لیں گے
پرانی گٹھریوں کے بیچ اکڑوں بیٹھ کر
جب آخری تحریر لکھی جا رہی ہو
آخری لشکر گزر کر جا چکا ہو
آخری دن کی گواہی کے لیے اتنا ضروری ہو
ہم اپنی سخت جانی میں کوئی دن آور جی لیں گے
گھڑی اونچی جگہ آویزاں رکھو
پپوٹے بند کر دو ساری آنکھوں کے
کھلی آنکھیں گواہی کی ضمانت تو نہیں ہیں
ہم یہیں ہوں گے
یہ ممکن ہے کہ سب کچھ بس یونہی تا عمر رہ جائے
سو ہم بھی جیسے جتنا ہو سکے گا خود ہی جی لیں گے
ہمیں فرصت نہیں ہے خیر و شر کے درمیاں تفریق کرنے کی
ہم ایسے ہی کوئی دن آور جی لیں گے
منڈیروں پر جو سوتے ہیں انھیں کروٹ بدلنا کیا ضروری ہے

Scanned with CamScanner

نظم

آموختہ فساد کا مجنوں سنائے گا
اُس کو خبر ہے کوچۂ لیلیٰ میں کیا ہوا
پتھر کی چوٹ سر پہ زیادہ کہ پیٹھ پر
تکلیف دہ ہے پاس کا پتھر کہ دور کا
کتنا بلند ہاتھ ہو پتھر کے واسطے
اک ساتھ کتنے لوگ بڑھیں سنگ کے لیے
اس بات نے فساد اٹھایا ہجوم میں
اُس نے تو کچھ کہا بھی نہیں اور پڑ گیا
اس بات پر غبار اٹھایا ہجوم نے
اُس نے تو پاؤں بھی نہ اٹھائے زمین سے
اس بات نے کمال اٹھایا ہجوم میں
وہ مطمئن ہوے کہ سزا کام کر گئی
پھر دیر تک حساب رہا سنگ و دست کا
جو سنگ بچ گئے تھے وہ منہا کیے گئے
جو ہاتھ رہ گئے تھے علاحدہ کیے گئے
پھر دیر تک حساب رہا سنگ و دست کا
پھر اُس نے ایک آخری کروٹ زمیں پہ لی
پھر اُس نے دیر تک یہی دیکھا کہ دیکھنا
بے سود تو نہیں تھا کہ اس دیکھنے کے ساتھ
سب دیکھنے لگے کہ کہاں کس کی بات پر
کس بات نے قتال مچایا ہجوم میں
پھر وہ ہوا کہ جس کی خبر بس اُسی کو ہے
آموزگارِ شہر کو بس انتظار ہے
آموختہ فساد کا مجنوں سنائے گا

نظم

پہلے جی بھر کے دیکھ لینے دو
پھر کہانی بھی میں سناؤں گا
رات جنگل کی شاہزادی کو
ایک کمسن اداس چرواہا
اصطبل میں گھسیٹ لایا تھا
یہ کہانی بھی میں سناؤں گا
پہلے جی بھر کے دیکھ لینے دو
اس کی آنکھوں نے دن نہیں دیکھے
اس کو بارش اداس کرتی تھی
اس کو دلدل سے خوف آتا تھا
یہ اسی واپسی کا قصہ ہے
ورنہ جنگل میں کیا برائی تھی
ایک کٹیا تھی اک بچھونا تھا
اور جنگل کی شاہزادی کو
ایک کمسن اداس چرواہا
اصطبل میں گھسیٹ لایا تھا
یہ کہانی بھی میں سناؤں گا
پہلے چہرہ تو دیکھ لینے دو

**

Scanned with CamScanner

محمد انور خالد

کی نظموں کا پہلا مجموعہ

ریت آئینہ ہے

قیمت: ۱۲۰ روپے

عمارہ پبلیکیشنز
بی ۲۹، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

افضال احمد سید

کی نظموں کا مجموعہ

دو زبانوں میں سزائے موت

قیمت: ۵۰ روپے

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

افتخار جالب

زیست کا کوڑا ملبہ

اے خوشا بخت کہ امریکہ نے
آدابِ سفارت کی بحالی کا ارادہ باندھا
ویت نام ایک نئے دور میں داخل ہو گا
صنعت و حرفت و کلچر کی فراوانی میں
کوئی قلت ہے تو بس اتنی کہ
الفاظ کی ناداری ہے!
وہ زباں -- جس میں فرانسیسی جواں
حیا خو ہوچی منہ و ہوچی منہ و ہوچی گاتے
سارے عالم کے لیے قبلۂ امید بنے
منہ لگی شیریں دہن چھٹتی نہیں
اودھا کریہی کہہ بیٹھتی ہے: کیسی فراوانی؟
کہ حلقوم تو حلقوم ہے: پابندی میں پاگل ساجگاڑ
امریکی سلینگ ان کے لب و لہجہ و لیرِ نکس کی ہر بافت کو
گھتیں کرتا ہے
شیر بکری کے نئے گھاٹ دوارے، آرے
ورلڈ آڈر کے بہیمانہ طلسمات نے ڈیرے ڈارے
ہم تہی دست تو پہلے ہی سے تھے، دیکھیے، مشروم فشن
شیر و شکر ہوتی زبانوں کا بطن،

Scanned with CamScanner

غربت ولاچاری کا لنگوا کچرا
ٹاکسک ویسٹ میں تبدیل کیے دیتی ہے: تاحدِ نگہ زیست کا کوڑا ملبہ
۔۔ ہیروشیما کے دمِ عیسیٰ کا ہر لفظ نیا کن فیکوں:
پھول کھِلے، تازہ زباں
دیدہ کے فٹ پاتھوں پہ آجایئے، سرکار ادھر دیکھیے
یہ کون جواں، رقص میں گلنار ہی گلنار، ترڑ ڈز

**

Scanned with CamScanner

سعید الدین

نظم

یہ آنکھ میری طرف اُٹھ رہی ہے
یہ آواز مجھ سے مخاطب ہے
یہ لفظ میرے لیے لکھے گئے ہیں
یہ گولی میری طرف آ رہی ہے
یہ قبر میرے لیے کھودی جا رہی ہے

یہ روٹی میرے لیے نہیں پکائی جا رہی
یہ لڑکی میرا انتظار نہیں کر رہی
یہ دریا میرے پاس سے نہیں گزرا
یہ پھول میرے لیے نہیں کھِلا
یہ خط میرے نام نہیں آیا

جو آدمی یوں زندہ ہو
اُس کی ہلاکت کا ذمے دار کون ہے؟

Scanned with CamScanner

بُل ڈوزر

شہر کی ایک مصروف شاہ راہ کے کنارے
کھڑا کیا گیا ہے ایک بل ڈوزر
میونسپلٹی والے شاید سڑک کی توسیع کے لیے
اس سے کام لیں گے
لیکن یہ تیز دھوپ اور بارش کے دن ہیں
ایک کتیا اس دیوہیکل مشین کے خفیہ کونے میں
اپنی دوپہر گزارتی ہے
ایک بچہ اسکول سے واپسی پر
روز اسے حیرت سے دیکھتا ہے
پولیس پر پتھراو کرنے والے
آنسو گیس اور گولی سے بچنے کے لیے
اس کی آڑ لیتے ہیں
پھر بھی چار مارے جاتے ہیں

دیوہیکل مشین اب وہاں نہیں ہے
نہ اس کو تکنے والا بچہ ہے
نہ پولیس ہے
کتیا نے بھی کہیں اور پناہ لے لی ہے
سڑک کشادہ کر دی گئی ہے
اور ہموار بھی
چار آدمیوں کی ہڈیاں اور خون کی تہہ
تارکول کے نیچے ہے

Scanned with CamScanner

تفتیش

پہلے ہم ہنسے
پھر روئے
پھر کانپنے لگے
اب ہمارا وجود ٹرانسپیرنٹ ہے

بعض آبی کیڑوں کی طرح
ہماری نس نس
اعصابی ریشے
اور نازک عضلات
صاف دکھائی دیتے ہیں

ہم ہر چیز کو راہ دیتے ہیں
روشنی کو
اندھیرے کو
خوف اور نفرت کو
اس لیے بعض اوقات
کئی ہزار سرچ لائٹس،
ٹیلی لینسز
اور طاقت ور رادار کے استعمال کے باوجود
ہم غائب ہو جاتے ہیں
اب ہر چیز ہماری پناہ گاہ ہے
کبھی کبھی تو ہم
اپنے تلاش کرنے والوں کی آنکھوں میں چھپ جاتے ہیں
تب اُنھیں بہت جھنجھلاہٹ ہوتی ہے
اور ہمارے نام بگاڑ کر
ہماری تلاش از سرِ نو کی جاتی ہے
لیکن ہم پھر بھی نہیں ملتے

Scanned with CamScanner

کبھی کبھی ہم اپنے آپ کو
تازہ خون کی شکل میں
سامنے لے آتے ہیں
تفتیش کو
ایک نیا رُخ دینے کے لیے

خانہ جنگی

ساری خانہ جنگی کے دوران
اس نے اپنی بیوی کے ساتھ
کثرت سے مباشرت کی
کثرت مباشرت
یا بارود کی بُو سے
حمل ہر بار ساقط ہو جاتا
یہ دیکھ کر
اس کے منہ سے مہمل سے الفاظ نکلتے
جو اس کی بیوی
اور فسادزدہ شہر سے
یکساں مطابقت رکھتے تھے
انزال کے بعد وہ جھنجھلا جاتا
نہائے بغیر کپڑے تبدیل کرتا
شیو بنائے بغیر گھر سے باہر نکل جاتا
اس کے مارے جانے کے دن
اس کی بیوی حاملہ تھی
اور متصادم گروہ
سمجھوتے کی میز پر

Scanned with CamScanner

اُس کے پاؤں بہت خوب صورت ہیں

سبز قطعۂ زمین پر
ریت پر
اور بادلوں میں
اس کے پاؤں بہت خوب صورت ہیں

اگر وہ آگ میں چلنا شروع کر دے
تب بھی اس کے پاؤں خوب صورت ہوں گے
اگر سمندر میں اُتر جائے تب بھی
اور تب بھی
جب اس کے پاؤں قطع کر دیے جائیں
یا ان میں کیلیں ٹھونک دی جائیں

میری آنکھیں نکال لی جائیں
تب بھی میں چھُو کر
اس کے پاؤں شناخت کر لوں گا
وہ ایک بار اپنا پاؤں
میرے سینے پر رکھ کر گزری ہے

پاگل

ٹارچر کے بعد قتل کیے گئے شخص کے
ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے
یہ خبر بہت جلد
دوسری کئی افواہوں کے ساتھ
شہر میں پھیل گئی

Scanned with CamScanner

شہر کے پانچ پاگلوں کو بلوایا گیا
جو ایسے اجتماعی دل چسپی کے امور پر
عارضی طور پر سنجیدہ ہو جاتے ہیں
پانچوں نے مقتول کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی تصدیق کی
اور خوف اور حقارت سے ایک دوسرے کو دیکھا

مرنے والا کس گروہ سے تعلق رکھتا تھا
اس کی ٹھیک سے تصدیق نہیں ہو سکی
لیکن پانچوں پاگلوں کے خوف زدہ ہو جانے کے
فوری ردِ عمل سے صاف ظاہر تھا
مرنے والا ان میں سے نہیں تھا

Scanned with CamScanner

ثروت زہرا

ہٹ

یہ ساحلوں کی بھُر بھُری ریت پر
کھڑا ہوا ایک مکان تھا
جسے آپ نے ہر بار اپنا سفر سپرد کر کے
ایک سرائے بنا دیا ہے
یہ ایک ہٹ ہے
جو چند سکوں کے عوض
وقت کی پیمائشوں کے مطابق
آپ کو تسکین دے رہی ہے
جو ساحلوں کی پھاڑ دینے والی ہواؤں سے
لڑتے لڑتے بے رنگ ہو چکی ہے
کئی جگہ سے اس کی چھت اور دیوار کا
پلستر بھی اکھڑ چکا ہے
اور اس کے دالان کے چند ایک چھپّر تو
زمین کی طرف کو، شرم سے نگاہیں نیچی کر چکے ہیں
مگر ہوا
متواتر اسے گالیاں دے رہی ہے
اس کی دیوار پر، ہر آنے والے نے
اپنی یادگار ثبت کرنے کے لیے

دلوں کے درمیان اپنا نام کرید کر
اسے گھر بنانے کی کوششیں کی ہیں
مگر محبتوں کے اعتبار کی اس کرید میں
اس کی دیوار کب کی دفن ہو چکی ہے
اس کے باورچی خانے میں
آپ کی بچی ہوئی روٹیوں کے چھوٹے ٹکڑے
اور جھوٹے برتن لڑھک رہے ہیں
مگر اس کے چولہے کو آگ نہیں مل سکی ہے
یہاں کسی چیز کی کوئی مستقل جگہ نہیں ہے
لہذا مہمان خانے سے لے کر آرام گاہ تک
بلاتمیز، یہ آپ کے گیلے قدموں کی گزرگاہ بن چکی ہے
اور اس کے کواڑ
اجنبی دستکوں کو سہتے سہتے اتنا تھک چکے ہیں
کہ اب ان کے خوف سے
خود کو بند نہیں ہونے دے رہے ہیں
مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ جیسے
یہ سمندروں کے خوفناک شور میں
بہت مضطرب ہے، اور بہت دور
بھاگ جانا چاہتی ہے
مگر سمندر اور شہر کے درمیان کے
کسی وقت میں پھنس کر
ریت کی ہو چکی ہے

ورثہ

زندگی کو آئینوں سے محبت ورثے میں ملی ہے
اور آئینے میں اس کے محبوب کا عکس
منجمد کر دیا گیا ہے

Scanned with CamScanner

زندگی آئینے کے عکس کو دیکھ سکے گی
اور عکس کے منجمد زاویوں پر
اپنے ہونٹ رکھ سکے گی
مگر اپنے محبوب کی حرارتوں کو چھونے کے لیے
اسے آئینہ توڑنا پڑے گا
اور زندگی کو
آئینوں سے محبت ورثے میں ملی ہے

ہوائیں حاملہ ہیں

کہیں دو حرف ملنے کی صدا
اڑتی ہواؤں نے
چُرالی تھی
مگر اب ساتھ اُڑتی تتلیوں سے
اور پرندوں سے
نگاہیں وہ چراتی ہیں
بہاروں میں بھی اب وہ
کتنا ہولے ہولے چلتی ہیں
انھیں اب اپنی ہیئت اپنی حالت پر
بہت تشویش ہے کہ اب
ہوائیں حاملہ ہیں
مرے کانوں میں ان کے درد کی آواز
گونجیں دے رہی ہے
وہ میرے در پہ دستک دے رہی ہیں
انھیں میری ضرورت ہے مگر
خاموش ہوں میں
اور میرے شہر کے سارے مسیحاؤں نے بھی
چپ سادھ رکھی ہے

Scanned with CamScanner

مگر ہم سب اسی کی فکر میں ہیں
ہمیں اب خوف ہے کہ اس
انوکھی ایک زچگی سے
ہمارے شہر کا کیا کچھ لٹے گا
ہمارے شہر کو کیا کچھ ملے گا

صداؤں کا سمندر

میرے وجود میں اک
صداؤں کا سمندر ٹھہر گیا ہے
میری آنکھ کسی خواب کے
پیہم چٹخنے کی گونج دے رہی ہے
اور میں اپنی کوکھ سے
خاموشیوں کے ہمکنے کی آواز
سن رہی ہوں
اور میری انگلیوں کی پوروں سے
میرے حرف بہے جا رہے ہیں
میرے خون کی روانیاں
میرے جسم کی نالیوں میں سے
کسی بپھرتی ہوئی موج کی طرح
اپنے ساحل کو پکارتی ہیں
اور میری سانس
میرے اعضا کے بیچ سے یوں جا رہی ہے
جیسے ویران جھاڑیوں کے درمیان سے
گزرتی ہوئی ہوا
سوکھے زرد پتوں کے بجتے ہوئے ساز

پنے جسم کی بوسیدہ دیوار سے

کان لگائے ہوئے
ان صداؤں کو بغور سن رہی ہوں
اور شاید انھیں میں بہہ رہی ہوں

ڈرو نہیں

ڈرو نہیں
میں اپنی کوکھ کو سنبھالنا
خوب جانتی ہوں
مجھے پتا ہے کہ خوفِ رسوائی،
خاندان اور معاشرہ
حفظانِ صحت کے ایسے اصول ہیں
جن سے میری کوکھ جاگ نہیں سکے گی
ڈرو نہیں
میں نے اپنے شعور کا ڈی ڈی ٹی چھڑک کر
اپنی کوکھ کو پاک کر لیا ہے
ڈرو نہیں
میں نے اپنی کوکھ کو
اپنے جذبوں کی زنجیر سے باندھ کر
اسے قید کر لیا ہے
اور زنداں میں داخلے کی منتظر
روشنی کی ہر درار کو سی لیا ہے
اور اب بھی اگر کہیں
میرے وجود نے
کوکھ سے فرار ہونے کے لیے
کوئی سرنگ کھودی
تو میں اپنے جذبوں کی مٹی سے
ہر دہانے کو پاٹ دیا کروں گی

Scanned with CamScanner

ڈرو نہیں
میں اپنے قید خانے کی ہر صدا کو
چاند کے دو پہروں کے بعد
نچوڑ کر پھینک دیا کروں گی
اور اگر کبھی میرے خواب و خیال نے
تمہاری حد میں ہاتھ پیر نکالنے شروع کر دیے
تو ہم اپنے خوابوں کا
ابورشن کرالیں گے

**

Scanned with CamScanner

آصف فرّخی

شہر بدری

شور تھوڑی دیر کے لیے بھی نہیں رُکتا اور وہ ایک ایک کر کے جانے لگتے ہیں۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹتے ہیں اور وہاں سے چلے جاتے ہیں۔

کوئی الوداع نہیں کہتا۔ کوئی کچھ بھی نہیں کہتا۔

وہ بھی کچھ نہیں کہتے۔ ان کے جانے سے کتابیں زور زور سے بند کرنے، ڈیسک پٹخنے، پیر رگڑنے کی وہ آوازیں نہیں آتیں جو ہاف ٹائم کی گھنٹی بجتے ہی بھگدڑ سی مچا دیتی تھیں۔ نہیں، اس طرح کی کوئی بات نہیں۔ بے آواز اور بے زبان سے وہ ایک ایک کر کے کم ہونے لگے اور چہروں کی قطار میں خالی جگہ رہ گئی جہاں اس سے پہلے وہ تھے۔

ایک دم سے دیکھو تو پتا چلتا تھا: ارے، یہاں تو وہ ہوتا تھا --- وہ --- بھلا سا نام ہے اس کا؟ اور وہ، اور وہ --- ارے بھئی کہاں چلے گئے سب کے سب؟ ایک خلا سا رہ گیا اُن کی جگہ جو فوراً نظر بھی نہیں آتا۔

لیکن یہ سوال کوئی نہیں پوچھتا۔ یوں بھی شور بہت ہے۔ "باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں"، اسکول کا بینڈ زور و شور سے اس دُھن پر اپنی پریکٹس جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہ اسکول کا گیت نہیں ہے، تم کو شک ہو رہا ہے اور تمھارا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ بات بہت بگڑ گئی ہے۔ کاش یہ سب محض ایک خواب ہو۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ انگلی تمھاری طرف اشارہ کر رہی ہے۔ شرمندگی اور پشیمانی کے بوجھ تلے تم اس وقت دب بھی جاؤ گے تب بھی زمین نہیں پھٹے گی کہ تم اس میں سما جاؤ۔ امیگریشن والے کاؤنٹر پر دستاویزات جانچنے والے افسر کے درشت چہرے کے خدوخال مانوس نظر آنے لگتے ہیں اور تمھارے دیکھتے دیکھتے وہ مسز کننگھم کی بھاری آواز میں پکارنے لگتا ہے: ہری اَپ، کم آن، نیکسٹ! ہُو از

Scanned with CamScanner

نیکسٹ؟" تمھیں پتا ہے کہ نیکسٹ کون ہے: وہ تم ہو۔ اب بچ نہیں سکتے۔ اپنے آپ کو گھسیٹ کر سامنے لانے کی کوشش کرتے ہوئے جیسے تمھاری جان نکلی جا رہی ہے۔ تمھاری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا ہے۔ گردن کے پیچھے پھوٹ پڑنے والے ٹھنڈے پسینے سے سارا بدن شل ہوا جا رہا ہے۔۔۔

"ضمیر، ضمیر، کیا ہو گیا تمھیں؟" جھنجھوڑ کر جگا دینے والے یہ ہاتھ ثمینہ کے ہیں۔ چند لمحے لگتے ہیں یہ سمجھنے میں کہ تم گھر میں اپنے بستر پر لیٹے ہوئے ہو اور برسوں پہلے کے اسکول ڈیسک کو مضبوطی سے تھام کر مسز کنگھم کی ڈانٹ سننے سے ڈرنے کے اس لمحے میں نہیں جی رہے ہو جو مسلسل کئی دن سے تمھیں خواب میں دکھائی دے رہا ہے۔

وہ ہم سے مختلف ہیں، حساب کا گھنٹا نہ ہوتا تو شاید مجھے اس کا پتا بھی نہ چلتا۔ ورنہ جیسے اور سارے لڑکے ہوتے ہیں۔۔۔ بس یہ تھا کہ ان کی رنگت زیادہ پکی تھی اور دانت بہت چمکتے تھے جب وہ ہنستے تھے۔ مختلف تو سارے لڑکے تھے، شکلوں میں، اسکول کے بستوں اور آنے کے طریقوں اور امی ابوؤں میں فرق۔ مقصود چم چم کرتی جیپ سے اترتا تھا تو اس کا خاکی وردی والا ڈرائیور بیگ اور تھرماس لے کر کلاس روم تک آتا اور سلیوٹ مارتا تھا۔ ابرار بہت قاعدے سے کتابیں ہاتھ میں اٹھا کر ایمپریس مارکیٹ تک بس میں آتا اور بیگ کے بوجھ سے (ہمارے لیے) قابلِ رشک حد تک آزاد ہو کر مسکراتا ہوا، سیٹی بجاتا ہوا، گھومتا گھامتا اسکول آتا۔ احمد علی کے ابو کہیں باہر گئے ہوئے ہیں اور یاسین کے ابو اس دنیا میں نہیں ہیں۔ فرق تو بہت سارے تھے۔ گھنٹی بجتی اور لیسنز کا ٹائم ہو جاتا، مسز کنگھم آ کر ہم سے کتابیں نکالنے کے لیے کہتیں۔ رشید منھ پھیلا کر سبق کا نام لیتا تھا: "ایرامِتھک،" اور بوسکو بڑے اسٹائل سے یہ لفظ ادا کرتا: "وِتھ میٹک۔" ہم سیکھ رہے تھے کہ اس مضمون کا نام "میتھے میٹکس" اپنی کاپیوں پر لکھ لینا چاہیے کیوں کہ اب اس میں اِرتھ میٹک کے ساتھ ساتھ الجبرا اور جیومیٹری بھی شامل ہو گئے ہیں۔ ہم ایک کلاس اوپر جو آ گئے ہیں۔

یہ ایک کلاس اوپر بڑھنا بھی اچھی خاصی مصیبت تھی۔ اسکول کا کام جو اتنا بڑھ جاتا تھا۔ میں بے زار آ کر سوچتا: آگے چل کر کیا ہو گا؟ مشکل سے بڑھ کر مشکل یہ طرح طرح کے سوال جوڑنے، لوئسٹ کامن ڈینومینیٹر اور ہائیسٹ کامن فیکٹر اور یونٹری میتھڈ اور فریکشنز۔۔۔ لگتا تھا یہ حساب نہیں کچھ اور ہے۔ ایک ڈراونا خواب لگتا تھا یہ سب۔ میری سمجھ میں بھی پوری طرح نہیں آتا تھا۔ کلاس میں بیٹھا بیٹھا جانے کہاں کھویا رہتا اور جب مسز کنگھم ڈانٹ بتاتیں تو چونک کر اپنے آگے والے ڈیسک پر بیٹھے ہوئے عبدالباطن کی کاپی سے دیکھ کر نوٹ کرنے لگتا۔ ٹیچر کی نظر بچا کر عبدالباطن مجھے سمجھانے اور نوٹ کرانے لگتا تھا، لیکن وہ مجھ پہ ہنسنا نہیں بھولتا تھا۔ (وہ ہنستا تھا تو پکے رنگ کے چہرے پر دانت کھل اٹھتے تھے۔) پھر بھی وہ سب سے پہلے کلاس ورک ختم کر کے مسز کنگھم سے چیک کرانے جاتا تو اس کے صفحے پر اسٹار بناتے ہوئے وہ ساری کلاس سے فخریہ کہتی تھیں: "فار ہِم اِٹ اِز میتھے میٹِک!"

میجک نہیں تھا تو پھر کیا تھا؟ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ابو سے بھی پوچھا تھا میں نے۔ "یہ لوگ مچھلی کھاتے ہیں اس لیے ان کے دماغ تیز ہو جاتے ہیں،" وہ کہتے تھے۔ مچھلی اور میتھے میٹکس کا یہ تعلق میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مچھلی تو ہم بھی کبھی کبھار کھاتے تھے، بلکہ جاڑوں میں جب خشک ہوا سے کھال پھٹنے لگتی اور سوئٹر کے ساتھ مفلر اوڑھ کر اسکول جانا ضروری ہو جاتا تو امی ہمیں سنہری رنگ کی ایک گولی روز کھلاتی تھیں۔ "مچھلی کے تیل کی گولی ہے یہ،" وہ ہمیں بتایا کرتی تھیں۔ اس کی شیشی پر کھلے بادبان کی کشتی بنی ہوتی اور اس کے اوپر سنہری حروف میں لکھا ہوتا: سات سمندر۔ ہوتی ہو گی اس میں طاقت، مجھے اس گولی سے نفرت تھی۔ اس لیے کہ ایک دفعہ میں نے چبا لیا تھا اسے اور کتنی ہی دیر تک ایسی کڑواہٹ حلق میں کھٹکتی رہی کہ آج تک بھلا نہیں سکا وہ لیس دار کڑواہٹ۔ گولی منھ میں رکھ کر امی کے جانے کے بعد باتھ روم میں اُگل دیا کرتا تھا۔ یہ میرا راز تھا۔ اس کا اسکول سے، مسز کننگھم کے دیے ہوئے ہوم ورک سے یا مجھ سے آگے کے ڈیسک پر بیٹھنے والے عبدالباطن سے بھلا کیا تعلق ہو سکتا تھا، یہ سب میرے دماغ میں گڈمڈ ہو گیا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ مچھلی وہ بہت شوق سے کھاتا تھا، میں نے اس سے پوچھ لیا تھا۔ پھر ایک مرتبہ میں نے اسے مچھلی کھاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اسکول ڈے کے ساتھ اینول فیٹ تھی اور ہم سب اچھے اچھے کپڑے پہن کر آئے تھے تو ہیڈ ماسٹر کے آفس کے ساتھ والے ہال میں ڈائننگ ٹیبل پر لے جایا گیا تھا ہمیں۔ رنگین قمقموں میں اسکول بھی مختلف لگ رہا تھا اور میرے روز کے دیکھے ہوئے ساتھی بھی۔ میں سالن روٹی پلیٹ میں نکال کر شوق سے کھانے لگا کہ کسی نے ٹھوکا دے کر میرے کان میں کہا: "دیکھو، وہ دیکھو، بھات اور مچھی کھا رہا ہے بھوکا کہیں کا!" ڈائننگ ٹیبل پر ایک بڑی سی قاب میں فش فرائی بھی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ عبدالباطن نے میرے دیکھتے ہی دیکھتے مچھلی کا اتنا بڑا ٹکڑا رو کھا اٹھا کر منھ میں رکھ لیا، پھر بڑی صفائی سے اس کے کانٹے نکال نکال کر اپنی پلیٹ میں ایک طرف رکھنے لگا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ مسکرایا اور ہاتھ ہلا کر سلام کرنے لگا۔ میں نے جواب دیا۔ وہ پھر منھ سے کانٹے نکالنے لگا، اتنی ہی صفائی سے جیسے بوسکو انگلش بولتا تھا: "وتھ ہیٹک!" وہ کہتا تھا۔ میں اس کی طرح بولنے کی کوشش کرتا تو لگتا کہ نرم نرم جھاگ منھ میں بھر گیا ہے یا میں آئس کریم کھاتے ہوئے بول رہا ہوں جس کی ٹھنڈک سے بولنے کے دوران حلق میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔ میں اُس کی طرح بول نہیں سکتا۔ کیا اس کی طرح کھا سکتا ہوں؟ ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ میں بھی اس طرح مچھلی کھاؤں تو حساب اچھا ہو جائے گا اور میرے لیے بھی میتھے میٹکس میجک بن جائے گی۔ لیکن یہ خیال میں نے خود ہی ذہن سے جھٹک دیا۔ روٹی کا سوکھا نوالہ جیسے خود بخود حلق میں نہ اٹک جائے۔

فیٹ کے ختم ہونے کی گھنٹی بجی اور ہم کلاس اسمبلی میں قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ اس بار فرق اتنا تھا کہ گھنٹی بجنے پر ہمیں کلاس روم میں نہیں جانا تھا جہاں ایک اور مشکل لیسن ہمارا منتظر ہوتا، بلکہ انتظار کرنا تھا کہ پیرنٹ ٹیچر میٹنگ ختم ہو اور اپنے اپنے امی ابو کے ساتھ ہم گھروں کو جائیں۔ آج امی ابو مسز کننگھم کی باتیں سن رہے ہوں گے، مجھے خیال آیا اور میں ہنس پڑا۔ میرے آگے عبدالباطن کھڑا ہوا تھا،

Scanned with CamScanner

بالکل جس طرح کلاس میں ڈیسکوں کی ترتیب میں وہ پہلے آتا تھا۔ اس کی امی پہلے باہر آئیں۔ دور سے لگتا بھی تھا کہ وہ اسی کی امی ہوں گی۔۔ گہرا رنگ اور اُجلی مسکراہٹ۔ انھوں نے ساڑھی باندھی ہوئی تھی جس سے سَر سَر کی آواز آ رہی تھی جب وہ لڑکوں کی قطار کے درمیان چلتی ہوئی عبدالباطن کے پاس آئیں۔ وہ اس کے پاس کھڑی ہو کر اسے کچھ بتانے لگیں۔۔ شاید یہی کہ مسز کننگھم نے کلاس میں اس کے کام کی تعریف کی ہے۔ لیکن مجھے کچھ اَور ہی لگا۔ مجھے ایسا لگا۔۔۔ مجھے ایسا لگا کہ اتوار کی صبح ہے اور ہم بہن بھائی ناشتے کی میز پر بیٹھے انتظار کر رہے ہیں کہ امی باورچی خانے سے پراٹھے لے کر آئیں۔۔ گرم گرم، تڑتڑاتے ہوئے اور ہاتھ لگانے سے ٹوٹ جانے والے۔۔ اور اتنے میں ابو نے ریڈیو سیٹ لگا دیا ہے۔۔ وہی بڑا ریڈیو جس کی آواز سارے کمرے میں گونجتی تھی اور ایک عجیب موسیقی کو پھیلاتی جاتی تھی۔ "فردوسی رحمٰن بھٹیالی گا رہی ہیں،" ابو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہم کو بتاتے تھے۔ تیز میٹھی آواز دھوپ کی طرح چڑھتی تو ہم دُھن کا ساتھ دینے کے لیے یوں ہی اپنی طرف سے گول مول الفاظ ادا کرنے لگتے: آئیلا گو لے آئیلا گو لے، جیسے میری بیٹی گاتی ہے: موڑ توڑ ٹکے رانا، اور میں الفاظ درست کرنے لگتا ہوں تو کہتی ہے: یوں ہی ٹھیک ہے ابو، رہنے بھی دیں۔ (بہت پرانی بات ہو گئی لیکن وہ دُھن اب بھی میرے ذہن میں گونجتی ہے۔ اچھا ہوا اتوار کی چھٹی منسوخ ہو گئی، ورنہ ان خستہ پراٹھوں اور فردوسی رحمٰن کی بھٹیالی کے بغیر اتوار کی صبح کیسے آتی؟) وہ اتوار کی صبح نہیں تھی، بھٹیالی بھی نہیں تھی اور عبدالباطن کی امی فرّاٹے سے اسی طرح بول رہی تھیں: آئیلا گو لے آئیلا گو لے۔ کیا یہ بھی مچھلی کا کمال ہے؟ مجھے خود ہی اس بات پر ہنسی آ گئی تھی۔

وہ کون ہیں، یہ تو مجھے معلوم تھا۔ جس طرح کلاس کے سارے لڑکوں کو ایک دوسرے کا پتا تھا۔ لیکن اس سے فرق پڑے گا، اس کا اندازہ اُس دن سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ وہ دن یوں بھی مشکل تھا اور ویسے بھی مشکل دن آ گئے تھے۔ امی نے میرا ٹی وی دیکھنا کافی کم کروا دیا تھا۔۔ ٹی وی پر یوں بھی اَور طرح کے نغمے بجتے رہتے: "دیا جلائے رکھنا ہے، گھر کی خاطر سو دکھ جھیلیں، گھر تو آخر اپنا ہے،" اور جانے کیا کیا۔ لیکن دیا کیوں جلائے رکھیں، گھر میں کیا بجلی نہیں ہو گی؟ اور گھر میں کیا ہو گیا ہے جو سب کو بتانا پڑ رہا ہے کہ گھر تو اپنا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ پہلے سے زیادہ تنگ کر رہا تھا۔ ارتھمیٹک پہلے کیا کم تھا کہ الجبرا بھی اس ٹرم سے دماغ کو اَور اُلجھانے لگا۔ عبدالباطن کی کاپی اسی فراخ دلی سے کھلی رہتی لیکن وہ مجھے سمجھاتا بھی تھا۔

ایک دن تو اس نے مجھے اپنا راز بھی بتا دیا۔ میتھمیٹکس کا راز۔ وہ مجھے کلاس روم کے ایک کونے میں لے گیا اور سرگوشی سے تھوڑی بلند آواز میں کہنے لگا: "ایک گولڈن رُول ہے۔ اسے یاد کر لو، پھر زندگی بھر پرابلم نہیں ہو گی۔"

"وہ کیا ہے؟" میرا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔

"بوڈماس،" اس نے کہا۔

Scanned with CamScanner

"کیا؟" میں حیران رہ گیا۔

"ہاں بوڈماس۔ میرے ڈیڈی کہتے ہیں یہ یاد رکھ لو، پھر الجبرا کے سوال غلط نہیں ہوں گے۔ بریکٹ، آف، ڈویژن، ملٹی پلیکیشن، ایڈیشن، سبسٹریکشن۔ ان کو شارٹ کرلو۔ بوڈماس۔"

میں نے سر ہلا دیا جیسے مجھے کسی چھپے خزانے کی کلید مل گئی ہو۔ عبدالباطن کا شکریہ ادا کر کے اپنے ڈیسک پر واپس آیا کہ کاپی پر فوراً نوٹ کر لوں تو مقصود وہاں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر منہ بنالیا اور آواز دھیمی کرنے کی کوئی کوشش کیے بغیر کہا: "وہ غدّار ہے۔ اس سے دوستی ختم کر دو۔"

کچھ کچھ سمجھتے ہوئے بھی میں اَن جان بنتے ہوئے پوچھنے لگا: "کیا بات ہے؟ کس کو کہہ رہے ہو؟"

مقصود کوئی جواب دیے بغیر چلا گیا۔ میں نے عبدالباطن کی طرف دیکھا کہ اس نے سن تو نہیں لیا۔ وہ سر جھکائے اسی طرح کاپی پر سوال حل کر رہا تھا۔

کچھ ہونے والا ہے، میرا دل زور سے دھڑکا۔ میری سمجھ میں کچھ کچھ آ رہا تھا لیکن پوری طرح نہیں۔ دماغ ایسا اُلجھا کہ اگلے دن بوڈماس بھی کتنی دیر بعد یاد آیا۔ اس وقت تک کلاس ورک کا ٹائم ختم ہو رہا تھا۔ مسز کننگھم نے پھر مجھے ہاف ٹائم میں ڈِٹینشن دے دیا۔ باقی سارے لڑکے باہر جا چکے تھے، میں ڈیسک پر بیٹھا سوال میں مغز کھپا رہا تھا۔ سامنے والا ڈیسک خالی پڑا تھا۔ مسز کننگھم "مورننگ نیوز" سامنے بچھا کر "گیٹ اے ورڈ" کا کراس ورڈ حل کر رہی تھیں۔ اک بار گی کلاس روم کے سامنے شور سا سنائی دیا۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ کلاس کے بہت سارے لڑکے ایک جگہ جمع تھے۔ میں تیر کی طرح بھاگا اور وہاں پہنچ گیا۔

کلاس کے لڑکے دائرہ بنائے ہوئے تھے اور ان کے بیچوں بیچ جو کھڑا تھا وہ عبدالباطن تھا۔

"یہ غدّار ہے،" مقصود نے مجھے بتایا۔ "یہ دشمن ہے۔ میرے ابّو اور ان کے فرینڈز کہتے ہیں یہ سب لوگ ہیں ہی ایسے۔ یہ بلیک آؤٹ نہیں کرتے۔ یہ راتوں کو اپنے گھر کی چھت پر ٹارچ جلا کر دشمن کے جہازوں کو اشارے کرتے ہیں۔۔۔"

میں نے عبدالباطن کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ اور زیادہ گھرا لگ رہا تھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

"غدّار ہے غدّار۔۔۔!" لڑکے دُہرا رہے تھے۔

مقصود ایک لفظ کہتا اور باقی سب لڑکے اسے دُہراتے۔ "بنگالی بابو آیا،" وہ گیت سا بن گیا تھا۔ "بنگالی بابو آیا، مرغی چُرا کر لایا۔" اس گیت کی لَے پر سب تالیاں بجا رہے تھے۔ "مرغی نے مارا پنجہ، بنگالی بابو گنجا۔" اور گنجا کے لفظ کے ساتھ ہی زنّاٹے کے تھپڑ کی آواز جو اپنے ہاتھ اوپر کر لینے کے باوجود عبدالباطن اپنے سر پر پڑنے سے بچا نہیں سکتا تھا۔

"بنگالی بابو آیا۔۔۔ تم بھی کہو،" مقصود نے مجھے ٹھوکا دیا۔ پھر خود ہی رُک گیا۔ عبدالباطن کے چہرے سے زیادہ اس کی پتلون بھیگ رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

"شمیم شمیم گندا گندا شمیم شمیم،" مقصود زور زور سے دُہرا رہا تھا اور سب لڑکے تالیاں بجا رہے تھے۔ ہم حلقے میں گھوم رہے تھے اور عبدالباطن درمیان میں کھڑا تھا۔

"واٹ نان سنس---" مسز کننگھم کے ڈانٹنے کی آواز آئی تو ہم سب چونکے۔ "یو گدھاز! یو کتاز! یو اُلوز!" وہ اپنے مخصوص انداز میں ہم پر برس رہی تھیں لیکن اُن کے آنسو نکلے چلے آ رہے تھے، اور ان کا چہرہ عبدالباطن کی پتلون سے زیادہ گیلا لگ رہا تھا۔

اس دن کے بعد عبدالباطن اسکول نہیں آیا۔ بعد میں کسی سے سنا کہ وہ اپنے امی ابو کے ساتھ چلا گیا ہے کیوں کہ ان کا ملک الگ ہو گیا ہے۔

بو ڈماس مجھے اب بھی یاد ہے، حالاں کہ میری زندگی میں کوئی خاص کام نہیں آتا۔ لیکن ایک بات ایسی ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتی---

ڈیٹنشن کی سزا تو ساری کلاس کو ملی تھی اور مسز کننگھم نے فادر پنٹو سے شکایت کی تھی اور انھوں نے آ کر کتنی دیر ہم کو پیار سے سمجھایا تھا، ڈانٹا تھا، دھمکایا تھا، معافی بھی منگوائی تھی--- پھر تو پھر اب کیوں بیٹھے بٹھائے گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے--- جیسے میں اسی ڈیسک پر بیٹھا ہوں اور مسز کننگھم سزا دینے کے لیے آواز دیں گی: "نیکسٹ!"

کیا اب میری باری آ گئی ہے؟ میں اس ڈیسک پر بیٹھا ہوا ہوں اور ڈر کے مارے میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔

اور میں اس وقت تک سہتا رہوں گا جب تک میری باری نہ آ جائے۔

**

انور خاں

بسر ہو سکے تو بسر کیجیے

ناشتہ کر رہا تھا کہ پھر فون آیا۔ چونکہ والد صاحب نے اٹھایا۔ بنس روڈ سے رمیش بھائی کا فون تھا۔ رمیش بھائی سوشل ورکر ہیں اور بڑی تن دہی سے کام کرتے ہیں۔ اپنے علاقے کی بہبودی کا انہیں بڑا خیال رہتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ چند ماہ بعد اسمبلی انتخابات ہونے والے ہیں اس لیے ان دنوں وہ کچھ زیادہ ہی سرگرم ہیں۔ بہرحال، وجہ جو بھی ہو، کم از کم اپنے علاقے کے لوگوں کے کام تو آتے ہیں۔ ویسے بھی آج کل بے غرض کوئی کام نہیں کرتا۔ اور کرے بھی کیوں۔ اب ہماری سوچ بدل گئی ہے۔ اب تو ہم خود نہیں چاہتے کہ کوئی بے غرض ہمارا کام کرے۔ اس میں ہمیں سبکی محسوس ہوتی ہے۔ کام کرے اور اپنا پیسہ لے۔ وہ اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش۔ ہاں، رقم جیب پر زیادہ گراں نہ ہو۔ فسادات کے بعد یہ اُن کا چھٹا یا ساتواں فون تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم بنس روڈ پر اپنی ڈسپنسری پھر شروع کریں جو فسادات کے دوران بری طرح توڑ دی گئی تھی۔ لفنگے دروازے تک نکال کر لے گئے تھے۔

وہاں زیادہ تر لوگ غریب ہیں۔ جھونپڑیاں بہت ہیں، بلکہ بعض جگہ تو زمین میں گہرے گڑھے کھود کر ایک منزلہ جھونپڑیاں بنائی گئی ہیں۔ چلتے چلتے دفعتاً زمین کی سطح پر آنکھیں، چہرے رکھے ہوئے نظر آتے ہیں اور انسان ہڑبڑا جاتا ہے۔ برسات میں پانی بھر جاتا ہے۔ مچھروں کی تعداد انسانوں سے بڑھ جاتی ہے۔ غلاظت کے انبار ہر طرف جمع رہتے ہیں۔ ہفتے میں دو ایک بار صفائی والے آتے ہیں؛ نصف غلاظت اٹھاتے ہیں، باقی اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں۔ دو روز بعد پھر وہی انبار جمع ہو جاتا ہے۔ جابجا کسی اسلامی تنظیم نے "صفائی نصف ایمان ہے" کے پوسٹر لگا رکھے ہیں۔ مچھروں اور غلاظت کی وجہ سے لوگ آئے دن بیمار رہتے ہیں۔ میری ڈسپنسری وہاں خوب چلتی تھی۔ تانتا بندھا رہتا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اوروں سے کم پیسے لیتا تھا۔ مجھے پتا ہے یہ غریب لوگ زیادہ پیسے نہیں دے سکتے۔ والد صاحب نے مجھے ڈاکٹر اسی

Scanned with CamScanner

خیال سے بنایا ہے کہ میں خلقِ خدا کی خدمت کروں اور دنیا عقبیٰ دونوں سدھر جائیں۔ وہ خداترس انسان ہیں۔ پرہیز گار، نمازی۔ ہماری پشتینی کپڑوں کی دکان ہے، اس لیے مالی آسودگی ہے۔ ان کی وجہ سے ہمارے گھر کا ماحول بھی کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ ایسی بات والدہ نہیں جیسی اور گھروں میں آپ دیکھتے ہیں۔

والد صاحب ڈسپنسری دوبارہ شروع کرنے پر رضامند نہیں۔ پہلے ہی ہمارا پچاس ہزار کا فرنیچر تباہ ہو چکا ہے۔ وہ دوبارہ رسک نہیں لینا چاہتے۔ رئیش بھائی کے اصرار پر والد صاحب چونکا مجھے پکڑا دیتے ہیں۔ رئیش بھائی کا کہنا ہے کہ آس پاس کے ڈاکٹر ایک تو فیس دُگنی لیتے ہیں، دوسرے کئی دن تک دوا جاری رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا پیتھولوجکل لیبارٹریوں سے بھی کمیشن بندھا ہوا ہے۔ مریض کو آئے دن کسی نہ کسی ٹیسٹ میں اُلجھائے رکھتے ہیں، اور سیکڑوں روپے یوں ہی نکل جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے درمیان کام کرتے ہوئے اُنسیت سی ہو گئی تھی، اس لیے میں خود وہاں دوبارہ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک اندیشہ یہ بھی ہے کہ ایسے غنڈے جو سوشل ورک کے نام پر سفید پوش بنے ہوئے ہیں، شاید میری واپسی کو پسند نہ کریں۔ اطراف کے ڈاکٹروں سے وہ نذرانے وصولتے رہتے ہیں، اور ڈاکٹر برائے عافیت خاموشی سے ان کا منہ بھرتے رہتے ہیں بلکہ ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اپنی خوشی سے دے رہے ہیں۔ ان سوشل ورکروں کو دوادارو، میڈیکل ٹیسٹ سب فری ہوتے ہیں۔ اگر میں واپس گیا تو یہ سوشل ورکر ممکن ہے ان ڈاکٹروں کی خاطر پھر کوئی ٹنٹا کھڑا کر دیں۔ اس لیے رکا ہوا ہوں، ورنہ چلتی ہوئی پریکٹس سے کون منہ موڑ سکتا ہے۔ میں نے حسبِ سابق غور کرنے کا وعدہ کر کے فون منقطع کر دیا۔

ڈسپنسری کا وقت ہو رہا تھا۔ نیچے آیا تو پان کی دکان پر طاہر بھائی سے ملاقات ہو گئی۔ طاہر بھائی کسی دفتر میں کلرک ہیں اور شوقیہ ہومیوپیتھی کرتے ہیں۔ مذہبی خیالات رکھتے ہیں۔

"آج آپ دفتر نہیں گئے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، آج چھٹی ہے۔"

"تو آیئے ڈسپنسری چلیں،" میں نے کہا۔ "کچھ گپ شپ رہے گی۔"

"آپ کی یہ نئی ڈسپنسری معلوم ہوتا ہے ابھی جمی نہیں،" طاہر بھائی مسکرائے۔

"ہاں یار، ایسا سمجھو اجڑی گرہستی پھر سے بسا رہا ہوں۔"

طاہر بھائی بہ خوشی ساتھ ہو لیے۔ انھیں علاج معالجے کی باتوں میں بڑا لطف آتا ہے اور چاہتے ہیں کہ ڈاکٹروں سے زیادہ سے زیادہ تبادلۂ خیال کریں۔

"پلیگ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" سگنل پر گاڑی رکی تو یوں ہی گفتگو کی خاطر میں نے پوچھا۔

"پلیگ ایک وبائی بیماری ہے۔ جب افراد فطرت کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو بیمار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کا کوئی گروہ جب زیادتیوں میں حد سے گزر جاتا ہے تو وبائی بیماریاں پھیلتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

"یہ تو مذہبی نقطۂ نظر ہوا،" میں نے کہا۔

"یہی تو ہمیں ایلوپیتھی سے اختلاف ہے،" طاہر بھائی نے کہا۔ "آپ لوگ صرف علامات کو دبا دیتے ہیں، بیماریوں کو دفع نہیں کرتے۔ اس لیے ایک شکایت دور ہوتی ہے تو دوسری شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔"

"اور ہومیوپیتھی میں کیا ہوتا ہے؟" ہری روشنی دیکھ کر میں نے گاڑی بڑھائی۔

"ہومیوپیتھی روح کا علاج کرتی ہے،" طاہر بھائی نے کہا۔ "جب روح میں ڈسٹربنس پیدا ہوتا ہے تو جسم پر بھی اس کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ ہم اس ڈسٹربنس کا پتا چلانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کی مناسبت سے دوا دیتے ہیں۔ اسی لیے بے حد معمولی مقدار میں ہونے کے باوجود دوا اثر کرتی ہے، اور بعض اوقات ایک یا دو خوراکوں سے ہی مرض اچھا ہوجاتا ہے اور پلٹ کر نہیں آتا۔"

شاہراہ سے گلی میں گاڑی موڑتے ہوے میں نے دیکھا کہ وہاں خاصی بھیڑ ہے اور دس پندرہ جوان ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے کھڑے ہیں۔

"کیا پھر لفڑا ہو گیا،" طاہر بھائی نے تشویش سے کہا۔

گاڑی گلی میں موڑنے کے بجاے میں شاہراہ پر آگے بڑھ گیا اور پھر اگلے موڑ سے گاڑی گھماتے ہوے نسبتاً طویل راستے سے ڈسپنسری پہنچا۔ وہاں جھگڑے کے کوئی آثار نہ تھے۔ ہر چیز حسبِ معمول تھی۔ ڈسپنسری کھلی تھی اور کمپاونڈر اخبار دیکھ رہا تھا۔

"کچھ گڑبڑ ہے کیا؟" طاہر بھائی نے اس سے پوچھا۔

"نہیں تو۔ آپ ایسا کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ابھی ہم آرہے تھے تو اپنی گلی کے سرے پر دس پندرہ آدمی لاٹھیاں لیے کھڑے تھے۔"

"وہ!" کمپاونڈر ہنس پڑا۔ "وہ چوہے مار رہے ہیں!"

"چوہے مار رہے ہیں؟" مجھے بھی حیرت ہوئی۔

"ہاں ساب، وہ سُورت میں پلیگ پھیلا ہے نا۔ یہاں نہ پھیل جائے اس لیے۔"

"اوہ!" ہم ہنس پڑے۔ تناو اور الجھن سے نجات ملی جس نے پریشان کر دیا تھا۔

مجھے انکل مُوش کا خیال آیا۔ انکل موش انتہائی لاغر، کچھ فلسفی قسم کے عمر رسیدہ چوہے ہیں جنھوں نے برسوں سے ہماری کتابوں میں ڈیرا جما رکھا ہے۔ کبھی کئی کئی دن نظر نہیں آتے، پھر اچانک کچن ٹیبل پر، کھڑکی میں، کپ بورڈ کے نیچے ٹہلتے ہوے یا کسی گوشے میں مراقبہ کرتے ہوے دکھائی دے جاتے ہیں۔ شروع میں ہم نے ان کے پری نروان کی بہت کوشش کی؛ طرح طرح کے پنجرے استعمال کیے، دوائیں چھڑکیں، ڈنڈے، جوتے، چپل آزمائے۔ بہت ہوا تو یہ کہ دوچار روز کے لیے کہیں غائب ہو گئے۔ ہم ذرا غافل ہوے کہ پھر سینے پر مونگ دلنے کو موجود۔ کئی بار ایسا ہوا کہ رات کو آنکھ کھلی۔ رات کے سناٹے میں کتاب کترنے کی آواز سن کر ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی دل کتر رہا ہو۔ گھبرا کر اٹھے۔ بتی جلائی۔

Scanned with CamScanner

کپ بورڈ تھپ تھپایا۔ ڈنڈے بجائے۔ دو چار منٹ خاموشی رہی۔ ادھر ہم بتی بجھا کر لیٹے اور کتاب کترنے کی آواز پھر شروع ہو گئی۔ کئی بار نیند ہی اُچٹ گئی۔ بستر پر لیٹے لیٹے سوچتے رہے، پتا نہیں کون سی کتاب کتر رہا ہے۔ انکل مُوش سے لڑائی مہینوں چلی۔ وہ اتنے ہوشیار اور سخت جان ثابت ہوئے کہ ہمیں ہی ہتھیار رکھنے پڑے۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوا کہ انکل پرانے صوفیا کی طرح انتہائی قلیل غذا پر گزارا کرتے ہیں، اور وہ قلیل غذا ہماری کتابیں ہیں، کیوں کہ انکل اس قدر نحیف و نزار ہیں کہ تیزی سے دوڑ نہیں پاتے۔ کئی بار چاہا کہ خوب کس کر جوتا رسید کروں کہ وہیں ڈھیر ہو جائیں۔ لیکن ہمارا نشانہ اس قدر اٹل ٹپ کہ انکل موش نے اس سے زیادہ کبھی نہیں کیا کہ تاسف بھری نگاہ ڈال کر میز کے پیچھے روپوش ہو جائیں۔ بیوی بچوں کو ان سے کد نہیں، کہ وہ انکل موش سے زیادہ ہماری کتابوں کے دشمن ہیں، اور خوش ہیں کہ انکل کو کتابوں سے اس قدر عشق ہے۔ بیگم کو اس بات کی بڑی شکایت ہے کہ ہمارا سارا وقت تو باہر گزرتا ہے۔ جو تھوڑا بہت وقت گھر پر میسر آتا ہے وہ ان ماٹی ملی کتابوں میں سر کھپانے میں چلا جاتا ہے۔ چڑانے کے لیے ہماری بیوی صبا نے اس نابکار چوہے کا نام انکل موش رکھ دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دشمن پرانا ہو تو اس سے ایک گونہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارا اور انکل موش کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ ہم دونوں جیسے ایک دوسرے کے خیالات جان لیتے ہیں، بلکہ ہمارے درمیان ایک خاموش سی مفاہمت ہو گئی ہے۔ ہم نے انکل کو ختم کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے اور خود کو اس بات سے تسلی دے لیتے ہیں کہ بہر حال دنیا دار الفنا ہے، انکل کو بھی ایک نہ ایک دن جانا ہے۔ ادھر انکل موش بھی انھیں کتابوں پر دانت لگاتے ہیں جنھیں ہم مدت ہوئی فراموش کر چکے ہیں اور محض اس لیے رکھ چھوڑی ہیں کہ شاید کبھی ان کی ضرورت پڑے۔ جیسے ایک دن کسی کتاب کو تلاش کرتے ہوئے ہم نے مچان پر رکھے ٹیبل کی دراز کھولی تو دیکھا یوسف القرضاوی کی کتاب "اسلام میں حلال و حرام" کے اردو ترجمے کے قریب تیس چالیس صفحات صفاچٹ ہیں اور باقی صفحات پر دندان کتھا لکھی ہوئی ہے۔ چینی نظموں کے انگریزی ترجموں کا ایک عمدہ، خوب صورت انتخاب ہاتھ آیا تھا۔ سوچا تھا کسی مناسب موقعے پر تحفہ دینے کے لیے موزوں ہے۔ لیکن انکل موش نے اس کے گرد پوش اور جلد کی سلائی کی اس صفائی سے دندان کاری کی کہ کتاب پوری خراب نہیں ہوئی لیکن بطورِ تحفہ دینے لائق بھی نہیں رہی۔ شاید انکل پسند نہیں کرتے کہ ہم مفت ہاتھ آئی کتاب کسی کو تحفے میں دیں۔

"یہ بات تو اچھی ہے کہ انسانوں کو چوہوں کی طرح مارنے کے بجائے چوہوں کو چوہوں کی طرح مارا جا رہا ہے،" میں نے طاہر بھائی سے کہا۔

"بہرے سانپوں کو مارنے سے یہ یقیناً بہتر ہے،" طاہر بھائی نے جواب دیا۔ "چوہے کئی ہزار ملین ٹن اناج کھا جاتے ہیں۔"

"یہ مہم اپوزیشن والوں نے چلائی ہوتی تو آج اقتدار کی دیوی ان پر مہربان ہوتی،" کمپاؤنڈر نے کہا۔

"ہاں، یہ تو ہے،" میں نے تائید کی۔

Scanned with CamScanner

چائے منگوائی گئی۔ اس دوران دو مریض آ گئے۔ طاہر بھائی چائے پی کر نکل لیے اور ہم مریضوں کے ساتھ مصروف ہوے۔ انھیں نمٹا کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک نوجوان تیزی سے اندر آیا اور ایک کاغذ پکڑا کر اسی تیزی سے واپس چلا گیا۔ چھوٹا سا ہینڈ بل تھا: "طاعون اور اسلام"۔

"بمبئی نگر کی ہر ڈگر میں ایک خبر ہے۔ گھر گھر میں ایک ڈر ہے۔ کسی نے دوا پر، کسی نے تعویذ پر بھروسا کیا اور دعاؤں کو دروازوں پر چسپاں کر لیا تاکہ طاعون سے بچ جائے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ یہ عمل میرے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے یا نہیں۔ شرک و بدعت تو نہیں کہ عیاذاً باللہ جہنم تک لے جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تو یہ ہے کہ موت مومن کے لیے تحفہ ہے۔ مومن کا طاعون میں مرنا شہادت ہے۔

"غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا کسی صحابی سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ان لوگوں میں سے کسی نے یا اللہ کے رسول نے ہدایت کی ہو کہ کسی تعویذ یا دعا کا دروازے پر چسپاں کرنا یا قرآن خوانی یا آیت کریمہ کی مجلس لگانا، جو بدعات ہیں، بجائے اللہ کو خوش کرنے کے ناراض کرتی ہیں۔ بدعت کے بارے میں فرمانِ رسول ہے کہ جس نے دین کے اندر کوئی نئی بات ایجاد کی وہ مردود ہے (بخاری و مسلم)۔ اللہ تعالیٰ بدعتی شخص کا نہ روزہ قبول کرتا ہے نہ نماز نہ حج نہ عمرہ نہ کوئی نفلی عبادات۔ بدعتی شخص تو اسلام کے اندر سے ایسا نکل جاتا ہے جس طرح گوندھتے ہوے آٹے سے بال نکل جاتا ہے۔ (ابن ماجہ)

"طاعون سے آپ نے پناہ نہیں مانگی، اس کا یہ مطلب نہیں کہ موت کے منھ میں کود نے کو کہا ہو۔ اسلام حکمت اور فطرتِ سلیمہ والا مذہب ہے۔ طاعون سے نہ بھاگنے میں دو حکمتیں ہیں۔ (۱) موت برحق ہے۔ آپ کہیں بھی رہو، اپنے وقت پر آ کر رہے گی۔ مسلمانوں کو کسی بھی حال میں گھبرانا نہیں چاہیے۔ (۲) گھبرانے اور ڈرنے سے جسم کی بیماری سے لڑنے کی قوت ختم ہو جاتی ہے اور بے فکری جسم کو قوی رکھتی ہے۔ لیکن آج رسول کے امتی اس شہادت کی موت سے بھاگتے ہیں۔ ہائے افسوس نبی سے عشق کا دعویٰ رکھنے والو! اللہ سے ملاقات سے گھبراتے ہو؟ آخر میں یہ ضرور جان لیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب بھی کوئی آفت آتی فوراً نماز کی طرف متوجہ ہوتے اور یہی تعلیم ہمارے لیے بھی ہے۔ یہی ہماری نجات کا سبب ہے اور جنت کی کنجی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو دینِ حق پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر ثابت رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

"فرمانِ رسول پہنچادو میری طرف سے اگر آیت ہی ہو (بخاری)

"حسین الحق۔ فون ۳۱۸۲۰۸۹"

پڑھنے کے بعد ندامت ہوئی کہ خوف ایک بشری تقاضا ہے، اور اسی تقاضے کی بنا پر ہماری بیگم نے طاعون اور وبائی امراض سے بچنے کی دعا جو گھر گھر تقسیم ہو رہی تھی، دروازے پر چسپاں کر دی تھی۔ اور انھیں ہماری خاموش تائید حاصل تھی کہ ایسے موقعوں پر کون چانس لیتا ہے۔

دو چار روز انکل موش نظر نہیں آئے۔ بچی نے یاد دلایا تو تشویش لاحق ہوئی۔ بیگم نے کہا:
"خدا نخواستہ ۔۔۔"

"یہ کیا اپ شگون ہے!" ہم نے فوراً ٹوکا۔ "انکل موش امر ہیں۔"

آخر ش کئی روز بعد دیدار ہوئے۔

دیکھا انھیں جو آج تو جی سن سے ہو گیا

سمجھے تھے ہم کہ ہو کے جدا خیریت سے ہیں

سانس بھی مشکل سے لے پا رہے تھے۔ شاید گٹروں میں اور فٹ پاتھوں پر کثرت سے چھڑکی گئی دوا کا اثر تھا۔ دو روز سے خود ہمیں جینا دو بھر ہو رہا تھا۔ بیچارے انکل موش بہ مشکل کھلی ہوا میں آئے تھے۔ آنکھوں سے ٹپکتی بے کسی نے کلیجا چیر کر رکھ دیا۔ لیکن ہم کیا کر سکتے تھے۔ سیکڑوں میل دور چند جنگلی چوہوں کی ڈھائی آفت نے تمام چوہوں کی جانیں خطرے میں ڈال دی تھیں، ورنہ ہم انسان جس قدر چاؤ سے چوہوں کی پرورش کرتے ہیں انسانوں کی بھی نہیں کرتے۔ دیر تک وہ کھلی ہوا میں لمبی لمبی سانسیں لیتے رہے۔ پھر ڈگمگاتے لڑکھڑاتے میز کے پیچھے روپوش ہو گئے۔

اُس رات انکل موش میرے خواب میں آئے۔ بہت ناراض تھے اور پریشان۔

"اس سے تو اچھا تھا کہ میں تمہارے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کر لیتا۔" ان کے لہجے میں تلخی تھی۔

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے، لیکن میں کیا کر سکتا ہوں انکل موش۔"

"تم انسان انتہائی خبیث ہو،" انھوں نے کہا۔ "غلاظت خود پھیلاتے ہو، سزا چوہوں کو دیتے ہو۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں،" میں نے کہا، "لیکن انکل، ہماری حالت تو چوہوں سے بھی بدتر ہے۔ آپ پہلی بار زد میں آئے ہیں؛ ہماری جان تو سدا آفت میں رہتی ہے۔"

"لیکن یہ لوگ تو چوہوں کی پوری نسل کو ختم کرنے پر تلے ہیں،" انکل موش نے فکرمند لہجے میں کہا۔

"اس کی آپ فکر نہ کریں،" میں نے تسلی دی۔ "یہ صفائی دس پندرہ روز سے زیادہ نہ رہے گی۔ آپ نے تو ہمارے معاشرے کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔" مجھے اپنی عمرانیات کی کتاب یاد آئی انکل موش جس کا ایک ایک ورق چاٹ گئے تھے۔

"یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔" ان کے چہرے پر رونق آئی، جیسے بجھتا ہوا دیا بھڑک اٹھتا ہے۔ "واقعی تم لوگ اس قدر سڑ چکے ہو۔ تمہارے آس پاس پھیلی غلاظت کبھی کم نہ ہو گی بلکہ بڑھتی جائے گی۔ یہ ہر طرف پھیلا تعفن تمہارے اندرون ہی کا تو ہے جو اتنا سڑ چکا ہے کہ پلیگ کی شکل میں چاٹ رہا ہے۔"

مجھے غصہ آ گیا۔

"کیا آپ یہی بتانے کے لیے آئے ہیں؟" میں نے زچ ہو کر کہا۔

Scanned with CamScanner

"ٹھیک ہے، اب میں جاتا ہوں،" انکل موش نے کہا۔ "اب ہماری ملاقات خوابوں میں ہو گی۔"
اگلی صبح ناشتہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا، انکل موش کھڑکی کی منڈیر پر پڑے الٹی سیدھی سانسیں لے رہے ہیں۔ مجھے ان پر رحم آیا۔ ان کی مشکل آسان کرنے کے خیال سے میں نے ایک لکڑی اٹھائی اور ان کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے مایوس نگاہوں سے دیکھتے رہے، لیکن بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ہلکی سی ضرب لگائی۔ وہ بغیر چوں کیے وہیں ڈھیر ہو گئے۔ چمٹے سے ان کے نحیف بدن کو اٹھا کر گٹر میں پھینکنے ہی والا تھا کہ اخباروں میں چھپی ہدایت یاد آئی۔ تھوڑا سا گھاسلیٹ چھڑک کر ماچس کی تیلی دکھا دی۔

پھر جو دیکھا کچھ نہ تھا جز شعلۂ پر پیچ و تاب

رات دو بجے اچانک آنکھ کھلی۔ ایسا لگا جیسے انکل موش رو رہے ہوں۔ میرے دل کو کوئی مسل رہا تھا۔ میں کروٹیں بدلنے لگا۔ پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ صبا اٹھ بیٹھی۔
"آپ رو رہے ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔
میں رو رہا ہوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔
میرا تکیہ گیلا تھا۔
"شاید آپ کوئی خواب دیکھ رہے تھے،" صبا نے کہا۔
میں تکیہ پلٹ کر پھر لیٹ گیا۔ لیکن نیند آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ اگلے روز میں نے رمیش بھائی کو فون کیا۔ انھیں اطلاع دی کہ میں ڈسپنسری کھول رہا ہوں۔ وہ کسی مناسب کاریگر کو بھیجیں جو ایک بار پھر ڈسپنسری ٹھیک ٹھاک کر دے۔ دروازے بھی نئے لگانے ہوں گے۔
رمیش بھائی بہت خوش ہوئے۔ فوراً کسی بااثر شخصیت سے ڈسپنسری کا افتتاح کرانے کا پروگرام بنانے لگے۔ دو منٹ بعد میں نے طاہر بھائی کو فون کیا۔ میں نے انھیں اطلاع دی کہ میں اپنی بنس روڈ والی ڈسپنسری شروع کر رہا ہوں، لیکن صرف صبح کے اوقات میں۔ وہ چاہیں تو شام کے اوقات میں وہاں اپنی ہومیو پیتھی کی پریکٹس کر سکتے ہیں۔ وہ خوش ہوئے اور اس تجویز پر غور کرنے کے لیے چند روز کی مہلت چاہی۔
ایک ہفتے بعد پرکاش کا فون آیا جو اس تنظیم کی جسے فسادات میں استعمال کیا گیا، علاقائی شاخ کا سربراہ ہے۔ اس نے یقین دلایا کہ میں بے خوف و خطر ڈسپنسری شروع کر دوں، وہ حفاظت کی گارنٹی لیتا ہے۔
"مسٹیک ہو گیا ڈاکٹر ساب،" اس نے کہا۔ "اپن کو بعد میں سب لوگ بولا آپ بہوت اچھا آدمی۔ غریب لوگ کا مدد کرتا ہے۔ پھکر مت کرنا۔ میں اپنا آدمی بھیجتا ہے۔ وہ آپ کا ڈسپنسری فسٹ کلاس بنا دے گا، ایک دم چکاچک۔ پہلے سے بھی ایک دم اچھا۔ سارا کھرچا اپن کرے گا۔ اس کے بعد اپن کھود اس کا اُدگھاٹن (افتتاح) کرے گا۔ یہ سالا پولیٹکس بہوت گندا چیج ہے۔ سب دھندے کا بات ہے نئیں تو اپن بھید بھاؤ کرنے والا آدمی نئیں۔ میرے پاس بہوت مسلمان ہے۔ اپن سب کا کھیال رکھتا ہے۔ کیا۔ میں

کھود اُدگھاٹن کے واسطے آئے گا۔ ہندو مسلم یونٹی ہے کہ نہیں۔"
میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے فون رکھ دیا۔

٭٭

Scanned with CamScanner

نکہت حسن

جاگنگ پارک

"چالیس منٹ برِسک واک اور کنٹرولڈ ڈائٹ،" ڈاکٹر آنند حرے جو اپنی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور زبیدہ کی الٹرا ساؤنڈ اور بلڈ رپورٹ کو بڑی دیر سے دیکھ رہے تھے، بولے۔

زبیدہ ان کے سامنے ٹین کے ایک تکلیف دہ اسٹول پر بڑی بے آرام سی بیٹھی ہوئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آخر یہ ڈاکٹر حضرات مریضوں کے بیٹھنے کے لیے اس قدر تکلیف دہ اسٹول کیوں استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی شاید ان کی پالیسی میں شامل ہے، تاکہ مریض جب اس اسٹول سے اٹھے تو اپنے امراض میں مزید ایک مرض کا اضافہ کر کے اٹھے: خونی بواسیر۔

برِسک واک اور ڈائٹ کا مشورہ دینے کے بعد انھوں نے رپورٹس زبیدہ کی طرف بڑھائیں اور پھر بولے:

"سب ٹھیک ہے۔ معمولی سے لِپڈس بڑھے ہوئے ہیں۔ یورک ایسڈ بھی ٹھیک ہے۔ پیشاب کی رپورٹ بھی درست ہے۔ ہیموگلوبن بھی تیرہ ہے، یعنی بہت بہتر۔ کلسٹرول بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ فی الحال تو وہ بھی ٹھیک ہے۔ البتہ آپ کا وزن زیادہ ہے۔ اس کو برِسک واک اور ڈائٹ سے ہی کنٹرول کیجیے۔ یہی آپ کا علاج اور یہی دوا۔"

"اور وہ دم گھٹنا!" زبیدہ ہکلائی اور پھر بولی:

"ڈاکٹر صاحب، میرا گلا بالکل بند ہو جاتا ہے۔ زبان کٹنے لگتی ہے۔ ناک میں سرسرٖ، گلے میں خرخر۔ اِنسومنیا۔ تھوڑا کھا کر بھی بھاری پن کا احساس۔ پھر یہ سب کیا ہے؟"

"وہم! جس کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں،" ڈاکٹر صاحب نے بے پروائی سے کہا۔

"میں تو اپنے گھر میں سارا دن چلتی ہوں۔ گھر کا سب کام خود ہی کرتی ہوں،" وہ پھر بولی۔

Scanned with CamScanner

"کام آپ بے شک نہ کریں۔ گھر میں سارا دن بیٹھی بھی رہیں۔ لیکن دن کے کسی بھی وقت باہر نکل کر چالیس منٹ کی برسک واک آپ کا واحد علاج ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے گھنٹی بجا کر دوسرے مریض کو طلب کیا۔

زبیدہ غصّے سے پیر پٹختی ہوئی ڈاکٹر کے کمرے سے نکلی۔ وہ خود ہی خود بول رہی تھی: "ایک ہزار روپے رپورٹس پر خرچ ہوئے، چار سو روپے فیس کے لے لیے، اور علاج کیا بتایا، برسک واک!"

اس شہر میں رہنے والی گھریلو عورتوں کو باہر نکل کر برسک واک کا مشورہ دے رہے ہیں! بالکل ہی سٹھیا گئے ہیں۔ سڑک پر دہشت گردی اور ڈاکوؤں کے گروہ۔ گلیوں اور محلّوں میں کلاشنکوف تھامے ہوئے رینجرز۔ کانوں کے پردے اُڑا دینے والی گولیوں کی آوازیں۔ انسانی لاشوں کے خون سے لت پت سڑکیں۔ اور پھر اس ریگستان میں کون سے پارک اور باغ ہیں جہاں جا کر کوئی شریف عورت برسک واک کرے؟ یہ بھی کوئی اپنا خیر آباد ہے جہاں میلوں پھیلا ہوا لالہ مَنّی مل کا ہرا بھرا باغ تھا جہاں جوہی اور مولسری ایک ساتھ کِھلتے تھے، جہاں فضاؤں میں گھاس اور تازہ پھولوں کی مہک تھی، جہاں چڑیوں اور پرندوں کی چہکاریں تھیں---

یہ پیاری پیاری چڑیاں پھرتی ہیں جو چہکتی
قدرت نے تیری ان کو تسبیح خواں بنایا

اور جہاں لالہ کی پرنانی یا سگڑنانی، جن کو چڑیوں اور پرندوں کے ساتھ رہتے رہتے ایک عرصہ ہو گیا تھا اور جو ان چڑیوں اور پرندوں کی زبان بھی سمجھنے لگی تھیں، مولسری کے درخت کے نیچے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہتی تھیں---

سلیماں سر بہ زانو اور سبا ویراں

وہاں چالیس منٹ تو کیا، انسان سارا دن چل سکتا تھا۔ "کہتے ہیں آپ کو وہم ہے، اور وہم کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں۔ ہُنہ!"

حکیم کے لفظ پر زبیدہ کو تن کلاوا لے حکیم قدوس کا خیال آیا جو اونچا سنتے تھے اور ان کی بینائی بھی جاتی رہی تھی، پر زبیدہ کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہی انھوں نے جو بات کہی تھی اس نے زبیدہ کے سارے نسوانی، ذہنی اور جسمانی امراض پر جیسے پھایا سا رکھ دیا تھا۔

"بیٹی، پیٹ اُم الامراض ہے۔ بس اس کا خیال رکھو تو جسم کا سارا کارخانہ ٹھیک چلتا رہے گا۔"

ان کے مطب میں اکثر و بیشتر مریضوں کو نسخہ بھی خود ہی لکھنا پڑتا تھا اور مطب کے پچھلے حصے میں جا کر دوا کی پڑیاں بھی خود ہی بنانی ہوتی تھیں۔

جوارشِ جالینوس، ہڑ بہیڑہ، گاؤزبان اور شربت بیضوری۔ خمیرہ ابریشم جواہر والا کی ڈبیا نسخے میں شامل نہ ہونے کی صورت میں بھی زبیدہ اپنی دواؤں میں ضرور شامل کرتی تھی، کھانے کے بعد دونوں وقت کے میٹھے کے لیے۔ حکیم صاحب بچارے ایکاایکی مر گئے۔ ورنہ زبیدہ کو کیا پڑی تھی کہ وہ ان سر پھرے ڈاکٹر

صاحب کے پاس آتی جو اس کے سارے امراض کو پسِ پشت ڈال کر برسک واک کا مشورہ دے رہے ہیں۔ برسک واک نہ ہوئی آبِ حیات ہو گئی کہ برسوں کے پیچیدہ امراض جن کو ایک عرصے سے مرغن کھانے پکا پکا کر اور کھا کھا کر گھر کی چہار دیواری میں بیٹھ کر اس نے پالا تھا، ختم ہو جائیں گے۔ اور چلو واک بھی کر لو، مگر کہاں؟

"پڑوسیوں کے سامنے دھماد حم کودوں؟"

مشکل تو یہ تھی کہ وہ ایک بنیاد پرست معاشرے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کے نزدیک مذہب اور بنیاد پرستی ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔

وہ اپنے سنیاسی باوا بھی تو ہیں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن! فیڈرل بی ایریا، ناظم آباد اور نارتھ ناظم آباد کی دیواروں پر لکھا ہوا سنیاسی باوا کا نام اور ان کی کرامات ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگیں۔

"آپ مایوس نہ ہوں۔ مردانہ کمزوریوں کا شرطیہ علاج۔ شربت اکسیر۔ عورتوں کے لیے پردے کا خاص انتظام۔ ہمارا شربت جوبن بہار آپ کی لٹی ہوئی بہاریں واپس لا سکتا ہے۔"

ان ہنگاموں کے دنوں میں فیڈرل بی ایریا جانا اور سنیاسی باوا کو ڈھونڈنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ وہ ہونقوں کی طرح منہ کھولے شہر کو ٹٹولنے لگی۔ شاید کوئی باغ نظر آ جائے، کوئی پارک، کوئی چھوٹا موٹا میدان ہی سہی، جہاں وہ سب کی نظروں سے چھپ کر تیز تیز چل سکے۔

بوڑھا صحافی اردو بشر کہہ رہا ہے:

"یہ پورا شہر ایک پارک کے مافق تھا، صاف ستھرا۔ ان سالا لوگ نے پورے شہر کا بیڑا غرق کر دیا۔ ام بولا بابا باڈرم میں جا کر تھوکو۔ یوزمی والے ڈبے کو استعمال تو کرو۔ پر وہ تو ادھر ادھر روڈ پر تھوک مارتا ہے۔ باپ رے باپ، اتنا بڑا بڑا خون کے مافق تھوک۔ وہ اپنا نسروانجی جب میئر لگا تھا، روڈ شیشے کے مافق چمکتا تھا۔ ہر طرف پارک ہی پارک تھا۔ اب پتا ہی نہیں چلتا روڈ کدھر ہے، پارک کدھر ہے۔ سالا لوگ پورا شہر بیچ کر کھا گئے۔ ام بولتا ہے بچوں کے لیے پارک بناؤ، وہ بولتا ہے ام پلازا بنائے گا۔ لونڈیا کا کاروبار کرتا ہے پلازا بنا بنا کر۔"

کلفٹن برج سے اتر کر تین تلواروں والے چوراہے سے گزر کر آغا سپر مارکیٹ والے چوراہے پر جب وہ سیدھے ہاتھ کی طرف خیابانِ رومی پر مڑی تو بوٹنگ بیسن اور بلاول ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے بائیں ہاتھ کی طرف اس کو بالآخر ایک پارک نظر آ ہی گیا: جاگنگ پارک۔

اس نے گاڑی کو اسی سڑک پر موڑا۔ دور سے بھٹے والے کے ٹھیلے پر جلتی آگ کی لپٹیں لال لال زبانیں نکال کر اس کو اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ بھنے ہوئے بھٹوں کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ٹھیلے کے گرد بچے اور بڑے گھیرا ڈالے کھڑے تھے، اپنی باری کے انتظار میں۔ پارک کے باہر حدِ نظر تک چھوٹی بڑی گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں جن میں پجارو اور لینڈ کروزر بھی شامل تھیں، سیاسی لیڈران کی،

Scanned with CamScanner

جن کے دونوں طرف کلاشنکوف لیے ہوئے باڈی گارڈ یا کمانڈوز، اور جن کے متعلق اب مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے بیت الخلاؤں میں بھی دو کموڈ رکھوائے ہیں، ایک اپنے لیے اور ایک اپنے کمانڈو کے لیے۔ دو کمانڈو باہر پجارو اور لینڈ کروزر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ مکمل حفاظت، ایک مرگ ناگہانی سے بالکل محفوظ!

شاید یہ لطیفہ ہو، مگر جاگنگ پارک ہے کہ باہر جو حفاظتی انتظامات نظر آئے ان کو دیکھ کر شبہے کی گنجائش نہیں رہی۔ زبیدہ نے گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے جاگنگ پارک کا ایک سرسری سا جائزہ لیا۔

مئی کا اوائل۔ فضا میں تازہ گھاس اور پھولوں کی مہک تھی۔ زمین کے اندر سے نئی کونپلیں سر اٹھا رہی تھیں۔ درختوں کے پتے جھڑنے کے بعد ہلکے ہرے پتے نکلنے شروع ہو گئے تھے جو بتدریج سبز کاہی رنگ میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ ہر طرف ہلکا ہرا، گہرا ہرا اور سبز کاہی رنگ پھیلا ہوا تھا۔ وسیع اور کشادہ لان ہری بھری گھاس سے بھرے ہوئے تھے۔ ڈھا کا ٹیرس۔ میدان میں لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں پر برقی روشنی کے تیز بلب روشن تھے۔ ہیڈمالی کے گھر سے جو پارک کے ایک کونے میں ٹین کی چھت ڈال کر بنایا گیا تھا، شاید کوری مٹی کی ہنڈیا میں دودھ اُبل رہا تھا اور اس کی مہک بیرونی ممالک سے لائے ہوئے کلون، پرفیومز اور سینٹ کی ہوش رُبا خوشبوؤں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی فضا کو مسحور کر رہی تھی۔

چہل قدمی کرنے والے کچے اور پکے راستے (ٹریک) عورتوں مردوں اور بچوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک خلقت تھی جو دوڑ میں مصروف تھی۔ ہر طبقے، ہر عمر اور ہر قد کاٹھی کی مخلوق۔ مریض، صحت مند، جوان، بوڑھے، بچے، مرد، عورت، خوبرو، بدشکل، مفلوج معذور وہیل چیئرز پر، سائیکل سوار، تاجر، صنعت کار، وزیر، مشیر، سیاست داں، صحافی اور دانشور۔ جنریشن گیپ کا لیبل لگائے نوجوان نسل۔۔ بے نتھے بجار۔۔ اور ان کو کن انکھیوں سے دیکھنے والی بزرگ نسل، جو ان کو دیکھ بھی رہے تھے اور محظوظ بھی ہو رہے تھے۔ محظوظ ہونا ان کی مجبوری تھی۔

زبیدہ نے جاگنگ پارک کا ایک چکر لگایا اور باہر نکل آئی۔ اب اس نے اپنی گاڑی کو ڈیلاوالی سڑک پر موڑا جہاں چوراہے کے بائیں طرف باسکن آئس کریم، باٹا اور سروس شوز کی دکانیں برابر برابر تھیں اور اس وقت بچوں اور بڑوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ اسکول کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں اور بچے "پہلے باٹا پھر اسکول" والے جنگل پر عمل پیرا تھے اور بیک وقت آئس کریم، جوتے اور جرابیں خرید رہے تھے۔

زبیدہ اس بھیڑ کو چیرتی ہوئی باٹا کی دکان میں گھس گئی اور مختلف جوتوں کو اپنے پیروں میں ڈال ڈال کر دیکھنے لگی۔ کوئی چھنگلی دبا رہا تھا تو کوئی تلوا۔ کسی کا سول پتلا تھا تو کسی کی ٹو گھوڑے کی شکل سے ملتی تھی۔ کوئی پنجے پر سے تنگ تھا تو کوئی ایڑی میں کھب رہا تھا۔ "جوتا خریدنا بھی اچھی خاصی مشقت ہے،" اور جوتا بھی وہ جس سے مسلسل چالیس منٹ تیز تیز چلنا تھا، اس لیے زبیدہ کچھ زیادہ ہی محتاط ہو کر جوتے پہن اور اتار رہی تھی۔ باٹا سے نکل کر وہ سروس میں جا گھسی۔ وہاں بھی وہی حال، وہی جوتے، جرابیں، وہی آئس کریم کے گلاس اور وہی بچوں کی بھیڑ۔ اس نے دو چار چھوٹے بڑے سروں کو پھلانگتے ہوئے شیلف پر سے ایک نیلے رنگ کا کینوس کا جوتا اٹھایا جس کا ایک پیر ایک بچے کے آئس کریم کے پیالے میں جا گرا۔ بچہ

"ایڈیٹ" کہہ کر غرایا۔ آج کا بچہ، کل کا سیاست داں۔ زبیدہ نے جوتا پیر میں ڈالا۔ آئس کریم سے لت پت جوتا اس کے پیر میں پورا فٹ بیٹھا تھا۔ کاؤنٹر پر پیسوں کی ادائیگی کے بعد اس نے اپنے پرس کے اندر جھانکا۔ الٹراساؤنڈ، بلڈ رپورٹ، ڈاکٹر کی فیس اور واکنگ شوز۔۔ پورے سترہ سو روپے خرچ کرنے کے بعد اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور گاڑی میں بیٹھے ہی بیٹھے ڈائٹنگ اور برسک واک کا ارادہ کر ڈالا، جو بقول ڈاکٹر آنند حرے اس کا علاج تھا اور اب تو مجبوری بھی تھی۔ گھر کے بجٹ میں سے سترہ سو روپے کا خسارہ کسی نہ کسی طور تو پورا کرنا تھا۔

دوسرے دن غروبِ آفتاب کے بعد جوتے موزے پہن کر اس نے جاگنگ پارک کا رُخ کیا۔

پارسی صحافی اردیشر اور اس کی سیکرٹری ایمنہ اپنے مداحوں کے جلو میں تیز تیز چل رہے تھے۔ اردیشر، کراچی کا بوڑھا صنعت کار صحافی، جو ماہرِ ماحولیات بنا ہوا تھا اور شہر کو خوب صورت بنانے کی کوشش میں حکومت اور بلند عمارات بنانے والے ٹھیکے داروں سے برسرِپیکار تھا، کہہ رہا تھا:

"کراچی میں تو پہلے ہی جنگلات نہیں تھے۔ اب ان لالچی لوگوں نے شمالی علاقوں کے بھی جنگل ختم کر دیے۔ یہ لوگ جنگلوں کو فصل کی طرح استعمال نہیں کرتے بلکہ معدنی کانوں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ سالا لوگوں نے کراچی کو کھنڈر بنا دیا ہے۔ زمینیں بیچ کر کھا گئے۔ بچوں کے کھیلنے کے میدانوں اور پارکوں پر اونچی اونچی اور گندی بلڈنگیں بنا دیں۔ اب اس پارک پر بھی دانت لگائے بیٹھے ہیں گدھ کی اولاد۔ ایسی تیسی کر ڈالی پورے شہر کی۔ سن پینتالیس کا یہ شہر بیرونی ملکوں کے سیاحوں کا ایک خوب صورت خواب تھا۔ آج ان گدھوں کی خوراک بن چکا ہے۔"

زبیدہ کے آگے ایک تیز طرار لڑکی ٹائٹ جینز اور کولھوں سے اوپر والا بلاؤز پہنے اپنے بھاری بھر کم کولھوں کو دائیں بائیں جلاتی ہوئی تیز تیز چل رہی تھی۔ اس کی چال میں ایسی کشش تھی کہ لمحہ بھر کو زبیدہ اس کی شکل دیکھنے کے لیے بے چین ہو گئی۔ اسے پہچاننے میں اس کو ذرا دیر نہیں لگی۔ وہ ماموں مبارک علی کی پندرہ سالہ پوتی حرا تھی۔ ماموں مبارک علی نے زندگی بھر عورتوں کی بے باکی اور بے پردگی پر دھواں دھار تقریریں کی تھیں، اور گزشتہ ربع صدی میں خاندان بھر کی نوجوان لڑکیوں کے لیے ہوّا بنے رہے تھے۔ لڑکیوں کے نقاب سے عاری کھلے منھ دیکھ کر ان پر تھوک دیا کرتے تھے۔ ان ماموں مبارک علی کی پوتی نیلی جینز اور سُرخ بلاؤز میں اپنے نسوانی اُبھاروں کا مظاہرہ کرتی ہوئی مرد تو مرد، عورتوں کو بھی دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔

دور میدان میں کرکٹ کی دنیا کے مشہور کھلاڑی کی نئی سانولی، ٹیلنٹڈ اور دولت مند بیوی لکڑی کی ایک کِرم خوردہ بنچ پر اُو بھی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ اس کو اس ہرے بھرے لان میں بچھی اس کِرم خوردہ بنچ کی تُک سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ غالباً اُن آرائشی کرسیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی جن کو وہ خود ڈزائن کرتی تھی اور بیرونی ممالک میں بھیجتی تھی۔ اس کا بھاری بھر کم شوہر، جو کبھی اپنے چوکوں چھکوں، مردانہ وجاہت اور کسرتی بدن کے لیے ہزاروں دلوں کی دھڑکن تھا، جاگنگ پارک کے کچے راستے پر کسی

Scanned with CamScanner

بھاری بھر کم ہاتھی کی طرح ہانپ ہانپ کر دوڑ رہا تھا۔
زبیدہ نے لان میں بیٹھی ہوئی اس کی نئی نویلی بیوی کو ایک بار پھر دیکھا، اور تب اس کو ایک اور عورت کا خیال آیا جو عورت بھی تھی، بیوی بھی تھی اور دو معصوم بچوں کی ماں بھی تھی۔ وہ بھی شاید کسی کرم خوردہ بنچ پر بیٹھی اب حالات سے سمجھوتا کر چکی ہو گی۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔
لان کے ایک گوشے میں پورا دستر خوان بچھا تھا۔ کوئی میمن خاندان بھیل پوری اور چھولے کی چاٹ، گول گپوں کا ٹوکرا اور پان مسالے کے ڈبے سجائے پکنک منانے میں مشغول تھا۔ بچے، جو کھیل کھیل میں زیادہ کھا گئے تھے، سبز لان پر بیٹھے ہوئے دودھ جیسی اُلٹیاں کرنے میں مصروف تھے۔ بھیل پوری، دہی پکوڑے اور پان مسالے کا ملاجلا ملغوبہ پورے لان میں بکھرا ہوا تھا۔ مالی اس پورے خوش باش خاندان کو گھور رہا تھا جو اس کی نظروں سے بے خبر ملکی مسائل پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔
خوشبو کا تیز بھپکا زبیدہ کی ناک میں گھستا چلا گیا۔ دونوں عورتیں لمبے لمبے چغے پہنے ہوئے تھیں۔ گلے میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیریں چلتے میں گرجا کی گھنٹیوں کی طرح بجتی تھیں۔ یسوع مسیح کی یہ بھیڑیں سیاہ لباس میں سر سے پیر تک ڈھکی ہوئی تھیں۔ جسمانی اعضا کی نمائش کی اس دوڑ میں بی بی مریم اور ماریا قبطیہ کہیں سے بھٹک کر آ گئی تھیں۔
دور ساسی والوں کے بنائے ہوئے جدید وضع کے مکان میں آرام کرسی پر دراز ماموں مبارک علی اپنی پندرہ سالہ پوتی حِرا کا انتظار کر رہے تھے جو جاگنگ پارک میں تیز تیز چلتے ہوئے بار بار رک جاتی تھی، اپنے روغنیات اور چربی چڑھے جسم کا جائزہ لینے کے لیے۔ ایک چکر میں جسم کے کتنے حرارے پگھلتے ہیں، اس کا اندازہ اُسے تھا۔ وہ ایک مدت سے جسم کے ان حراروں کو پگھلانے کے لیے جاگنگ پارک میں تیز تیز چل رہی تھی۔ ادھر ماموں مبارک علی اس سے اور اس جیسی ساری بھاری کولھوں اور کھلے چہروں والی لڑکیوں سے خوش تھے جو اپنے نسوانی اعضا کو متناسب رکھنے کے لیے صبح شام جاگنگ پارک جا کر برسک واک کرتی تھیں۔
ہفتہ بھر کی برسک واک سے ہی زبیدہ کو بہت فائدہ ہوا تھا۔ نہ صرف یہ کہ جسم پر چڑھی ہوئی چربی کم ہونا شروع ہو گئی تھی، بلکہ ذہن پر بھی جو ٹھوس برف کی تہہ جمی ہوئی تھی وہ بھی آہستہ آہستہ پگھلتی جا رہی تھی۔ وہ جو اب تک کنوئیں کا مینڈک بنی اپنے ہی اندر ڈبکیاں کھاتی رہی تھی، ایک ہی چھلانگ میں باہر نکلی تو دنیا ہی اور تھی۔ بقول شخصے، ایسا معلوم ہوتا تھا "جیسے پاکستانی خواتین آج کل بہت دباؤ میں تھیں، اس لیے کہ ان کے وہ اعضا جن کو وہ نمائش کے لیے استعمال کرتی تھیں، یعنی چھاتیاں، کولھے اور پنڈلیاں، وہ روغنیات یا کسی اور وجہ سے فربہی کی طرف مائل تھے اور ان کو قابو میں رکھنے کے لیے خواتین کو پریشان کن حد تک ڈائٹنگ اور واک کرنی پڑ رہی تھی۔"
جاگنگ پارک کے پکے راستے پر چھکی ہوئی جوانیوں سے نکلتی جِنّی زاتیں۔ جلد از جلد وزن کم کرنے کی کوشش میں بے تکان دوڑ رہی تھیں۔ ان کی یہ کوشش مردوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی سعیِ لاحاصل

تھی۔ پھیلے ہوئے دائیں بائیں ہلتے ہوئے کولھے، ڈھلکی ہوئی بھاری چھاتیوں پر جرزی کے منڈھے ہوئے بلاوز، پنڈلیوں پر ڈھلتی ہوئی عمر کے نشان ان کی تنگ مُہریوں والی جینز میں سے صاف نظر آرہے تھے۔ وہ سب اپنا وزن جلد سے جلد کم کرنے کی لاحاصل کوشش میں لگی ہوئی تھیں۔ مرد، جو بیک وقت دانشور، سیاست داں، صحافی اور کھلاڑی سب ہی تھے، اوّل و آخر مرد تھے۔ ان میں بیشتر کو خود نمائی اور نمائش کا جو موقع ملتا تھا اُس کو وہ گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ خود نمائی کو مبالغہ آمیز حد تک لے گئے تھے۔ اپنی بھاری بھرکم رانوں کی نمائش کے لیے کَسی ہوئی نیکریں پہن رکھی تھیں۔ بازو کی مچھلیوں کو گولائی میں مروڑتے ہوئے وہ نوجوان لڑکیوں کے سامنے سے ایسے گزرتے تھے جیسے جہاں سے گزر رہے ہوں۔ کھلے گریبان اور بنیانوں میں سے نظر آتے سیاہ بالوں کے گچھوں کی نمائش، تنگ نیکروں کے اندر سے دکھائی دیتا ہوا پیڑوؤں کا اُبھار، اور پھر نوجوان عورتوں کو آتا ہوا دیکھ کر جنسی کج روی سے مغلوب ہو کر اپنے اعضا کی نمائشی مالش میں مصروف ہو جانا، یہ سب اُن کی برسک واک میں شامل تھا۔

ان ہی میں سے کوئی مسٹر کراچی بن کر کھڑا ہو جاتا اور اپنے آگے اور پیچھے کے دھڑ کو عجیب و غریب انداز میں ہلاتا ہوا گزر جاتا۔ زبیدہ حیران آنکھوں سے، اور تیز تیز چلتے ہوئے یہ سب کچھ دیکھتی۔ دیکھنا اس کی مجبوری تھی۔ اس کو چالیس منٹ کی برسک واک جو کرنا تھی۔

بہت سی نوجوان لڑکیاں ایک ساتھ اور ایک ہی سمت میں چل رہی تھیں۔ دروازے میں سے ایک آدمی، عمران خان سے ملتا جلتا، پارک میں داخل ہوا۔ چلتی ہوئی لڑکیوں کے قدم ایک ساتھ رک گئے۔ لڑکیوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بازو کو مچھلیوں کو دکھانے والے نوجوان نے پیڑو کو سہلانا شروع کر دیا، اپنے پیٹ کو دبایا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر مینڈک کی طرح اُچھلنے لگا۔ لڑکیوں نے اس کی حرکتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی واک جاری رکھی۔ وہ جس قدر تیزی سے چل رہی تھیں اُسی قدر تیزی سے بول رہی تھیں۔

"کل شام کی پارٹی میں دہی پھلکیاں--- واٹ اے ونڈرفل آئٹم! بٹ پیسٹریز ورناٹ گڈ۔"

"بیکرز ٹچ سے منگائی تھیں۔ لیلیٰ کنجوس کی بچی کلِف کوُل سے اٹھا لائی۔"

"کلِف کوُل کا بس پیزا اچھا ہوتا ہے،" حِرا نے کہا اور اپنے بھاری کولھوں پر ہاتھ رکھ کر اُن حراروں کا اندازہ لگایا جو وائٹل سائنز کو دیکھ اور سُن کر اور پیزا کھا کر ایک دم بڑھ گئے تھے۔ اس نے چلتے ہوئے اپنے بھاری جسم کو زور زور سے جھٹکے دیے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے بلاوز کے سامنے کے بٹن کھل گئے۔ اس کی گداز چھاتیوں پر لیس کا مرم جس کے درمیان میں ایک خوب صورت بو بھی لگی ہوئی تھی، لڑکیوں کو حیران کر گیا۔

"کہاں سے خریدا ہے؟" ایک ساتھ بہت سی آوازیں بلند ہوئیں، اور حِرا چلتے چلتے اپنے بٹن بند کرنے لگی۔

سامنے والے دروازے کے سامنے سرسبز لان پر ایک جماعت ابھی ابھی آکر بیٹھی تھی جس میں کچھ ناکام سیاست داں تھے جو کرتے پجامے میں ملبوس تھے۔ چند اونچی شلواریں پہنے اور کندھوں پر رومال

ڈالے تبلیغی جماعت کے لوگ، جن میں نوجوان بھی تھے اور ادھیڑ عمر کے امیرِ جماعت بھی۔ سندھی، میمن، پنجابی، پٹھان -- یہ ایک ملی جلی جماعت تھی جن کے اپنے اپنے موضوع تھے۔ ایک سیاست داں جو حلیے اور چہرے مہرے سے ناکام لگتے تھے، لیاقت علی خاں کا موازنہ موجودہ سیاست دانوں سے کر رہے تھے۔

"سیاست داں بس ایک ہی تھے، وہ اپنے لیاقت علی خاں۔ بھری اسمبلی میں نہرو کو دھوتی پرشاد کہہ دیا۔ ہے نا ہمت کی بات؟" ایک زور کا قہقہہ پڑا اور دوسرے صاحب بولے:

"وہ عمران خان جو پریشر گروپ بنا رہا ہے وہ کیا چیز ہے؟"

"چیز کا تو ہمیں بھی پتا نہیں۔ ایدھی نے بھانڈا تو پھوڑ دیا۔ زور ذرا کم ہو گیا ہے اس پریشر لگر کا۔"

"آپ ستار بھائی کو کچھ نہیں بولیںگا۔ وہ بچارا تو آپ لوگوں کی لاشیں اٹھا اٹھا کر دفنا رہا۔ نہ کرے تو بنیں گی نا گدھوں کی خوراک!"

"گدھ اب مُردار نہیں کھاتے،" دور پیڑ کے نیچے کھڑا بوڑھا صحافی اردیشر بولا۔

"وہ تو اچھا اچھا ہَپ کرنے میں لگے ہیں،" لیاقت علی کے حمایتی بولے۔

"تضیعِ اوقات سے فائدہ؟ آپ لوگ خواہ مخواہ دوسروں میں کیڑے نکال رہے ہیں۔ حضرات، اپنا محاسبہ کیجیے پہلے،" ایک صاحب بولے جو شاید تبلیغی جماعت کے امیر تھے۔ انھوں نے لان میں چلتی ہوئی لڑکیوں کے جسمانی نشیب و فراز سے بہ مشکل تمام اپنی نظروں کو بچاتے ہوئے خطیبانہ انداز میں کہا:

"جب کسی قوم یا بستی پر عذاب آ جائے تو صرف وہ لوگ بچا لیے جاتے ہیں جو آخری وقت تک برائی سے روکنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔"

"اس شہر میں تو کوئی ایسا فرد نظر نہیں آتا،" دوسرے صاحب بولے۔

"اس قدر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسلام میں مایوسی یوں بھی کفر ہے،" امیرِ جماعت بولے۔

"کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کے لیے آخری حد مقرر کر دی جاتی ہے۔ اگر وہ اسے بھی پار کر جائیں تو ان پر فوراً عذاب وارد ہو جاتا ہے۔"

"اب کون سی حد باقی رہ گئی؟ ہم ساری حدیں تو پھلانگ چکے ہیں۔" ایک نوجوان، جو تبلیغی جماعت ہی سے تعلق رکھتا تھا مگر اس نے شلوار کی جگہ جینز پہن رکھی تھی اور داڑھی بھی فرانسیسی طرز کی تھی، جوش اور جذبے میں سب سے آگے تھا۔

"صبر، صاحب زادے، صبر۔ صبر کی بھی اسلام میں بڑی فضیلت ہے۔ سورہ النسا میں اللہ نے فرمایا ہے: اللہ تمھیں عذاب دے کر کیا کرے گا، اگر تم صبر کرو اور اس کا شکر کرو، اس پر ایمان لاؤ، اور اللہ قدر شناس ہے۔ تمھیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس میں اچھے اور برے

Scanned with CamScanner

سب کے لیے حدود مقرر ہیں۔ سورہ ھود میں صاف صاف وضاحت کی گئی ہے: جب کسی قوم پر عذاب آیا، پیغمبر اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے لوگوں کو عذاب سے بچا لیا گیا۔ حضرت نوح اور ان کے ساتھی غرق ہونے سے بچ گئے، مگر چوں کہ ان کا بیٹا کافر تھا، وہ غرق ہو گیا۔ حضرت لوط اور ان کا کنبہ بچا لیا گیا، مگر ان کی بیوی نہ بچ سکی کیوں کہ وہ بستی کے لوگوں کو جو بُرا کام کرتے تھے، دل سے بُرا نہیں سمجھتی تھی۔"

یہ سن کر وہ نوجوان کچھ اور زیادہ بے چین ہو گیا۔ وہ اپنے راشی باپ کی لینڈ کروزر میں بیٹھ کر آیا تھا جو باہر کھڑی تھی۔ اس میں دو گارڈ کلاشنکوف سنبھالے بیٹھے تھے اس کی حفاظت کے لیے، کیوں کہ اس کو جماعت کے ساتھ رائے ونڈ جانا تھا۔

"میرا حشر بھی حضرت لوط کی بیوی جیسا ہو گا۔ میں دل سے۔۔۔" وہ آدھا جملہ کہہ کر رک گیا اور اس گروہ میں سے اٹھ کر دور لان میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ شاید وہ نروان حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک ماہ بعد زبیدہ پھر ڈاکٹر آندھرے کے مطب میں اسی ٹین کے اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر آندھرے کے سامنے اس کی نئی رپورٹیں کھلی ہوئی رکھی تھیں۔ وہ بار بار اپنے چشمے کو صاف کرتے، اپنی گول گول آنکھوں کو شیشے کے اندر ہی اندر گھماتے، پھر زبیدہ کو دیکھتے۔ ایک ماہ پہلے والی زبیدہ اور آج کی زبیدہ میں نمایاں فرق تھا۔ نہ جسم پر چربی چڑھی ہوئی تھی، نہ چہرے پر گھبراہٹ، نہ ذہن پر بوجھ اور نہ تھکاوٹ کا احساس۔ وہ ہلکا پھلکا جسم اور ہر فکر سے آزاد ذہن لیے ڈاکٹر کے سامنے اسی ٹین کے بے آرام اسٹول پر بڑے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر آندھرے خوش بھی تھے اور فکر مند بھی۔ وہ بار بار اپنے چشمے کے شیشے صاف کرتے اور نظریں کبھی زبیدہ پر اور کبھی اس کی بلڈ رپورٹ پر گاڑ دیتے۔ وزن کم ہونے کے باوجود اس کی بلڈ رپورٹ صحیح تصویر پیش نہیں کر رہی تھی۔ لپڈس، کلسٹرول، یورک ایسڈ، ہر چیز پہلے کے مقابلے میں بہت بڑھی ہوئی تھی۔

"ایسا کیوں ہے؟" ڈاکٹر نے خود سے کہا، اور پھر ذرا اونچی آواز میں بولے:

"آپ کے خون میں لپڈس اور کلسٹرول بہت بڑھ گیا ہے۔ یورک ایسڈ بھی پہلے سے زیادہ ہے۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"آپ کا مطلب فاسد مادّوں سے ہے؟" زبیدہ نے حکیم قدّوس کی زبان استعمال کی۔

"چلیے فاسد مادّے ہی کہہ لیجیے۔ مگر کیوں؟" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"اچھا، تو پھر ایسا کیجیے کہ آپ اپنی واک کا ٹائم کچھ اور بڑھا دیجیے۔"

"بہت اچھا" کہہ کر زبیدہ اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے میز پر پڑی اپنی رپورٹوں کو اٹھایا،

Scanned with CamScanner

مروڑی دے کر اپنے پرس میں ٹھونسا اور ڈاکٹر آنند حرے کا شکریہ ادا کرتی ہوئی کمرے سے نکل کر باہر آ گئی۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے باور کر لیا: جاگنگ پارک میں ایک ماہ تک چالیس منٹ برسک واک کرتے ہوئے ذہن، آنکھوں اور کانوں کے راستے جو فاسد مادّے معدے میں داخل ہو کر خون میں شامل ہوئے ہیں، یہ سب انھیں کا فتور ہے۔

اس نے اپنی گاڑی کو گھر کی سمت موڑا۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بچھے ہوئے آرام دہ صوفے میں دھنس کر بیٹھ گئی۔

اب وہ جاگنگ پارک میں برِسک واک کرنے کا پروگرام قطعی طور پر ترک کر چکی تھی۔

**

ماہ نامہ

شب خون

ترتیب و تہذیب: شمس الرحمن فاروقی

رانی منڈی، الہ آباد

ماہ نامہ

ایوانِ اردو

مرتبین: زبیر رضوی، مخمور سعیدی

دہلی اردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

رسالہ

جامعہ

مدیر: شمیم حنفی، سہیل احمد فاروقی

ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ادبی ماہ نامہ

شاعر

مدیر: افتخار امام صدیقی

پی او بکس ۴۰۷۷، گرگاؤں ایچ پی او، بمبئی ۴۰۰۰۰۴

سہ ماہی

رجحانات

مدیر: طاہر اسلم گورا

۲۵ سی، لوئر مال، لاہور

امیتاو گھوش (Amitav Ghosh)

انگریزی کے معروف اور جدید ناول نگار امیتاو گھوش ۱۹۵۶ میں بنگال میں پیدا ہوئے۔ دہلی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد وہ سماجی بشریات (social anthropology) میں ڈی فِل کرنے کے لیے آکسفورڈ چلے گئے۔ اس علم کی تحقیق کے دوران انھوں نے چند سال مصر کے شہروں اور دیہات میں گزارے۔ امیتاو گھوش کا پہلا ناول *The Circle of Reason* ۱۹۸۶ میں شائع ہوا۔ اس کے فرانسیسی ایڈیشن کو بہترین غیر ملکی ناول کا میدیسی اعزاز ملا۔ دوسرا ناول *The Shadow Lines* ۱۹۸۸ میں چھپا اور اس نے ہندوستان کی ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ حاصل کیا۔ ان کی تیسری کتاب *In an Antique Land*، جو ۱۹۹۲ میں شائع ہوئی، دیگر موضوعات کے علاوہ ان کے قیامِ مصر کے تجربات پر بھی محیط ہے، اگرچہ اس کا بنیادی موضوع برصغیر کے تہذیبی مسائل ہیں۔

امیتاو گھوش کا مضمون The Ghosts of Mrs Gandhi، جس کا ترجمہ اگلے صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے، امریکی جریدے "نیویارکر" کے ۱۷ جولائی ۱۹۹۵ کے شمارے میں Personal History کے ذیل میں شائع ہوا۔

اس مضمون میں بوسنیا کے ادیب جواد قراحسن (Dzevad Karahasan) کا ذکر آیا ہے۔ قراحسن ۱۹۵۳ میں سرائیوو میں پیدا ہوئے۔ وہ مصنف، تھیئٹر کے تنقید نگار، سرائیوو یونیورسٹی میں ڈرامے کے استاد اور ادب اور تنقید کے ایک جریدے *Izraz* کے مدیر ہیں۔ ڈرامے کے موضوعات پر مضامین اور کتابوں کے علاوہ ان کی کئی نثری کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے ایک کا عنوان *The Eastern Divan* ہے۔ قراحسن کی تازہ ترین کتاب *Sarajevo, Exodus of a City* ۱۹۹۴ میں شائع ہوئی ہے۔ ان کے ایک مضمون Sarajevo: Portrait of an Inward City کا اردو ترجمہ "سرائیوو: ایک دروں بیں شہر کا مرقع" کے عنوان سے "آج" کے شمارہ ۱۷ ("سرائیوو سرائیوو") میں شائع ہوا تھا۔

اِیوان کلیما (Ivan Klima)

ایوان کلیما سابق چیکوسلوواکیا کے ایک نمایاں فکشن نگار ہیں۔ وہ "پراگ کے موسمِ بہار" (Prague Spring) کے دوران مقبول نوجوان ادیبوں میں شامل تھے۔ ۱۹۶۸ میں چیکوسلوواکیا پر روسی حملے کے بعد ان کی تحریروں کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی، مگر انھوں نے لکھنا جاری رکھا اور ٹائپ شدہ مجلد نسخوں کی صورت میں ان کی تحریریں، دوسرے ممنوع ادیبوں -- کافکا، آرول، کنڈیرا اور اسکوارچکی -- کی تحریروں کے ساتھ خفیہ طور پر گردش کرتی رہیں۔ انگریزی میں کلیما کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں *My Merry Mornings*، *My First Loves*، *My Golden Trades* وغیرہ شامل ہیں۔ ان کا ناول *Love and Garbage* بھی انگریزی ترجمہ کی شکل میں چھپ چکا ہے۔ کلیما کا مضمون Freedom and Garbage، جس کا ترجمہ صفحہ ۱۴۷ پر پیش کیا جا رہا ہے، مشرقی یوروپ میں کمیونزم کے خاتمے کے بعد کی تہذیبی اور ادبی صورتِ حال سے بحث کرتا ہے۔ یہ مضمون برطانیہ کے دوماہی جریدے *Index on Censorship* کے شمارہ ۶ (۱۹۹۴) میں شائع ہوا۔

Scanned with CamScanner

ایتاو گھوش

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

مسز گاندھی کی بدروحیں

۱۹۸۴ کے سال نے دنیا میں کہیں اور اپنی بدشگونیوں کو اتنے مکمل طور پر پورا نہیں کیا جتنا ہندوستان میں۔ پنجاب میں علیحدگی پسندوں کا تشدد؛ امرتسر کی عظیم سکھ عبادت گاہ پر فوج کا حملہ؛ وزیرِاعظم مسز اندرا گاندھی کا قتل؛ متعدد شہروں میں فسادات؛ بھوپال میں گیس کا سانحہ -- واقعات ایک کے بعد ایک ہوتے چلے گئے۔ ۱۹۸۴ کے بعض دن تو ایسے تھے کہ نئی دہلی میں صبح کو اخبار کھولنے کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت پڑتی تھی۔

اس سال کے بہت سے سانحوں میں سے مسز گاندھی کی موت کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے میری زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اُس عرصے کے تجربات ادیب کے طور پر میری نشوونما کے لیے گہری اہمیت رکھتے تھے؛ اس قدر کہ میں نے آج تک ان کے بارے میں لکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

اُن دنوں میں نئی دہلی کے ایک علاقے ڈیفنس کالونی میں رہتا تھا جو وسیع، پیچیدہ مکانوں پر مشتمل محلّہ تھا جن کی چھتوں پر اور گراجوں کے اوپر نوکروں کے الگ تھلگ، اپنے آپ میں مکمل، ایک ایک کمرے کے گھر ایک طرف کو بنے ہوتے تھے۔ جب میں وہاں رہتا تھا تب تک ان کمروں نے اپنے مقام کی تلاش میں کوشاں نوجوانوں -- صحافیوں، کاپی رائٹروں، نچلے درجے کے افسروں اور مجھ جیسے یونیورسٹی کے استادوں -- کو سر چھپانے کی جگہ دے دی تھی۔ ہم لوگ اس مال دار محلّے میں یوں بھرے ہوئے تھے جیسے شہد کے چھتے میں، جو چھتوں پر دور تک پھیلا ہوا تھا، مکھیاں بھری ہوں؛ شیفون کے کپڑے لٹکی الگنیاں اور ٹی وی ایریلوں کے جنگل ہماری ناپائیدار زندگیوں اور ہمارے مالک مکانوں کے درمیان حائل

تھے۔

میں تب اٹھائیس سال کا تھا۔ جس شہر کو میں اپنا گھر سمجھتا تھا وہ کلکتہ تھا، لیکن چند برسوں کو چھوڑ کر، جو میں نے انگلستان اور مصر میں گزارے، میری بلوغت کی تمام زندگی نئی دہلی ہی میں گزری تھی۔ میں دو سال پہلے آکسفورڈ میں ڈاکٹریٹ مکمل کر کے ہندوستان واپس آیا تھا اور حال ہی میں مجھے دہلی یونیورسٹی میں ایک تدریسی ملازمت ملی تھی۔ مگر میری اصل زندگی میری تپتی ہوئی چھت پر بسر ہوتی تھی۔ میں اپنا پہلا ناول، کلاسیکی وضع کے مطابق ایک اٹاری پر بیٹھا، لکھ رہا تھا۔

۳۱ اکتوبر کی صبح، جب مسز گاندھی کا قتل ہوا، میں معمول کے مطابق تقریباً ساڑھے نو بجے دہلی یونیورسٹی جانے کے لیے بس میں سوار ہوا۔ جہاں میں رہتا تھا وہاں سے اس سفر میں ڈیڑھ گھنٹا لگتا تھا جو یوں ایک طویل راستا ہے مگر نئی دہلی کے حساب سے کچھ غیر معمولی نہیں۔ قتل اس وقت سے کچھ پہلے ہو چکا تھا لیکن مجھے بس میں سوار ہوتے ہوئے اس کی خبر نہ تھی۔ نہ ہی میں نے نوّے منٹ کے سفر کے دوران کوئی ناخوشگوار بات محسوس کی۔ مگر خبر لوگوں کے ہونٹوں سے ہوتی ہوئی یونیورسٹی پہنچنے کے لیے میری بس کے ساتھ دوڑ لگا رہی تھی۔

جب میں یونیورسٹی کے میدان میں داخل ہوا تو میں نے لڑکوں کے شوروغل کرتے، فرِسبی پھینکتے ہجوم کے بجائے، جو ہمیشہ نظر آتا تھا، لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کو ٹرانزسٹروں کے گرد جمع دیکھا۔ ایک نوجوان ایسی ایک ٹولی سے الگ ہو کر میری سمت بڑھا؛ اس کا منھ سختی سے بند ہونٹوں پر پھیلی کچھ جاننے والی مسکراہٹ سے کھنچا ہوا تھا جو یہ کہتی معلوم ہوتی ہے کہ "آپ نے کچھ سنا۔۔۔؟"

پورے کیمپس میں افواہ گرم ہے، اس نے بتایا۔ کوئی شخص یقین سے نہیں جانتا، مگر کہا جا رہا ہے کہ مسز گاندھی کو گولی لگی ہے۔ افواہ یہ تھی کہ اس سال کے شروع میں امرتسر میں واقع سکھوں کے گولڈن ٹیمپل پر چڑھائی کے لیے فوج بھیجنے کا انتقام لینے کی غرض سے دو سکھ محافظوں نے انھیں قتل کر دیا ہے۔

لیکچر روم میں قدم رکھنے سے ذرا پہلے میں نے ہندوستان کے قومی ریڈیو نیٹ ورک، آل انڈیا ریڈیو، پر ایک رپورٹ سنی: مسز گاندھی کو ایک قاتلانہ حملے کے بعد اسپتال لے جایا گیا تھا۔

کوئی بھی شے نہیں تھمی: روزمرہ کے معمول کا زور ہر چیز کو بہائے لے جاتا رہا۔ میں کلاس روم میں چلا گیا اور اپنا لیکچر شروع کیا، مگر اس دن کچھ زیادہ طلبا نہیں آئے تھے اور جو آئے تھے وہ کھوئے ہوئے اور منتشر تھے؛ کلاس میں بہت اضطراب تھا۔

لیکچر کے درمیان میں مَیں نے کمرے کی واحد، جھری جیسی لمبی کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ نیچے سبزہ زار پر اور دور پیڑوں پر روشن دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سال کے وہ دن تھے جب دہلی اپنی بہترین کیفیت میں ہوتا ہے، خوش گوار اور خنک؛ حال ہی میں ختم ہوئے مون سون نے اس کے بافراط سبزے کی خوب سنچائی کی تھی اور آسمان کو دھو کر چمکا دیا تھا۔ جب میں واپس مڑا تو بھول چکا تھا کہ کیا بات ہو رہی تھی اور مجھے اپنے نوٹس پر نظر ڈالنی پڑی۔

مجھے اپنی بے کلی نے حیرت میں ڈال دیا۔ مسز گاندھی کے لیے میری پسندیدگی تنقید سے مبرّا نہ تھی۔ ۱۹۷۰ کی دہائی کے درمیانی برسوں میں ان کی حکومت کا نیم آمرانہ دور میری یادداشت میں اب بھی زندہ تھا۔ لیکن ان کے قتل کے بہیمانہ پن نے اچانک ان کی بعض حقیقی خصوصیات یاد دلادی تھیں جن کو معمول کی بات سمجھا جانے لگا تھا: استقامت، وقار، جسمانی جرأت اور ثابت قدمی۔

لیکن اُس لمحے میں صرف دُکھ نہیں محسوس کر رہا تھا۔ اس سے بڑھ کر کسی شے کے ہاتھ سے پھسلتے چلے جانے کا سا احساس تھا، اندر کہیں کسی لنگر کی گرہ کے اچانک کھل جانے کا احساس۔

مسز گاندھی کی موت کی پہلی قابلِ اعتبار رپورٹ پاکستان کے سرکاری ریڈیو نیٹ ورک کے کراچی اسٹیشن سے تقریباً ڈیڑھ بجے نشر ہوئی۔ آل انڈیا ریڈیو پر معمول کی نشریات کی جگہ موسیقی نے لے لی تھی۔

میں یونیورسٹی سے اپنے ایک دوست ہَری سین کے ساتھ نکلا جو شہر کے دوسرے کنارے پر رہتا تھا۔ مجھے ایک لانگ ڈسٹنس کال کرنی تھی اور اس نے مجھے پیش کش کی تھی کہ میں اس کے گھر کا فون استعمال کر سکتا ہوں۔

ہری کے گھر پہنچنے کے لیے ہمیں کناٹ پلیس پر بس بدلنی تھی جو دہلی کے ٹھیک جغرافیائی مرکز میں واقع، دائرے کی شکل کا ایک نفیس آرکیڈ ہے اور پرانی اور نئی دہلی کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔ جس وقت بس آرکیڈ کے محیط پر گھوم رہی تھی، میں نے دیکھا کہ دکانیں، اسٹال اور کھانے کی جگہیں بند ہونے لگی ہیں، جب کہ ابھی سہ پہر بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

اگلی بس جس میں ہم سوار ہوئے پوری بھری ہوئی نہیں تھی، جو معمول سے مختلف بات تھی۔ عین اس وقت جب وہ نکل رہی تھی ایک شخص کسی دفتر سے دوڑتا ہوا نکلا اور کود کر سوار ہو گیا۔ وہ درمیانی عمر کا آدمی تھا اور قمیص پتلون پہنے تھا، لگتا تھا کہ پاس کی کسی سرکاری عمارت میں ملازم ہو گا۔ وہ سکھ تھا، لیکن اُس وقت مجھے اس کا کوئی احساس نہیں ہوا۔

وہ شخص غالباً کچھ زیادہ سوچے بغیر بس میں چڑھ گیا تھا، کیوں کہ وہ روز اسی بس میں آتا جاتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اُس روز کوئی اَور فیصلہ اس سے زیادہ بدقسمتی کا نہیں ہو سکتا تھا، کیوں کہ اس بس کا راستا اُس اسپتال کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا جہاں مسز گاندھی کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ اُن کے پارٹی کے بعض وفادار وہاں موجود انبوہ کو انتقام لینے پر اکسانا شروع کر چکے تھے۔ اس وقت تک گیانی ذیل سنگھ، صدرِ جمہوریہ، کے موٹر کیڈ پر ہجوم کا حملہ ہو چکا تھا۔

مگر اُس وقت ہمیں ان میں سے کوئی بات معلوم نہیں تھی، اور ہمیں اس کا شبہ تک نہیں ہو سکتا تھا: دہلی شہر میں سکھ کبھی بھی تشدد کا ہدف نہیں بنائے گئے تھے۔

جس وقت ہماری بس نئی دہلی کی چوڑی، دورویہ پیڑوں سے سجی سڑکوں پر آگے بڑھ رہی تھی، کچھ

Scanned with CamScanner

گاڑیاں، جو آگے پیچھے چلتی موٹر سائیکلوں اور پہرے کے باعث سرکاری لگتی تھیں، ہم سے آگے نکل کر اسپتال کی سمت چلی گئیں۔ جوں جوں ہم اسپتال کے قریب پہنچتے گئے یہ بات واضح ہوتی گئی کہ وہاں بہت سارے لوگ جمع ہیں۔ لیکن یہ کوئی عام سی بھیڑ نہیں تھی: یہ زیادہ تر سُرخ آنکھوں اور بٹن کھلی قمیصوں والے نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ تب میں نے محسوس کیا کہ بس میں میرے ساتھ سفر کرنے والے سکھ کے انداز سے بڑھتا ہوا اضطراب ظاہر ہو رہا ہے۔ وہ کبھی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور کھڑکی میں سے جھانکنے لگتا، کبھی دروازے میں سے باہر دیکھنے لگتا۔ بس سے اترنا اب ممکن نہ تھا: غنڈے ہر طرف گھوم رہے تھے۔

جوں جوں اسپتال قریب آتا گیا نوجوانوں کی ٹولیاں اور زیادہ خطرناک ہوتی گئیں۔ وہ بہت چوکنے دکھائی دے رہے تھے: ان میں سے بعض فولادی سلاخوں اور سائیکل کی زنجیروں سے مسلّح تھے اور کچھ مصروف سڑک پر پھیل گئے تھے اور کاروں اور بسوں کو روک رہے تھے۔

سب سے پہلے بس میں مجھ سے خالی جگہ چھوڑ کر بیٹھی ایک ساری والی عورت کی سمجھ میں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور تیزی سے اس سکھ کو اشارہ کیا جو اپنی سیٹ پر دبکا بیٹھا تھا۔ اس نے تیز سرگوشی میں اسے ہندی میں بتایا کہ وہ نیچے بیٹھ جائے تاکہ باہر سے دکھائی نہ دے سکے۔

وہ آدمی حیرت سے چونک پڑا اور اس نے خود کو سیٹوں کے درمیان کی تنگ جگہ میں سمیٹ لیا۔

چند منٹ بعد ہماری بس کو چمک دار، تیز رنگوں والی سِنتھیٹک قمیصوں والے نوجوانوں کی ایک ٹولی نے روکا۔ ان میں سے کئی ایک نے اپنی کلائیوں پر سائیکل کی زنجیریں لپیٹ رکھی تھیں۔ بس کی رفتار دھیمی پڑی تو وہ اس کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگے۔ ہم نے انھیں کھلے دروازے میں سے اونچی آواز میں ڈرائیور سے پوچھتے سنا کہ اس بس میں کوئی سکھ تو نہیں ہے۔

ڈرائیور نے سر ہلا کر انکار کر دیا کہ نہیں، اس بس میں کوئی سکھ سوار نہیں ہے۔

مجھ سے چند قطار آگے پگڑی والا دبکا ہوا شخص بالکل ساکت ہو چکا تھا۔

باہر کچھ نوجوان اچک اچک کر کھڑکیوں میں سے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہی سوال کر رہے تھے کہ اس بس میں کوئی سکھ تو نہیں ہے۔ ان کی آوازیں اشتعال بالکل نہیں تھا؛ اور یہ سب سے زیادہ دہشت زدہ کر دینے والی بات تھی۔

نہیں، کسی نے کہا، اور پھر اچانک بہت سی آوازیں ایک ساتھ یہی لفظ دُہرانے لگیں۔ جلد ہی تمام مسافر اپنے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہنے لگے، نہیں، نہیں، ہمیں جانے دو، ہمیں گھر پہنچنا ہے۔

آخر کار غنڈے پیچھے ہٹ گئے اور ہاتھ ہلا کر ہماری بس کو گزرنے کا اشارہ دے دیا۔

رِنگ روڈ سے تیز رفتاری سے گزرتے ہوئے ہم میں سے کسی کی زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔

ہری سین نئی دہلی کی ایک نئی قائم شدہ کالونی میں رہتا تھا۔ اس کا نام صفدر جنگ انکلیو تھا اور یہ

Scanned with CamScanner

بالکل درست اور ٹھوس انداز میں درمیانہ طبقے کا محلّہ تھا جو خوش حالی سے زیادہ خوش حالی کی اُمنگوں سے آباد تھا۔ نئی دہلی کے ایسے دیگر نواحی علاقوں کی طرح یہاں بھی ملی جلی آبادی تھی: سکھوں کی بھرپور نمائندگی تھی۔

اس محلّے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک لمبی سڑک یوں دوڑتی چلی گئی تھی جیسے کنگھی کے بیچ کا سالم حصّہ ہوتا ہے، اور اس کے دونوں طرف متوازی بغلی گلیاں تھیں۔ ہری ایک ایسی ہی گلی کے آخری سرے پر ایک خاصے عام انداز کے ایک منزلہ بنگلے میں رہتا تھا۔ لیکن اس کے برابر کا مکان اس سے کہیں زیادہ عالی شان اور تعمیر کے نمونے کے لحاظ سے غیر معمولی طور پر بے باک تھا۔ یہ ایک زاویے دار عمارت تھی جس کا ڈھانچا ستونوں پر کھڑا تھا۔ اس کے مالک مسٹر باوا ایک عمر رسیدہ سکھ تھے جنھوں نے ایک طویل عرصہ ملک سے باہر مختلف بین الاقوامی اداروں کی ملازمت میں گزارا تھا۔ اب کئی برس سے وہ جنوب مشرقی ایشیا میں رہ رہے تھے، ان چوبی ستونوں کا یہی جواز تھا۔

ہری اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ایک اتنے گنجان آباد اور عجیب و غریب کنبے میں رہتا تھا کہ اس کے دوست اسے گابریئل گارسیا مارکیز کے طلسماتی گاؤں کے نام پر ماکوندو کہنے لگے تھے۔ لیکن اس موقعے پر گھر میں صرف ہری کی والدہ اور کم سن بہن موجود تھیں۔ میں نے وہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ ایک بہت روشن دن تھا۔ جب میں نے باہر نکل کر دھوپ میں قدم رکھا تو مجھے ایک ایسا منظر دکھائی دیا جس کا میں کبھی تصور تک نہ کر سکتا تھا۔ ہر سمت میں دھویں کے ستون آہستہ آہستہ شفاف آسمان میں بلند ہو رہے تھے۔ سکھوں کے گھر اور ان کی کاروباری جگہیں جل رہی تھیں۔ آگ کے ہدف اتنی احتیاط سے متعیّن کیے گئے تھے کہ اسے دیکھ کر ہر طرف پھیلی ہوئی آتش زدگی کا نہیں، بلکہ اس سے قطعی مختلف شے کا تاثر اُبھرتا تھا: بالکل ایسا جیسے بے شمار ستونوں والے کسی وسیع و عریض ہال میں کوئی شخص نیچے سے اس کی چھت کو دیکھ رہا ہو۔

میرے وہاں کھڑے کھڑے ہی دھویں کے ان ستونوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ان آتش زدہ جگہوں میں سے بعض بہت پاس معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے ایک راہ گیر سے استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ صبح سے علاقے کے کئی سکھ مکانوں کو لُوٹا اور جلایا جا چکا ہے۔ ہجوم نے اپنی کارروائی محلّے کے پرلے سرے سے شروع کی تھی اور اب وہ ہماری سمت میں بڑھ رہا تھا۔ جن ہندوؤں اور مسلمانوں نے سکھوں کو پناہ دی یا بچانے کی کوشش کی ان کے بھی مکان لُوٹے اور جلائے گئے تھے۔

ہر طرف خاموشی اور سکون تھا، اور یہ بات عجیب لگتی تھی۔ بھیڑ کے وقت کی ٹریفک کا شور غائب تھا۔ مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد بڑی سڑک پر تیزی سے جاتی کسی کار یا موٹر سائیکل کی آواز سنائی دیتی۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ پُراسرار تیز رفتار گاڑیاں قتلِ عام کی رہ نمائی میں بہت اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔ بعض سیاست دانوں کے تحفظ میں "آرگنائزر" شہر میں تیزی سے چکر لگا رہے تھے، "ہجوموں" کو اکٹھا کر رہے تھے اور انھیں سکھوں کے مکانوں اور دکانوں تک پہنچنے کے لیے ٹرانسپورٹ فراہم کر رہے تھے۔

بظاہر لگتا ہے کہ یہ ٹرانسپورٹ انہیں مفت فراہم کی گئی تھی۔ ان واقعات کے کچھ ہی عرصے بعد شائع ہونے والی شہری حقوق کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ تشدد کا یہ مرحلہ "ٹمپو وینوں، اسکوٹروں، موٹرسائیکلوں یا ٹرکوں میں سوار مسلح نوجوانوں کی ٹولیوں کی آمد سے شروع ہوا تھا،" اور رپورٹ میں مزید کہا گیا کہ "یہ لوگ پٹرول کے ڈبے اٹھائے محلوں میں گھومتے اور سکھوں کے مکانوں، دکانوں اور گردواروں کو منظم انداز میں آگ لگاتے رہے۔۔۔ ان کا سب سے پہلا ہدف نوجوان سکھ تھے۔ انہیں گھسیٹ کر باہر نکالا جاتا، پیٹا جاتا اور پھر زندہ جلا دیا جاتا۔۔۔ تمام متاثرہ علاقوں میں لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کی کوشش اس مشترکہ رجحان میں واضح طور پر ظاہر ہوئی کہ سکھوں کو سڑکوں پر زندہ جلایا گیا۔"

آگ ہر طرف تھی؛ یہ اُس دن کا شناختی نشان تھی۔ شہر بھر میں سکھوں کے مکان لوٹے گئے اور پھر انہیں، اکثر موقعوں پر مکینوں سمیت، آگ لگائی گئی۔

زندہ بچ نکلنے والی ایک عورت نے ۔۔ جس کا شوہر اور تین بیٹے ہلاک ہو گئے ۔۔ دہلی کی ایک ماہرِ عمرانیات وینا داس کو درج ذیل بیان دیا: "کچھ لوگوں نے، ہمارے پڑوسیوں نے ہم سے کہا، بہتر ہو گا کہ ہم لوگ پاس کے ایک خالی مکان میں چھپ جائیں۔ تو میرے شوہر تینوں بیٹوں کو لے کر وہاں جا چھپے۔ اپنے مکان میں ہم نے باہر سے تالا لگا دیا، مگر لوگوں کے دلوں میں ضرور کوئی بدنیتی تھی۔ کسی نے ہجوم کو بتایا ہو گا۔ پہلے انھوں نے میرے شوہر کو باہر آنے کے لیے للکارا۔ پھر اس مکان پر کیروسین چھڑک دیا۔ انھوں نے ان چاروں کو زندہ جلا دیا۔ جب میں رات کو وہاں گئی تو میرے بیٹوں کی لاشیں مچان پر ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی پڑی تھیں۔"

اگلے چند دنوں میں تقریباً دو ہزار پانچ سو افراد صرف دہلی میں قتل کیے گئے۔ دوسرے شہروں میں ہزاروں اور مارے گئے۔ ہلاک ہونے والوں کی پوری تعداد کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔ ان میں بیشتر سکھ مرد تھے۔ پورے پورے محلوں کو آگ لگائی گئی؛ دسیوں ہزار لوگ بے گھر ہو گئے۔

اپنی نسل کے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی اسی یقین کے ساتھ بڑا ہوا تھا کہ جو قتلِ عام ۱۹۴۷ میں ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کے وقت پیش آیا تھا اب کبھی نہیں دُہرایا جا سکے گا۔ لیکن اُس دن دہلی شہر میں تشدد دیوانگی کے اُسی درجے پر جا پہنچا تھا۔

جس وقت ہری اور مَیں باہر کھڑے دھوئیں کی دھاریوں والے آسمان کو تک رہے تھے، ہری کی والدہ، مسز سین، زیادہ فوری نوعیت کے مسائل کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ وہ پچاس برس کی دراز قد اور پُروقار عورت تھیں اور نہایت نرم خُو اور نرم گفتار تھیں۔ ایک کم بیان انداز میں وہ اپنی شخصیت کی گہرائی میں مذہبی، یعنی پکّی ہندو، بھی تھیں۔ جب انھوں نے سنا کہ کیا ہو رہا ہے تو فوراً فون اٹھایا اور اپنے معمر پڑوسیوں مسٹر باوا اور ان کی بیگم سے بات کر کے انہیں اطلاع دی کہ اگر وہ ان کے گھر آنا چاہیں تو خوشی سے آ سکتے ہیں۔ ان کو اپنی بات کا غیر متوقع جواب ملا: عجیب سی خاموشی۔ مسز باوا کا خیال تھا کہ وہ

Scanned with CamScanner

مذاق کر رہی ہیں اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ انھیں اس سے محظوظ ہونا چاہیے یا نہیں۔
دوپہر کے قریب مسز سین کے پاس ایک فون آیا: ہجوم اب بالکل پاس کی گلیوں تک پہنچ چکا تھا اور ایک ایک گلی کر کے بڑے منظم طریقے سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہری نے فیصلہ کیا کہ فوراً جا کر مسٹر باوا سے بات کرنی چاہیے۔ میں بھی اس کے ساتھ گیا۔
مسٹر باوا ایک پستہ قد، دبلے پتلے آدمی نکلے۔ اگرچہ انھوں نے گھر کے کپڑے پہن رکھے تھے، لیکن ان کی پگڑی بالکل درست انداز میں بندھی ہوئی تھی اور داڑھی بھی قرینے سے کنگھی کر کے جالی میں لپیٹی ہوئی تھی۔ انھیں ہماری آمد سے اچنبھا ہوا۔ خیر مقدمی کلمات کے تبادلے کے بعد انھوں نے دریافت کیا کہ وہ ہمارے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ وضاحت کرنے کا کام ہری کے حصے میں آیا۔
مسٹر باوا کو بلاشبہ مسز گاندھی کے قتل کیے جانے کی اطلاع مل چکی تھی، اور یہ بھی کہ کوئی ہنگامہ ہو رہا ہے۔ لیکن انھیں گمان تک نہ تھا کہ اس ہنگامے سے وہ یا ان کی بیگم کیوں کر متاثر ہو سکتے ہیں۔ سکھ دہشت پسندوں سے انھیں ہم سے بڑھ کر ہمدردی نہیں تھی؛ مسز گاندھی کے قتل پر ان کی ناخوشی ہم سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ نہ صرف ہندوستان ' ہندوستانی ریاست سے ان کی کمٹ منٹ مطلق تھی، بلکہ ان کے رویے سے ظاہر تھا کہ وہ ملک کے حکمراں طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔
کسی ایسے شخص کو جس کی تمام عمر مراعات کی حفاظت میں گزری ہو، آپ کیوں کر اطلاع دے سکتے ہیں کہ اس کے حفاظتی خول میں ہلاکت خیز دراڑ پڑ گئی ہے؟ ہم نے اپنی زبان کو لڑکھڑاتا محسوس کیا۔ مسٹر باوا کو کسی صورت باور نہیں کرایا جا سکتا تھا کہ کوئی ہجوم اُن پر حملہ کر سکتا ہے۔
جس وقت ہم واپس لوٹے تب تک صورت یہ ہو چکی تھی کہ مسٹر باوا ہمیں تسلی دے رہے تھے۔ انھوں نے پیٹھ پر تھپکی دے کر ہمیں رخصت کیا۔ انھوں نے buck up کا فقرہ تو نہیں کہا لیکن ان کا انداز یہی ظاہر کر رہا تھا۔
ہمیں اعتماد تھا کہ حکومت تشدد کو روکنے کے لیے جلد اقدام کرے گی۔ ہندوستان میں شہری ہنگاموں سے نمٹنے کے لیے کارروائی بالکل طے شدہ ہے: کرفیو نافذ کیا جاتا ہے: نیم فوجی دستے تعینات کیے جاتے ہیں؛ انتہائی خراب صورت حال میں فوج متاثرہ علاقوں میں بھیجی جاتی ہے۔ ہندوستان کا کوئی اور شہر اس کارروائی کے لیے حفاظتی مشینری سے نئی دہلی سے زیادہ لیس نہیں ہے۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ بعض شہروں میں —— مثلاً کلکتے میں —— حکام نے تشدد کو روکنے کے لیے فوری اقدام کیا۔ لیکن نئی دہلی، اور شمالی ہند کے بیشتر علاقوں، میں گھنٹوں پر گھنٹے گزرتے گئے اور کچھ نہ کیا گیا۔ ہم ہر چند منٹ بعد یہ خبر سننے کی توقع پر ریڈیو لگاتے کہ فوج کو طلب کر لیا گیا ہے۔ لیکن ہمیں ماتمی موسیقی، مسز گاندھی کی میت کے رکھے جانے، اور اہم ملکی اور غیر ملکی شخصیتوں کی آمدورفت کی تفصیلات کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا۔ محسوس ہو سکتا تھا کہ خبروں کے بلیٹن کسی دوسرے سیارے سے موصول ہونے والے پیغامات ہیں۔

جوں جوں سہ پہر کا وقت گزرتا گیا، ہمیں ہجوم کی متواتر پیش رفت کی اطلاعیں ملتی رہیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ برابر کی گلی میں پہنچ چکا تھا: ہمیں آوازیں سنائی دینے لگیں؛ دھواں ہر طرف پھیل رہا تھا۔ فوج یا پولیس کا اب تک کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

ہری نے ایک بار پھر مسٹر باوا کو فون کیا، اور اب، اپنی کھڑکی میں سے نظر آتے شعلوں کو دیکھ کر، وہ ہماری بات سننے پر پہلے سے زیادہ آمادہ تھے۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ، تھوڑی دیر کے لیے، ہری کے گھر آنے پر راضی ہو گئے۔ مگر اب مسئلہ یہ تھا: آئیں کیسے؟ دونوں مکانوں کے بیچ کندھوں تک اونچی دیوار تھی، اس لیے ایک سے دوسرے مکان میں صرف گلی میں سے ہو کر جانا ممکن تھا۔

گلی کے سرے پر مجھے کچھ غنڈے دکھائی دے چکے تھے۔ کچھ کچھ دیر بعد گلی میں آتی جاتی موٹرسائیکل کی آواز سنائی دے جاتی۔ مسٹر باوا اور ان کی بیگم گلی میں قدم رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ انھیں فوراً دیکھ لیا جاتا؛ سورج ڈوب چکا تھا لیکن روشنی اب تک باقی تھی۔ مسٹر باوا کو دیوار پر چڑھنے کی تجویز عجیب لگی؛ اُن کی عمر میں دیوار ایک ناقابلِ عبور رکاوٹ معلوم ہوتی تھی۔ مگر آخرکار ہری نے انھیں کوشش کرنے پر آمادہ کر لیا۔

ہم ہری کے مکان کے پچھواڑے جا کر اُن کا انتظار کرنے لگے، ایک ایسے مقام پر کھڑے ہو کر جو اوٹ میں ہونے کے باعث گلی میں سے دکھائی نہ دے سکتا تھا۔ ہجوم اب دہشت ناک حد تک قریب محسوس ہوتا تھا، اور فیصلہ کرنے میں مسٹر باوا کی تاخیر احتیاط کے خلاف لگ رہی تھی۔ ایک طویل وقفہ گزرا جس کے بعد دونوں میاں بیوی آخرکار نمودار ہوئے اور تیزی سے چلتے ہوئے ہماری طرف آئے۔

مسٹر باوا نے گھر سے نکلنے سے پہلے لباس تبدیل کیا تھا: اپنے بلیزر اور کراوات میں وہ نہایت نفیس، بلکہ سجے بنے، لگ رہے تھے۔ مسز باوا، جو چھوٹے قد کی اور شفیق خاتون معلوم ہوتی تھیں، شلوار قمیص میں ملبوس تھیں۔ ان کا باورچی ان کے ساتھ تھا، اور اُسی کی مدد سے وہ دونوں دیوار پھلانگ کر اِس طرف پہنچ سکے۔ باورچی، جو ہندو تھا، واپس گھر میں چلا گیا تاکہ پہرا دے سکے۔

ہری اُن دونوں کو ڈرائنگ روم میں لے آیا جہاں مسز سین، شیفون کی ساری پہنے، انتظار کر رہی تھیں۔ کمرہ خاصا بڑا اور آراستہ تھا: اس کی دیواروں پر کم یاب اور حسین منی ایچر تصویریں لگی تھیں۔ پردے کھینچ دینے اور بتیاں جلا دینے پر کمرہ گرم اور مہمان نواز محسوس ہونے لگا۔ لیکن باہر گلی میں گھومتے ہجوم کے اور ہمارے درمیان محض فرانسیسی کھڑکیوں کی ایک قطار اور لان کی دیوار حائل تھی۔

معمر میاں بیوی کے داخل ہونے پر مسز سین نے ہاتھ جوڑ کر ان کا سواگت کیا۔ تینوں ایک دائرے کی شکل میں قریب قریب بیٹھ گئے اور جلد ہی چائے کی نقرئی ٹرے لائی گئی۔ تمام تکلفات دم بھر میں ہوا ہو گئے، اور چینی کے برتنوں کی کھنکھناہٹ کے درمیان گفتگو کا رخ نئی دہلی کے کسی بھی ڈرائنگ روم کے پسندیدہ موضوعات کی طرف مڑ گیا۔

میں خود کو وہاں بیٹھنے پر آمادہ نہ کر سکا، اضطراب کے عالم میں راہداری میں جا کھڑا ہوا اور سامنے کے

Scanned with CamScanner

دروازے میں سے باہر جھانکنے لگا۔

موٹرسائیکلوں پر سوار کچھ نوجوان برابر کے مکان کے دروازے پر پہنچ گئے۔ وہ مکان کا جائزہ لینے کی غرض سے موٹرسائیکلوں سے اتر آئے اور کنکریٹ کے ستونوں کے درمیان گھوم پھر کر اندر کی سن گن لینے لگے۔ کسی طرح انھیں اندر باورچی کی موجودگی کا اندازہ ہو گیا اور انھوں نے اسے پکار کر باہر بلایا۔

باورچی بہت ڈرا ہوا تھا۔ وہ چاروں طرف سے غنڈوں کے گھیرے میں تھا جو اُس کی آنکھوں کے آگے چاقو لہرا رہے تھے اور چیخ چیخ کر سوالات کر رہے تھے۔ اندھیرا ہو گیا تھا اور ان میں کچھ نے مٹی کے تیل کی ٹارچیں اٹھا رکھی تھیں۔ کیا یہ سچ ہے، انھوں نے چلّا کر پوچھا، کہ اس کے مالک سکھ ہیں؟ کہاں ہیں وہ؟ کیا اندر چھپے ہوئے ہیں؟ مکان کس کا ہے — ہندو کا یا سکھ کا؟

ہری اور میں دونوں مکانوں کی بیچ کے دیوار کی اوٹ میں ہو گئے اور تفتیش کی آوازیں سننے لگے۔ ہم سب کی تقدیر اس تنہا، ڈرے ہوئے آدمی کے ہاتھ میں تھی۔ ہمیں قطعی اندازہ نہ تھا کہ وہ کیا کرے گا: اس کے مالک کس حد تک اس کی وفاداری پر بھروسا کر سکتے ہیں، یا کہیں وہ کسی پُرانی شکایت کا بدلہ لینے کے لیے ان دونوں کا پتا تو نہیں بتا دے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو دونوں مکانوں کو آگ لگا دی جائے گی۔

وہ مارے دہشت کے ہکلا رہا تھا، مگر ثابت قدم رہا۔ ہاں، اس نے کہا، ہاں، اُس کے مالک سکھ ہیں، مگر وہ شہر سے باہر ہیں؛ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ نہیں، مکان اُن کا نہیں ہے، کسی ہندو کا ہے۔ وہ لوگ کرائے پر رہتے ہیں۔

اس کی باتوں پر بیشتر غنڈوں نے یقین کر لیا، مگر چند ایک مشتبہ نظروں سے اردگرد کے مکانوں کا جائزہ لینے لگے۔ ان میں کچھ ہمارے سامنے کے فولادی گیٹ کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور سلاخوں سے اسے کھٹکھٹانے لگے۔

ہم دونوں آگے بڑھے اور گیٹ پر جا کھڑے ہوئے۔ ڈرائیو وے میں سے چل کر جاتے ہوئے مجھے اپنا نامانوس احساس یاد ہے، جیسے میں بہت دور کسی مقام پر کھڑا خود کو دیکھ رہا ہوں۔

ہم نے گیٹ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور جواب میں چلّانے لگے: جاؤ یہاں سے! یہاں تمھارا کیا کام ہے؟ اُس مکان میں کوئی نہیں ہے! خالی پڑا ہے!

ہمیں حیرت ہوئی کہ وہ لوگ ایک ایک کر کے جانے لگے۔

اس سے لمحہ بھر پہلے، میں نے یہ دیکھنے کے لیے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تھا کہ مسز سین اور ان کے مہمان کیسا وقت گزار رہے ہیں۔ لیمپوں سے روشن ڈرائنگ روم میں غنڈوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں؛ صرف ایک باریک سے پردے نے کمرے کے اندر کے منظر کو ان کی نگاہوں سے چھپا رکھا تھا۔

میں نے ڈرائنگ روم میں جو کچھ دیکھا اس کی یاد اب تک میرے ذہن پر واضح طور پر نقش ہے۔ مسٹر باوا کی پیالی میں چائے انڈیلتی مسز سین کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ان کے برابر میں بیٹھی

Scanned with CamScanner

مسز باوا، مضبوط، مستحکم آواز میں موازنہ کر رہی تھیں کہ گھریلو ملازموں کے معاملے میں نئی دہلی اور منیلا میں کیا فرق ہے۔

میں ان تینوں کے حوصلے پر حیران تھا۔

اگلی صبح میں نے سنا کہ ایک بڑی ریلیف ایجنسی کے وسیع احاطے میں احتجاجی جلسہ کیا جا رہا ہے۔ جب میں وہاں پہنچا تو کارروائی شروع ہو چکی تھی اور وہاں ساٹھ ستّر افراد موجود تھے۔

جلسے کا موڈ غم انگیز تھا۔ کچھ لوگ ان محلّوں کے بارے میں بتا رہے تھے جو انتقام پر آمادہ ہجوموں کے قبضے میں آ گئے تھے۔ انھوں نے بے شمار افراد کے قتل کا -- جن میں سے بیشتر کو زندہ جلایا گیا تھا -- اور بے پناہ تباہی کا تذکرہ کیا: سکھوں کے گردوارے جلائے گئے، سکھوں کے اسکول لُوٹے گئے، سکھوں کے مکان اور دکانیں مسمار کی گئیں۔ تشدد اس سے کہیں زیادہ ہوا تھا جتنا میں نے تصور کیا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ سب سے موثر ابتدائی اقدام یہ ہوگا کہ کسی شدید متاثرہ علاقے میں مارچ کر کے فسادیوں کا روبرو سامنا کیا جائے۔

اجتماع اب تقریباً ڈیڑھ سو مردوں اور عورتوں پر مشتمل تھا جن میں ہندو راہب سوامی اگنی ویش، سائنس داں اور ماہرِ ماحولیات روی چوپڑا، اور حزبِ اختلاف کے چند سیاست داں بھی تھے، مثلاً چندر شیکھر جو کئی برس بعد مختصر سی مدّت کے لیے وزیرِاعظم بھی ہوے۔

گروپ، ایک ایسے شہر کو دیکھتے ہوے جہاں لاکھوں افراد کے ہجوم سیاسی جلسوں کے لیے متواتر اکٹھے کیے جاتے ہیں، قابلِ رحم حد تک مختصر تھا۔ اس کے باوجود اس کے ارکان اپنے پیروں پر اٹھ کھڑے ہوے اور مارچ شروع کر دیا۔

برسوں پہلے میں نے وی ایس نائپال (V S Naipaul) کا لکھا ہوا ایک اقتباس پڑھا تھا جو میرے ذہن میں تب سے بیٹھا ہوا ہے۔ میں اسے دوبارہ کبھی تلاش نہیں کر پایا، اس لیے اس کا مفہوم حافظے کی مدد سے لکھ رہا ہوں۔ اپنی بے نظیر نثر میں نائپال نے ایک مظاہرے کا حال بیان کیا ہے۔ وہ افریقا یا جنوبی امریکا کے کسی مقام پر ایک ہوٹل کے کمرے میں ہیں؛ وہ نیچے نظر ڈالتے ہیں اور لوگوں کو سڑک پر مارچ کرتے ہوے دیکھتے ہیں۔ انھیں تعجب ہوتا ہے کہ یہ منظر ان میں ایک مبہم آرزو جگا دیتا ہے، ایک طرح کی اُداسی؛ وہ باہر نکلنے، جا کر ہجوم میں شامل ہو جانے، اپنی انفرادیت کو اس میں گم کر دینے کی اپنی خواہش سے آشنا ہوتے ہیں۔ لیکن انھیں معلوم ہے کہ وہ ایسا کبھی نہیں کریں گے؛ ان کی فطرت ہی میں نہیں ہے کہ ہجوم میں شامل ہو سکیں۔

میں نے برسوں نائپال کی لکھی ہوئی ہر چیز تلاش کر کر کے پڑھی ہے؛ ان کی تحریروں سے میری طبیعت کبھی سیر نہیں ہوئی۔ میں نے ایسی قریبی، سرزدہ توجہ کے ساتھ انھیں پڑھا ہے جو کوئی شخص اپنے سب سے زیادہ باہنر متکلم کے لیے محفوظ رکھتا ہے۔ انھیں کے باعث میرے لیے پہلی بار خود کو ادیب

تصوّر کرنا ممکن ہوا جو انگریزی میں اپنا اظہار کرسکے۔

مجھے وہ اقتباس یاد آیا، کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ نائپال کی طرح مَیں بھی "شامل ہونے والوں" میں سے نہیں ہوں، اور میرا خیال تھا کہ نائپال کے سفّاک آئینے میں مَیں نے اپنے وجود کے ایک پہلو کو ظاہر ہوتے دیکھ لیا ہے۔ لیکن جس وقت اس مختصر گروپ نے، احاطے کی پناہ سے نکل کر، اپنا مارچ شروع کیا تو مجھے ایک لمحے کو بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ ہوئی: دوسری بار سوچنے کا موقع آنے سے پہلے میں اس گروپ میں شامل ہو گیا۔

مارچ کی پہلی منزل لجپت نگر تھی، جو وہاں سے تقریباً ایک میل دور واقع مصروف تجارتی علاقہ ہے۔ میں اس علاقے سے واقف تھا۔ نئی دہلی کی حدود میں ہوتے ہوئے بھی وہاں کی سڑکیں شہر کے قدیم حصّوں سے مماثلت رکھتی تھیں جہاں چھوٹی چھوٹی، ایک دوسرے میں گھسی ہوئی دکانیں اُبل کر فٹ پاتھوں تک پھیل جانے پر آمادہ رہتی ہیں۔

ہم مارچ کرتے ہوئے نعرے لگا رہے تھے: امن اور بھائی چارے کے وہی پرانے گاندھیائی نعرے جو نصف صدی سے چلے آرہے ہیں۔ تب اچانک ہمارا سامنا ایک چونکا دینے کی حد تک مانوس منظر سے ہوا، بیسویں صدی کے ایک بھیانک شہری (urban) منظر سے: جلی ہوئی گاڑیاں جن کی ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں میں سے اندر کا لُٹا پٹا سامان دکھائی دے رہا تھا؛ ملبہ اور تباہ شدہ چیزیں ہر طرف تھیں۔ سڑک کے دونوں کناروں پر برتن جل کر سیاہ ہوئے پڑے تھے۔ ایک سنیما کو آگ لگادی گئی تھی اور فلمی ستاروں کے جھُلسے ہوئے چہرے آدھے جلے پوسٹروں میں سے باہر گھور رہے تھے۔

اب جب میں اُس مارچ کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرا حافظہ جواب دے جاتا ہے، تفصیلات گڈمڈ ہونے لگتی ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں میں نے فون پر کچھ ایسے دوستوں سے بات کی جو وہاں موجود تھے۔ اُن سب کی یادیں صرف ایک اعتبار سے میری یاد سے مشابہت رکھتی ہیں: ان کے ذہنوں میں بھی منظر کی کوئی ایک تفصیل اٹک کر رہ گئی ہے جس نے باقی تمام تفصیلوں کو دھندلا دیا ہے۔

جس منظر کو میری یادداشت نے محفوظ رکھا ہے وہ اُس لمحے کا ہے جب یہ ناگزیر معلوم ہو رہا تھا کہ ہم پر حملہ کیا جائے گا۔

ایک موڑ مڑتے ہوئے ہم نے خود کو ایک ایسے ہجوم کے مقابل پایا جو اس سے پہلے ہمارے سامنے آنے والے کسی بھی ہجوم سے زیادہ بڑا تھا اور کہیں زیادہ پُرعزم دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے پہلے اس طرح کے ہر موقعے پر ہم نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ مارچ کرتے ہوئے ہجوم کے بالکل قریب پہنچ کر انھیں بحث میں اُلجھا لیتے جو بہت جلد چیخنے چلّانے کے ایک طویل مقابلے میں بدل جاتی۔ اور اس سے پہلے ہر موقعے پر ہم نے ہجوم کو مغلوب کرکے کامیابی حاصل کی تھی۔ مگر یہ ہجوم محاذ آرائی پر تلا ہوا تھا۔ جب وہ لوگ چاقو اور سلاخیں لہراتے ہوئے ہماری طرف بڑھے تو ہم رک گئے۔ جوں جوں ہجوم ہمارے نزدیک آتا گیا ہمارے نعروں کی آوازیں اور اونچی ہوتی گئیں: ہم پر ایک طرح کی بےخودی چھا گئی، کسی کلائمکس کے

قریب پہنچ جانے کی سی سرخوشی۔ ہم حملے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو کر آگے کو جھک گئے جیسے سامنے سے کوئی تیز آندھی آرہی ہو۔

اور تب ایک ایسی بات ہوئی جسے میں آج تک پوری طرح سمجھ نہیں پایا ہوں۔ کسی کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا؛ کسی نے کوئی اشارہ نہیں دیا، نہ ہمارے نعروں کی تال میں کوئی خفیف سا بھی فرق آیا۔ لیکن اچانک ہمارے گروپ میں شامل تمام عورتیں -- جو گروپ میں شامل افراد کی نصف تعداد سے زیادہ تھیں -- مردوں کے درمیان سے نکل کر سامنے آگئیں اور انھیں اپنے گھیرے میں لے لیا؛ اُن کی ساریاں اور قمیصیں ایک باریک، سرسراتی ہوئی رکاوٹ کی شکل میں ڈھل گئیں، انھوں نے ہمارے گرد ایک دیوار کھینچ دی۔ پھر وہ حملہ کرنے کی غرض سے بڑھتے ہوئے مردوں کے مقابلے کے لیے مڑیں اور انھیں چیلنج کیا کہ ہمت ہو تو آگے بڑھیں۔

غنڈوں نے چند اَور قدم ہماری طرف بڑھائے، اور پھر ان کی ہمت جواب دے گئی، اُن کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک لمحے بعد وہ فرار ہو چکے تھے۔

مارچ اُسی احاطے میں پہنچ کر ختم ہوا جہاں سے شروع ہوا تھا۔ اگلے چند گھنٹوں میں ایک تنظیم قائم کی گئی: ناگرک ایکتا منچ، یا شہری اتحاد محاذ، اور اگلی صبح اس کا کام شروع ہو گیا: زخمیوں اور بےسہاروں کی امداد، بےگھروں کی آبادکاری کا کام۔ خوراک اور کپڑوں کی ضرورت تھی اور ہزاروں ایسے لوگوں کے رہنے کے لیے کیمپ قائم کیے جانے تھے جن کے سر پر چھت نہیں رہی تھی۔ اس کا اگلا دن آنے تک ہم موصول ہونے والے سامان میں، لغوی طور پر، دب چکے تھے۔ وسیع و عریض احاطہ گاڑیوں بھر کمبلوں، استعمال شدہ کپڑوں، جوتوں اور آٹے، شکر اور چائے کی بوریوں سے اثاث بھر گیا تھا۔ تاجروں نے، جو اس سے پہلے نہایت نک چڑھے اور غیرجذباتی تھے، کاریں اور ٹرک بھجوائے۔ میدان میں چلنے پھرنے تک کی جگہ نہ رہی۔

محاذ کے کام میں میرا اپنا حصہ بہت معمولی تھا۔ میں نے چند ہفتے دہلی یونیورسٹی کی ایک ٹیم کے ساتھ مل کر غریب اور مزدور لوگوں کی بستیوں میں، جو فسادات سے سب سے بُری طرح متاثر ہوئی تھیں، امدادی سامان تقسیم کرنے کا کام کیا۔ پھر میں اپنی ڈیسک پر لوٹ آیا۔

محاذ کے بیشتر ارکان وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، ناگزیر طور پر، اپنی اپنی روزمرّہ زندگی کی طرف لوٹ گئے۔ لیکن کچھ ارکان -- جن میں نمایاں ترین وہ عورتیں تھیں جنھوں نے پناہ گزینوں کے کیمپوں کا انتظام سنبھال رکھا تھا -- بےگھر سکھ عورتوں اور بچوں کے ساتھ برسوں تک کام میں مصروف رہے۔ جیا جیٹلی، لِتا رامداس، وِینا داس، بیتا بوس، رادھا کمار: ان عورتوں نے، جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے میدان میں ممتاز مقام رکھتی تھی، اپنے وقت میں سے کئی سال اس عظیم نقصان کی تلافی کرتے ہوئے گزارے جو محض دو یا تین دن میں پیش آیا تھا۔

Scanned with CamScanner

محاذ نے فسادات کی تحقیقات کرنے کے مقصد سے ایک ٹیم بھی تشکیل دی۔ میں نے اس میں شامل ہونے پر کچھ دیر غور بھی کیا، مگر پھر فیصلہ کیا کہ تحقیقات کرنے سے سوائے وقت ضائع کرنے کے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو گا کیوں کہ سیاست داں، جو تشدد کو اکسانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، حساس شہریوں کے ایک مختصر سے گروپ کی بات پر کان نہیں دھریں گے۔

میرا خیال غلط تھا۔ اس تحقیقاتی ٹیم نے آخرکار ایک چھوٹی سی کتاب تیار کی -- ایک مختصر پمفلٹ جس کا عنوان تھا: "مجرم کون ہیں؟" -- جسے اب کلاسیک کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ یہ دستاویز ان سیاست دانوں کے خلاف ایک سخت فردِ جرم ہے جنھوں نے فسادات کو ہوا دی تھی، اور پولیس کے خلاف بھی جس نے فسادیوں کی کارروائی میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔

برسوں کے عرصے میں ہندوستانی حکومت نے ۱۹۸۴ کے فسادات کے بعض متاثرین کو معاوضہ ادا کیا ہے اور کچھ بے گھروں کو آباد کیا ہے۔ مگر سرکاری اقدام میں ایک خلا آج تک موجود ہے: فسادات کو بھڑکانے والے کسی ایک بھی شخص کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ لیکن حکومت پر دباو مسلسل برقرار رہا ہے، اور اس دباو میں اضافہ ہوا ہے: ہر سال اس مختصر دستاویز کی ٹھونکی ہوئی کیلیں کچھ اور گہرائی تک اتر جاتی ہیں۔

یہ پمفلٹ اور اس کے بعد شائع ہونے والی دوسری دستاویزات اُن لوگوں کے لیے موجود واحد ممکن انسانی راستے کی شہادت دیتی ہیں جو کئی نسلی گروہوں، کئی مذہبوں کے ماننے والوں پر مشتمل معاشرے میں رہتے ہیں، جیسے معاشرے اس برصغیر میں موجود ہیں۔ "مجرم کون ہیں؟" جیسی انسانی حقوق کی دستاویزیں شہری (civil) اداروں کو وسیع بنیادوں پر قائم کرنے کے عمل کے لیے لازمی ہیں: یہی وہ ہتھیار ہیں جن کے ذریعے سے معاشرہ ایک ایسی ریاست کے خلاف اپنے عزم کا اظہار کرتا ہے جو مجرمانہ طور پر بے قابو ہو گئی ہو، جیسے ہندوستانی ریاست نومبر ۱۹۸۴ کے دہلی شہر میں ہو گئی تھی۔

یہ بات دل کو تقویت دینے والی ہے کہ پنجاب میں آج ہوش مندی کو غلبہ حاصل ہے۔ لیکن دوسری جگہوں پر نہیں۔ بمبئی میں بلدیاتی حکومت کے اہلکار کسی عوامی عمارت پر سبز روغن کرنے کی ممانعت کر رہے ہیں -- کیوں کہ اس رنگ کا تعلق مسلمانوں کے مذہب سے جوڑا جاتا ہے۔ اور شہر کی نچلے طبقے کی آبادیوں (slums) سے سیکڑوں مسلمانوں کو شہر بدر کر دیا گیا ہے -- کم سے کم ایک ایسے واقعے کا جواز محض یہ تھا کہ وہ لوگ ایک بنگالی اخبار پڑھنے کا جُرم کر رہے تھے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ حکومتیں ایسے لوگوں کو سزا سے نہ بچنے دیں جو ہجوم کے تشدد کو اکساتے ہیں۔

بوسنیائی ادیب جواد قراحسن (Dzevad Karahasan) نے، اپنے ایک شاندار مضمون میں، جس کا عنوان "ادب اور جنگ" ہے اور جو پچھلے برس شائع ہونے والے اُن کے مجموعے "سرائیوو: ایک شہر کی جلاوطنی" (*Sarajevo, Exodus of a City*) میں شامل ہے، جدید ادبی جمالیات

پرستی (aestheticism) اور تشدد کے معاملے میں معاصر دنیا کی بے حسی کے درمیان ایک حیران کن تعلق دریافت کیا ہے: "بلا استثنا ہر شے کا ادراک کسی جمالیاتی مظہر کے طور پر کرنے -- اور خیر اور سچائی سے متعلق ہر سوال کو مکمل طور پر نظر انداز کر دینے -- کا فیصلہ ایک فنکارانہ فیصلہ ہے۔ یہ فیصلہ آرٹ کی دنیا میں پیدا ہوا تھا اور بڑھتے بڑھتے معاصر دنیا کی خصوصیت بن گیا ہے۔"

جب نومبر ۱۹۸۴ میں مَیں اپنی ڈیسک پر واپس گیا تو میں نے خود کو لکھنے سے متعلق کچھ ایسے فیصلوں سے دوچار پایا جن سے میرا سامنا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا اُس کے بارے میں کس طرح لکھوں کہ یہ گھٹ کر محض ایک نظارے (spectacle) میں نہ بدل جائے؟ میرے تجربات کا میرے اگلے ناول پر اثر انداز ہونا لازمی تھا، مگر مجھے کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی کہ اُن واقعات کے بارے میں براہِ راست اس طرح کیوں کر لکھوں کہ وہ تشدد کے ایک ہمہ گیر منظر کی تخلیق نو -- یا، قراحسن کے لفظوں میں، "جمالیاتی مظہر" -- نہ بن جائیں۔ اُس وقت یہ خیال مجھے فضول اور بے مصرف معلوم ہوتا تھا؛ تشدد کا نشانہ بننے والوں کی شہادتوں کا مبنی بر حقیقت بیان اس سے کہیں زیادہ اہم تھا۔ لیکن یہ کام اُن لوگوں کے ہاتھوں پہلے ہی انجام پا رہا تھا جو، میں جانتا تھا، اس کی صلاحیت مجھ سے کہیں زیادہ رکھتے ہیں۔

چند مہینوں کے اندر اندر میں نے اپنا ناول لکھنا شروع کر دیا، جس کا نام آخرکار *The Shadow Lines* رکھا -- یہ کتاب مجھے وقت میں پیچھے کی طرف لے گئی، فسادات کے بارے میں میری اوّلیں یادوں کی طرف، جب میں نے اپنے بچپن میں ان کا مشاہدہ کیا تھا۔ یہ ایک ایسی کتاب بن گئی جو کسی ایک مخصوص واقعے کے بارے میں نہیں، بلکہ ایسے واقعات کے مفہوم اور ان واقعات سے گزرنے والے افراد کی زندگیوں پر ان کے اثرات کے بارے میں تھی۔

اور جن واقعات کا مشاہدہ میں نے ۱۹۸۴ کے نومبر میں کیا تھا اُن کے بارے میں مَیں نے درحقیقت آج تک کچھ نہیں لکھا۔ اس معاملے میں مَیں اکیلا نہیں ہوں: اُس مارچ میں حصہ لینے والے کئی افراد ایسے ہیں جن کی کتابیں شائع ہوئیں لیکن، جہاں تک مجھے معلوم ہے، کسی ایک شخص نے بھی، سرسری انداز میں ذکر آ جانے کو چھوڑ کر، ان واقعات کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

اس کی بڑی معقول وجوہ موجود ہیں، اور اُس صورت حال کا سیاسی پہلو ان میں سب سے کم اہم ہرگز نہیں جس کی موجودگی کے باعث لکھنے والے کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ اُن فسادات کو تشدد کے ایک سلسلے نے جنم دیا تھا، جس میں ایک جانب پنجاب کے دہشت گرد، اور دوسری جانب ہندوستانی حکومت دونوں ملوث تھے۔ اس موضوع پر بے احتیاطی سے لکھنا، یا اس طرح لکھنا کہ اس سے دہشت گردی یا جابرانہ اقدامات کی حمایت کا پہلو نکلتا ہو، بڑی آسانی سے مسئلے کی پیچیدگی میں اضافہ کر سکتا تھا: اُن آتش گیر حالات میں لفظوں کی قیمت انسانی جانیں بھی ہو سکتی تھیں، اور یہ بات بالکل مناسب ہے کہ وہ لوگ جو لفظوں سے سروکار رکھتے ہیں اپنے قلم یا زبان سے نکلنے والے الفاظ پر بڑی احتیاط سے توجہ

Scanned with CamScanner

دیں- اور یہ بات بھی بالکل مناسب ہے کہ وہ خود کو کچھ کہنے سے معذور پائیں-
لیکن اس کی ایک سادہ تر وضاحت بھی موجود ہے- اس سے پہلے کہ میں کاغذ پر ایک لفظ لکھ سکتا، مجھے ایک الجھاوے کو اپنے ذہن میں سلجھانا تھا: ادیب اور شہری کے طور پر میری دو حیثیتیں آپس میں گڈمڈ تھیں- ادیب کی حیثیت سے میرے سامنے ایک واضح موضوع تھا: تشدد- اخباری رپورٹوں سے، یا جدید ترین فلم یا ناول سے، ہم خوں ریز تفصیلات یا نہایت خوش اسلوبی سے اسٹیج کی ہوئی آتش زنی کی توقع کرنے لگے ہیں جو کسی باب کے اختتام پر، یا کلائمکس کے مقام پر، پُراثر انداز میں واقع ہو- لیکن یہ سوال بہت بامعنی ہے کہ اس موضوع -- تشدد -- کا اس قدر واضح ہونا کہیں اظہار کی بابت ہمارے جدید اصولوں کی بنا پر تو نہیں ہے: ہمارے زمانے کی غالب جمالیات کی حدوں میں -- جسے قراحسن نے "بے حسی کی جمالیات" کا نام دیا ہے -- تشدد کو ہیبت ناک نظارے کے طور پر پیش کرنا بے حد آسان ہو گیا ہے، اور تشدد کی مزاحمت کو اتنی ہی آسانی سے نراجذباتی، یا اس سے بھی بری بات کہنی ہو تو قابلِ رحم یا لغو، ردِ عمل قرار دے دیا جاتا ہے-
ادیب ہجوموں میں شامل نہیں ہوتے -- نائپال اور متعدد دوسرے ادیب ہمیں یہی سکھاتے ہیں- لیکن جب آئینی حاکمیت اپنی ذمے داری پوری نہ کر رہی ہو تب کیا کیا جائے؟ تب آپ شامل ہو جاتے ہیں، اور شامل ہونے کے عمل سے وابستہ تمام ذمے داریوں، تمام فرائض اور تمام تر احساسِ جرم کو قبول کر لیتے ہیں- تشدد کی بابت میرا تجربہ نہایت غالب اور یادگار طور پر تشدد کی مزاحمت پر مبنی تھا- جب میں غنڈوں کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتی اُن عورتوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ خیال مجھ میں ادیبوں کی سی سحرزدگی نہیں پیدا کرتا- مجھے جسمانی ضرر سے بچا لیے جانے پر اپنی ممنونیت یاد آتی ہے- جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا -- صرف اُس مارچ میں نہیں بلکہ بس میں بھی، ہَری کے گھر میں بھی، ضرورت کی چیزوں سے بھرے احاطے میں بھی -- وہ تشدد کی ہولناکی نہیں بلکہ انسانیت کا اقرار تھا: ان میں سے ہر موقعے پر میں نے اُس خطرے کا مشاہدہ کیا جو نہایت عام لوگ ایک دوسرے کی خاطر مول لینے کو تیار تھے-

اب میں جب کبھی دنیا کے پُرآشوب خطوں کا احوال پڑھتا ہوں، جس کی رو سے تشدد نہایت بنیادی اور ناگزیر حقیقت معلوم ہوتا ہے، ایک ایسی تقدیر جس سے لوگوں کی کثیر آبادیوں نے سمجھوتا کر لیا ہے، تو میں خود کو یہ سوال کرتے ہوئے پاتا ہوں: کیا بات محض اتنی ہی ہے؟ یا یہ بھی ممکن ہے کہ ان احوال کے مصنّف کوئی ایسی ہیئت -- یا ایسا اسلوب یا ایسی آواز یا ایسا پلاٹ -- پانے میں ناکام رہے ہوں جو بیک وقت تشدد، اور تشدد کی مہذّب اور دانستہ مزاحمت، دونوں کا اظہار کر سکے؟
سچ یہ ہے کہ تشدد کا سب سے عام ردِ عمل ناگواری کا ہوتا ہے، اور یہ کہ دنیا میں ہر جگہ، خاصی نمایاں تعداد میں لوگ، جس طرح اُن سے بن پڑے، تشدد کی مزاحمت کی کوشش کرتے ہیں- یہ کوششیں تشدد کے تذکروں میں شاذونادر ہی جگہ پاتی ہیں، اور اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے: یہ کوششیں بہت

Scanned with CamScanner

غیر ڈرامائی ہوتی ہیں۔ ان کوششوں میں حصّہ لینے والوں کے لیے ان کے بارے میں لکھنا اکثر دشوار ہوتا ہے، اور اس دشواری کی وجوہ وہی ہیں جنھوں نے ۱۹۸۴ کے بارے میں میری اپنی تحریر کو اتنے عرصے تک ملتوی کیے رکھا۔

''ہمیں خود کو فریب نہیں دینا چاہیے،'' قرا حسن نے لکھا ہے۔ ''دنیا پہلے تحریر میں رونما ہوتی ہے --مقدس کتابیں بتاتی ہیں کہ دنیا کو لفظوں میں تخلیق کیا گیا تھا-- اور جو کچھ پیش آتا ہے وہ پہلے زبان کے اندر پیش آتا ہے۔''

جب ہم اُس دنیا کا تصوّر کرتے ہیں جسے بے حسی کی جمالیات پیدا کرنے پر قادر ہے، تبھی ہم اُن کہانیوں کو یاد رکھنے کی بے پایاں اہمیت کو پہچان پاتے ہیں جنھیں ہم نے اب تک نہیں لکھا۔

**

Scanned with CamScanner

ایوانِ کِلیما

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

آزادی اور کوڑا کرکٹ

کسی مطلق العنان حکومت کے سلسلے میں کلچر کا ذکر کرنا ہی بظاہر قولِ محال (paradox) سا معلوم ہو گا۔ آدمی کو خیال ہو گا کہ دانشورانہ بنجرپن، نظریہ پرستی، سنسرشپ، تعلیمی نظام کے مرکزی کنٹرول، اور کلیسا کی زندگی اور فنون پر عائد پابندیوں نے کلچر کے لیے جگہ ہی کہاں چھوڑی ہو گی۔ مگر حقیقت بہرحال یہ ہے کہ معاملہ ایسا سیدھا سادہ نہیں تھا۔ کتابیں شائع ہوتی تھیں، ٹیلی وژن پروگرام نشر کیے جاتے تھے اور، بدترین حالات میں بھی، وہ سب کی سب کتابیں اور ٹی وی پروگرام کراہت انگیز نہیں ہوتے تھے۔ پراگ ٹیلی وژن کلاسیکی ڈراموں کی شاندار پیش کشیں، فطرت کے موضوع پر فلمیں، بچوں کے لیے ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویروں پر مبنی اینی میٹڈ (animated) فلمیں وغیرہ نشر کرتا تھا۔ نمائشیں ہوتی تھیں اور تھیئٹر تماشائیوں سے بھرے رہا کرتے تھے۔ کتابوں کا بازار محدود تھا، صرف گنی چنی کتابیں دستیاب تھیں، اور یہی بات تھیئٹروں اور سنیماگھروں کے ذخیروں، بلکہ خود سرکاری سفری ایجنسیوں کی جانب سے کرائے جانے والے سفری دوروں کے بارے میں بھی درست ہے۔ دوسری جانب یہ بھی حقیقت ہے کہ کتابوں اور ثقافتی تقریبوں کے ٹکٹ کم قیمت تھے کیوں کہ کلچر کی جو بات جائز سمجھی جاتی تھی اسے بھاری مالی امداد ملتی تھی۔ جو کچھ اخباروں میں لکھا جاتا یا ریڈیو یا ٹیلی وژن سے نشر ہوتا وہ، بلاشبہ دانستہ دروغ گوئی پر مبنی تھا، بلکہ دروغ گوئی نے، بچوں کو دی جانے والی تعلیم سے لے کر انتخابات کے عمل تک، زندگی کے بہت سے پہلوؤں میں جگہ حاصل کر لی تھی۔

سنسرشپ کو وسیع ترین بنیادوں پر نافذ کیا جاتا تھا: یہ ایک طرف لوگوں کو ہر اُس چیز سے لاعلم رکھتی تھی جو نظریاتی طور پر مشتبہ ہو، نئی ہو، یا توازن کو درہم برہم کرنے کا امکان رکھتی ہو، اور دوسری

طرف انہیں بدترین قسم کے کوڑے کرکٹ سے بھی محفوظ رکھتی تھی۔ پورنوگرافی یا کچ روی اور کشت و خون سے بھری فلمیں، جن کا سیلاب آزاد ملکوں میں موجود تھا، یہاں سرحدوں سے وڈیو کیسٹوں کی شکل میں اسمگل ضرور کی جا سکتی تھیں مگر انہیں وسیع تر ذرائع ابلاغ تک رسائی نہیں ملتی تھی۔ فن کا کوئی ایسا مظاہرہ جس میں فنکار حاضرین کی آنکھوں کے سامنے ایک بھیڑ ذبح کرے اور پھر اس کے خون اور انتڑیوں سے کوئی فن پارہ تخلیق کرے، تصوّر سے باہر کی بات تھی۔

نام نہاد سوشلسٹ دور کے کلچر کے بارے میں سوچتے ہوئے ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اکثر لوگ حقیقی قدر رکھنے والی چیزوں کی، تبدیلی کی، یا بلکہ نئے پن کی بھی شدید خواہش نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جدید زندگی میں تبدیلی کی تیز رفتار کے باعث قدامت پسندی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور اس خیال کو سہارا ملتا ہے کہ آرٹ کو برہم اور مشتعل کرنے کے بجائے تفریح بہم پہنچانی چاہیے۔ اس نقطۂ نظر سے، آمرانہ نظام کی ثقافتی پالیسیاں، کم از کم ایک حد تک، اوسط فرد کے ذوق اور رایوں سے مطابقت رکھتی تھیں، اور اگر کوئی کمی تھی تو محض یہ کہ وہ اس اوسط درجے کے ذوق کی پوری طرح تسکین نہیں کر پاتی تھیں، ضرورت سے زیادہ نصیحت آمیز تھیں، اور اس بنیادی شرط کو ترک نہیں کرتی تھیں کہ آرٹ کو سب سے پہلے تعلیم کا ذریعہ ہونا چاہیے، یعنی سیاسی نظام کی خدمت کرنی چاہیے۔

آمرانہ نظام نے اپنا مخصوص طرزِ زندگی، اقدار کا اپنا حفظِ مراتب پیدا کیا تھا، جس سے میری مراد اُن اقدار سے نہیں جن کا دعویٰ کیا جاتا تھا بلکہ اس نظام کی حقیقی اقدار سے ہے۔ پہلی نظر میں آمریت کے تحت زندگی بہت سی باتوں میں مغربی معاشروں سے مشابہ معلوم ہوتی تھی: اس کا بھی مقصد محدود قسم کی صارفیت (consumerism) پیدا کرنا تھا: اس میں کھیلوں کے ہیرو، مقبولِ عام گلوکار اور ہاکی کی پسندیدہ ٹیمیں بھی موجود تھیں۔ یہ زندگی جن اقدار کو جنم دیتی تھی ان میں وفاداری، تابعداری، نپی تلی رجائیت، نظم و ضبط، کام کی بابت مثبت رویّہ، اور مساوات شامل تھیں۔ سرکاری طور پر نسل پرستی، قوم پرستی اور نوآبادیت کو مسترد کیا جاتا تھا: سرکاری طور پر غریبوں، مظلوموں، اور غیر سفید لوگوں سے یکجہتی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یہ نظام لوگوں میں کاروباری ذوق و شوق، ضرورت سے زائد دولت، تنقید اور کسی بھی قسم کے گہرے غور و فکر کی بابت ایک طرح کی معاندت پیدا کرتا تھا، جس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ نظام تخلیقی دانش وروں سے عناد رکھتا تھا خصوصاً ان سے جن کا تعلق فنون کے شعبے سے ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نظام روزگار اور اُجرت کی ضمانت دیتا تھا (اور یہ اُجرت اُن کاموں پر بھی دی جاتی تھی جو حقیقی معنوں میں کام نہیں بلکہ کام کا سوانگ ہوا کرتے تھے)، مفت تعلیم کی ضمانت دیتا تھا (جو، خواہ نظام اسے کتنا ہی قابو میں رکھنے کی کوشش کرے، کبھی کبھی واقعی تعلیم ہوتی تھی)، اور مفت طبی سہولتوں کی بھی ضمانت دیتا تھا، جن کا معیار خواہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پست ہوتا چلا گیا ہو، مگر اس کے باوجود وہ سماجی تحفظ کے مجموعی نظام کا حصہ رہیں۔

پولیس اسٹیٹ ہر شہری کی نقل و حرکت کو کنٹرول کرتی اور، خاردار تاروں کی مدد سے، ملک کی

سرحدوں کی حفاظت کرتی تھی۔ اگرچہ اس کا مطلب اکثر صورتوں میں نفیس شہریوں کو اندر قید رکھنا ہوتا تھا، لیکن ساتھ ساتھ بین الاقوامی جرائم کی بدترین شکلوں کو اندر آنے سے روکنا بھی تھا۔ یہ علم لوگوں کے شعور میں پوری طرح جڑپکڑ چکا تھا کہ ریاست اُن کی دیکھ بھال کر رہی ہے، بلکہ یہ بھی کہ یہ ریاست کا فرض ہے، اور کوئی اوسط درجے کا شہری خود کو مقابلتاً اس سے کچھ زیادہ محفوظ خیال کر سکتا تھا جتنا آج ایک جمہوری معاشرے میں کر سکتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ لوگوں نے کس طرح اُس نظام اور اس سے پیدا شدہ کلچر سے بغاوت کی، غیر شعوری طور پر انھوں نے اس کے بہت سے پہلوؤں کو تسلیم کر لیا تھا اور، میں تو یہاں تک کہوں گا، اگرچہ قدرے سادہ بیانی کے ساتھ، کہ اس نظام کے تحت زندگی بسر کرنے والے لوگوں نے اپنے اندر دانستہ طور پر ایسی خصوصیات پیدا کر لی تھیں جو آزاد حالات میں پروان چڑھنے والے لوگوں کی خصوصیات سے مختلف تھیں۔

جو لوگ اس طرزِ زندگی کو قبول کرنے سے انکار کرتے، یعنی جو اس نظام کی دروغ گوئی اور منافقت کے پردے کے پار دیکھ لیتے، اُن کے ساتھ اکثر سختی کا برتاو کیا جاتا تھا۔ انھیں مادی طور پر نقصان اٹھانا پڑتا، لیکن شاید اس سے بھی بڑھ کر انھیں ذہنی اور روحانی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتیں: آزادی سے محرومی، اطلاعات سے محرومی، قسم قسم کی پابندیاں جو ان کی زندگی کی قریب قریب ہر سطح کو متاثر کرتی تھیں۔ اس حقیقت کا احساس کرنے پر کہ وہ آزاد دنیا سے کٹے ہوئے ہیں -- جو فاصلے سے دیکھنے کے باعث غلو آمیز حد تک دلکش رنگوں میں نہائی دکھائی دیتی اور غیر محدود امکانات، بےپناہ افراط اور مکمل آزادی کی دنیا معلوم ہوتی تھی -- وہ لوگ طیش میں آجاتے اور انھیں محسوس ہوتا کہ ان کی زندگیوں کا کوئی مستقبل نہیں ہے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس پورے سماجی نظام ہی کا، جس میں وہ رہ رہے ہیں، کوئی مستقبل نہیں ہے۔

اس قسم کی ذہنی صورتِ حال سے محض آمریت کے خلاف حقارت ہی پیدا نہیں ہوتی تھی؛ اس سے یہ خیال بھی جنم لیتا تھا کہ ایک آزاد معاشرہ (آمریت کے اس پروپیگنڈے کے باوجود جس کا مقصد انھیں اس کے برعکس یقین دلانا تھا) تمام انسانی مسائل کو حل کرنے پر قادر ہے، کہ ایسا معاشرہ تمام سماجی اور ذاتی معاملات کے خوش اسلوبی سے ترتیب پا جانے کا مکمل نمونہ ہے۔ ریاست ہاے متحدہ امریکا، جو اس خوش اسلوب ترتیب کی علامت تھا، اس انسانی تکمیل کا بھی نمونہ بن گیا۔ صارفانہ زندگی کی جبلی اقدار سے خبرداری اور ماس کلچر کے سیلاب کی مزاحمت، جو یوروپ کے آزاد حصے کی ثقافتی زندگی کے عمومی اجزا ہیں، کم سے کم الفاظ میں بھی کہا جائے تو، یوروپ کے غیر آزاد حصے کی ثقافتی آب و ہوا میں مفقود تھے۔ سابقہ آہنی پردے کے مشرق میں آباد بیشتر لوگ ۱۹۸۹ کے بعد آزادتر حالات میں یوں داخل ہوئے کہ ان کی ثقافتی تیاری ناپید تھی، کھلے بازار پر مبنی معاشرت اور اس کے ماس کلچر میں پوشیدہ مستقل بیماریوں کے جراثیم (جو انسان کی پیدا کردہ ہر صورتِ حال میں مضمر ہوتے ہیں) کی مدافعت کے لیے مثبت جراثیم ان کے اجسام میں موجود نہیں تھے۔

Scanned with CamScanner

انقلاب کے بعد کے پہلے چند مہینوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب سے بڑھ کر اُن چیزوں کو عروج نصیب ہو رہا ہے جنھیں سابق آمریت نے ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ مثال کے طور پر ادب میں اختلافِ رائے رکھنے والوں (dissidents) کی تحریریں اور کثیر تعداد میں بکنے والے مغربی مصنفین (مثلاً جے ایم سمل یا اسٹیفن کنگ)، یا ویسٹرن یا ایکشن اسٹوری کی تکرار پر مبنی خالص غلاظت، دونوں قسم کی مطبوعات فوری طور پر مقبول ہو گئیں۔ تھیئٹر کی مقبول ہونے والی چیزوں میں بیکٹ یا یونسکو کی تخلیقات بھی تھیں اور *Les Miserables* کے میوزیکل روپ جیسے ڈرامے بھی۔ لوگ محض تجسس کے زیرِاثر تھے۔ واکلاو ہاویل (Vaclav Havel) کی پہلی کتاب خریدنے کے خواہش مند لوگوں کی قطار ایک کلومیٹر لمبی تھی۔ ڈیڑھ کروڑ کی آبادی کے ملک میں اختلاف رائے رکھنے والے ادیبوں کی تحریریں ایک ایک لاکھ کے ایڈیشنوں میں شائع ہوئیں۔ لیکن بہت جلد بیکٹ آدھے خالی تھیئٹروں کے ذخیروں سے غائب ہو گیا اور مشہور ترین ملکی ادیبوں کی تحریروں کے ایڈیشن بھی گھٹ کر ہزاروں کی تعداد پر پہنچ گئے۔ اس کے برعکس کوڑے کرکٹ نے کلچر کے تمام مظاہر میں اپنا فاتحانہ مارچ شروع کر دیا۔ تجسس کی تسکین ہو چکی تھی، اور اوسط درجے کا ذوق، جسے اب کسی قسم کی ہدایت یا رہنمائی حاصل نہیں تھی، پیش منظر پر اُبھر آیا تھا۔

ان انقلابی تبدیلیوں نے کلچر کے تمام پہلوؤں کو متاثر کیا، جن میں نظامِ اقدار بھی شامل تھا۔ کل جو کچھ درست سمجھا جاتا تھا، آج اس میں سے کوئی شے بھی درست نہیں رہی، اور جو کچھ ناخوب تھا وہ آج خوب ہو گیا۔ اگرچہ اکثر لوگ اس تبدیلی کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ہر شخص اس سے مطابقت پیدا کرنے کا اہل نہیں ہے، اور معاشرے کی تمام سطحوں کو ایک قسم کے ثقافتی صدمے نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔

وہ لوگ جو سابقہ نظام کی سادہ ترتیب اور خیالات کے عادی ہیں (اور بہرحال لوگوں میں نعروں اور سادہ حلوں کے اثر میں آ جانے کا رجحان ہمیشہ زیادہ قوی ہوتا ہے) اکثر غیر شعوری طور پر پرانے نظریوں کے متبادل تلاش کرتے ہیں، نئے توہمات کی جستجو کرنے لگتے ہیں جو موجودہ صورت حال کی افراتفری کی دھند صاف کر سکیں۔ ایسا ہی ایک مقبولِ عام واہمہ یہ ہے کہ کھلے بازار کی معاشرت تمام بنیادی مسئلوں کو آپ ہی آپ حل کر لے گی۔ میں معاشیات کے علم میں درک نہیں رکھتا اور نہیں کہہ سکتا کہ معاشی میدان میں یہ دعویٰ کس حد تک معقول ہے، لیکن یہ جانتا ہوں کہ کلچر کے میدان میں یہ بات کچھ زیادہ درست نہیں ہے۔

ہمارے ملک میں آنے والی یہ تبدیلیاں، قابلِ لحاظ حد تک، دانش وروں کی کوششوں کا نتیجہ تھیں، مگر خود فنکاروں نے بھی ان تبدیلیوں میں اہم کردار ادا کیا۔ ان سب کو آج وہ کچھ حاصل ہے جسے کسی بھی تخلیقی سرگرمی میں سب سے اہم سمجھا جا سکتا ہے، یعنی مکمل آزادی۔ اس کے باوجود ان میں بہت سے افراد، اور ان کے ساتھ ثقافتی طور پر بیدار عام لوگ بھی، حالیہ تبدیلیوں سے مایوسی نہیں تو کم سے کم بے اطمینانی ضرور محسوس کر رہے ہیں۔

Scanned with CamScanner

بہت سے غیر مفاہمت پسند (non-conformist) فنکار، حکومت کی جانب سے زیادتیوں کا نشانہ بننے کے باوجود، تعلیم یافتہ عوام کی جانب سے غیر معمولی احترام کے عادی ہو چکے تھے۔ انھیں عوام کا ترجمان سمجھا جاتا تھا، اور اکثر صرف وہی ان باتوں کا اظہار کرتے تھے جو دوسرے لوگ سوچتے تو تھے لیکن کہنے کی ہمّت نہ رکھتے تھے۔ انقلاب کے بعد یہ خاصا مراعات یافتہ مقام غائب ہو گیا۔ اب معاشرے کے بارے میں حقائق کا اظہار کرنے کے لیے غیر معمولی جرأت درکار نہیں ہے، اور عوام کے سابق ترجمان اب وہی کچھ ہو چکے ہیں جو فنکار آزاد دنیا کے ہر حصّے میں ہوتے ہیں: یعنی فقط فنکار۔

سابق آمریت کے دور میں بیش تر فنکار -- حتیٰ کہ مفاہمت پسند فنکار بھی -- اس قسم کا خواب دیکھا کرتے تھے کہ اگر کبھی انھیں آزادی نصیب ہوئی تو وہ کیا کیا کارنامے انجام دیں گے۔ اداکار، فلم ڈائرکٹر، ادیب، ممکنہ ناشر، فلم ساز اور ٹیلی وژن کے کارکن، سب کا یہی خواب تھا۔ یہ اُس "تیسرے راستے" کے تصوّر کا ایک پہلو تھا جسے بڑے مبہم انداز میں بیان کیا جاتا تھا: کہ آمریت کے خاتمے کے بعد ریاست آرٹ کی سرپرستی جاری رکھے گی، مگر اس کے ساتھ ساتھ آرٹ کی تخلیق کرنے والوں کو مکمل آزادی بھی دے گی اور کوڑے کرکٹ کے پھیلاو کو روکنے کا کوئی انوکھا طریقہ بھی ڈھونڈ نکالے گی۔ اس بات کا احساس مشکل ہی سے کسی کو ہوا ہوگا کہ مکمل آزادی اگر اُن کو حاصل ہوگی تو باقی سب کو بھی حاصل ہوگی۔ یہ خیال بہت کم لوگوں کے ذہن میں آیا کہ انھیں مسابقت کا بھی سامنا کرنا ہوگا، اور یہ احساس تو شاذ ہی کسی کو ہوا ہوگا کہ کیا چیز خریدی جائے، اور پھر اسے بڑی تعداد میں تیار کر کے عام فروخت کے لیے رکھا جائے، یہ تمام فیصلے اوسط درجے کے پڑھنے یا دیکھنے والے کے ذوق اور مفاد کو سامنے رکھ کر کیے جائیں گے۔

اچانک، تقریباً راتوں رات، معاشرے نے خود کو کھلے بازار کی معیشت کی آزاد صورت حال میں پایا، اور تب ہر چیز اس تصوّر سے قطعی مختلف تھی جو خواب دیکھنے والوں کے ذہن میں قائم تھا۔ اپنے دہشت ناک مگر مانوس دشمن -- سنسر -- کے بجاے ان کا سامنا بازار سے ہوا۔ بازار کے لیے خواب بے مصرف چیز ہیں، اسے تو سرمایہ، تجربہ، حوصلہ، بے پناہ محنت، قوت فیصلہ اور صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ آزادی کے خواب دیکھنے والوں میں سے بیش تر ان اثاثوں میں سے ہر ایک سے، یا تقریباً ہر ایک سے، محروم تھے۔ وہ سخت صدمے کی حالت میں دیکھتے رہ گئے اور کوڑا کرکٹ (اور وہ بھی غیر ملکی برانڈ کا کوڑا کرکٹ) اُن کی آرٹ کے اور آزادی کے ماحول میں تیار ہونے والی اور بے تابی سے ہاتھوں ہاتھ لی جانے والی تخلیقات کے خوابوں کی پسلیوں میں کہنیاں مار کر آگے نکل گیا، اور ان کے پڑھنے یا دیکھنے والوں نے، جن سے انھوں نے اتنی مفروضہ امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، مستند تخلیقی کارناموں کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور ان پر نہایت سطحی صارفانہ اشیا کو ترجیح دینے لگے۔

اس میں شک نہیں کہ حالیہ واقعات کا نتیجہ بعض ثقافتی نقصانات کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ چیک اینی میٹڈ اور کٹھ پتلیوں کی فلمیں جو کبھی دنیا بھر کی بہترین فلموں میں شمار ہوتی تھیں، ڈزنی کی سوقیانہ پیداوار سے شکست کھا گئی ہیں۔ یہی بات غالباً چیکوسلوواکیا کے بچوں کے ادب کے بارے میں کہی

جا سکتی ہے، جس میں بچوں کی کتابوں میں شامل تصویریں بھی شامل ہیں جو بہترین چیک مصوروں کی کئی دہائیوں کی کوششوں کا ثمر تھیں۔ چیک سنیما، جو ۱۹۶۰ کی دہائی میں بہترین یوروپی سنیما میں شمار کیا جاتا تھا، نہایت پست حالت میں ہے اور زیادہ تر کامیڈی، پورنوگرافی اور ایکشن فلموں کے ملغوبے تیار کر رہا ہے۔ تھیئٹر اُتھلی، بے تہ کامیڈی یا میوزیکل پیش کشوں کی غذا پر زندہ رہنے کے لیے کوشاں ہے۔ ثقافتی جریدے مر رہے ہیں، کیوں کہ اپنے پڑھنے والوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ انقلاب کے بعد نمودار ہونے والے دو ہزار کے لگ بھگ اشاعتی اداروں میں سے بہت سے کوڑے کرکٹ کی پیداوار میں اختصاص رکھتے ہیں اور عظیم بازاری کامیابی سے ہم کنار ہو رہے ہیں۔

عوام، جو ذاتی انتخاب کے اس اچانک دھماکے سے دوچار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے، اپنی ذہنی ترجیحات سے بے خبر ہیں اور ایک ڈھلمل یقین منڈی کی تشکیل کر رہے ہیں۔ فنون کے درسی ماہرین، جو شاید سنجیدہ تخلیقات کے خریدار ہو سکتے تھے، اتنی کم تنخواہ پاتے ہیں کہ ان کے پاس کلچر کے لیے کوئی رقم نہیں بچتی۔

لیکن اس صورت حال کا مثبت رخ بھی موجود ہے: "تیسرے راستے" کا سراب اب غائب ہوتا جا رہا ہے اور کلچر کی تخلیق کرنے والے، پہلی بار، معاصر دنیا میں اپنا مقام متعین کرنے کے اہل ہو گئے ہیں۔ دوسری جانب بدقسمتی یہ ہے کہ ثقافتی میدانوں میں ہم لوگ آزاد دنیا کے تجربات سے بہت کم سبق حاصل کر سکتے ہیں: یہ کہ ٹیلی وژن کے اسکرین تشدد سے مغلوب ہیں، یہ کہ دیہی دکانیں جن میں ابھی کچھ دن پہلے تک، ضرورت کی دوسری اشیا کے ساتھ ساتھ، کلاسیکی ادب پاروں یا بچوں کے بہترین ادب کے ایڈیشن بھی مل جایا کرتے تھے، اب صرف باریکین رومانس اور کومکس سے اٹی ہوتی ہیں، اور یوں خریداروں کو نہ صرف انتخاب سے محروم کر رہی ہیں بلکہ ان کے ذوق کو پست بھی کر رہی ہیں۔

ہمارا معاشرہ ایک نہ ایک دن اس ثقافتی صدمے کے اثر سے نکل آئے گا۔ آج بھی متعدد ناشر اور کتب فروش سنجیدہ ادب کی اشاعت اور فروخت پر توجہ دے رہے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے پبلک ٹیلی وژن کے دو چینلوں میں سے ایک باذوق ناظرین کے لیے پروگرام نشر کرنے پر زور دے رہا ہے۔ ریاستی اور نجی شعبے دونوں میں مالی اعانت کے ایسے ادارے قائم کیے جا رہے ہیں جنھوں نے آرٹ کی سنجیدہ تخلیقات کے فروغ کو اپنا مقصد ٹھہرایا ہے۔

سنسرشپ کے برعکس بازار کی معیشت آزادانہ انتخاب کی گنجائش فراہم کرتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جو لوگ آرٹ کے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں، جن کو یقین ہے کہ انسانی زندگی کے بنیادی معنی بے مقصد اور محض وقت گزاری کی تفریح میں پوشیدہ نہیں ہیں، ان کا یہ حق، بلکہ فرض، نہیں بنتا کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے موقف کا قائل کرنے کی پوری کوشش کریں۔

**

Scanned with CamScanner

فہمیدہ ریاض

کیا گلابی کبوتر جیت گئے؟

الما آتا کے ہرے بھرے درختوں میں اوائلِ اگست کی ہوا سرسراتی ہوئی چلتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پتّے تالیاں بجاتے ہیں۔

میں اپنی مترجم سے پوچھتی ہوں:

"ان درختوں کا کیا نام ہے؟"

وہ مہ جبیں، خوش رُو، نازک اندام تاتاری حسینہ مجھے امریکن لہجے میں بولی ہوئی انگریزی میں نرمی سے بتاتی ہے:

"توزہی۔۔۔"

اس کا نام گلناز ہے۔ اتنی خوب صورت، نازک اور پیاری، اسے دیکھنا ہی جنت نگاہ ہے، اور باتیں کرتی ہے تو منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ اس کے ترشے ہوئے سنہری بال ہوا سے اُڑاُڑ کر بار بار اس کی بھوری آنکھوں کے سامنے لہرا رہے ہیں۔ وہ اپنے نازک گورے ہاتھ سے انھیں ہٹاتی ہے۔ اس کی طلائی انگشتری کا ننھا سا سفید نگینہ دھوپ میں چمکتا ہے۔

گلناز، الما آتا میں تم سے مل کر مجھے ملا یوسف ضیائی کیوں یاد آ رہے ہیں؟

ہم قزاخستان میں ہیں، ایک سہ روزہ ادبی میلے میں شرکت کر رہے ہیں۔ اور یہ ۱۹۹۵ ہے۔ صدی آخری سانسیں لے رہی ہے۔

گلناز مجھ سے گھُل مِل گئی۔ ستائیس برس کی حسینہ، وہ بیاہتا ہے۔ اس کی ایک پانچ سال کی بیٹی ہے۔ ہینڈبیگ سے نکال کر وہ مجھے اس کی چھوٹی سی رنگین تصویر دکھاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

"تم دوسرے مترجموں سے بہت بہتر انگریزی بولتی ہو۔ کہاں سے سیکھی؟"
"اسکول میں،" وہ کہتی ہے۔ "میں نے اسپیشل اسکول میں پڑھا ہے۔"
"اگست کے آخیر میں،" وہ مجھے بتاتی ہے، "میں اسکالرشپ پر امریکا جاؤں گی، ایجوکیشنل ایڈمنسٹریشن پڑھنے۔"

گلناز قزاخ نہیں ہے۔ وہ مجھے بتاتی ہے، قزاخستان میں کوئی ایک سو قومیتیں رہتی ہیں: روسی، تاتار، آرمینی۔۔۔ سوویت یونین کے وجود میں آنے سے بہت پہلے سے، صدیوں سے، مختلف قومیتوں کے لوگ آآ کر اس خطے میں بستے گئے۔

"قزاخستان کی آزادی کے بعد روسی واپس نہ چلے گئے؟" میں نے اس سے پوچھا۔
"کچھ لوگ گئے تھے،" اس نے بتایا، "مگر پھر واپس آ گئے۔ وہ اب بدل چکے ہیں۔ انھیں روس اپنایا اچھا نہیں لگا۔ اور روسیوں نے انھیں پسند نہیں کیا۔ وہ قزاخ عادتیں اور رسم و رواج اپنا چکے ہیں۔"

ہوا سرسراتی ہے اور پتے ننھے منے شریر بچوں کی طرح تالیاں بجاتے ہیں۔

کھلی سڑک پر چلتے چلتے، ایک موڑ کاٹتے ہوے، اچانک میری نظر دو گلابی پرندوں پر پڑی جو بڑی تمکنت سے ایک درخت کے تنے اور سرمئی کنکریٹ کے ایک ستون کے درمیان کچی زمین پر چلے جا رہے تھے۔ گلابی پرندے! کیا کوئی یقین کرے گا؟ ارے اس رنگ کے بھی پنچھی ہوتے ہیں؟ میں نے خوشی سے چیخ ماری اور بےساختہ پوچھا: "ان کا کیا نام ہے؟"

مگر اس وقت کوئی مترجم ہمارے ساتھ نہ تھا۔ دیکھنے میں وہ ننھے منے کبوتر معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے دل میں انھیں گلابی کبوتروں ہی کا نام دیا۔ دو کم سن شہزادوں کی سی شان سے کچی زمین پر رواں۔۔۔

گلناز ملے گی تو اس سے پوچھوں گی، میں سوچتی ہوں۔ گلناز، جس سے مل کر مجھے ملا یوسف ضیائی بہت یاد آئے۔

ملا یوسف ضیائی برسوں پہلے میرے پڑوسی تھے۔

یہ ۷۸-۱۹۷۷ کی بات ہے۔ وسطی کراچی کے ایک معمولی سے تین کمروں کے مکان میں میں اپنے دو شیرخوار بچوں اور شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ میرے شوہر ایک سندھی کسان انقلابی جماعت کے کل وقتی کارکن تھے۔ سرمایہ داری نظام کا پرزہ نہ بننے کا عزمِ بالجزم کیے یہ حقیر فقیر پُرتقصیر بھی اُس کثیر القومی دواساز کمپنی کی ملازمت سے استعفیٰ دے چکی تھی جہاں سے دو وقت کی روٹی کا آسرا تھا۔ اور اس وقت اپنا رسالہ "آواز" شائع کرنے کی تگ و دو کر رہی تھی۔ ہمارے ننھے منے خاندان کا گزارہ میرے فری لانس کام کرنے اور ٹھیکے پر پرنٹنگ کرانے پر منحصر تھا۔

تب ہی میرے پڑوس کے خالی مکان میں ملا یوسف ضیائی آ بسے۔ پھر کافی عرصے مجھے ان کی ہم

سائیگی کا شرف نصیب رہا۔

وہ مشکل زمانہ تھا۔ ملّا یوسف کی ہم سائیگی نے اسے کچھ مشکل تر بنا دیا تھا۔ کراچی میں ہمارا چھوٹا سا گھر عرصے سے اس سندھی انقلابی کسان جماعت کے کارکنوں کا مسکن رہا تھا۔ گاؤں سے کراچی آنے پر وہ وہیں اکٹھا ہوتے۔ وہیں بیٹھ کر پمفلٹ لکھے جاتے اور مستقبل کے پروگرام بنتے۔ پھر ملک کے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو گرفتار کر لیے گئے اور ان پر قتلِ عمد کا مقدمہ دائر کر دیا گیا۔

حالات کے اس اچانک موڑ نے سیاست کا اس طرح رُخ پلٹا کہ دوسری چھوٹی بڑی سیاسی جماعتوں کی طرح اس سندھی کسان انقلابی جماعت کا بھی شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ بھٹو صاحب کی گرفتاری اور متوقع سزائے موت نے سندھ کے دیہی عوام کو فردِ واحد کی مانند متحد ہو کر زیرِ عتاب سیاسی جماعت کا حامی بنا دیا تھا۔ اس نئی صورتِ حال میں کسان انقلابی جماعت کی قیادت نئی حکمتِ عملی بنانے میں ناکام رہی تھی اور کارکنوں کے شدید اختلافات کے باعث معطل ہو گئی تھی۔ اس جماعت کے کارکن، سیدھے سادے پُرخلوص اور گرم جوش باری، اس تحریک کے صدر کی اس منطق کا ساتھ نہ دے سکے تھے کہ مارشل لا کو کسی طرح پارٹی کے فائدے میں استعمال کیا جائے۔ ان کے دل عام سندھی لوگوں کی طرح معزول وزیرِ اعظم کی سلامتی کے لیے دھڑک رہے تھے اور کوئی بھی نظریہ ان کے اس فطری ردِ عمل کو بدل نہیں سکتا تھا۔ میرے گھر میں وہ اب بھی جمع ہوتے، مگر اب ان کی سرگرمیاں اس سخت مارشل لا میں بھٹو صاحب کی جان بچانے پر مرکوز ہو چکی تھیں۔

ملّا یوسف اور ان کے خاندان سے میری ملاقات رو برو شاید نہ ہوتی، مگر بی بی جان ہمارے گھرانوں کے بیچ میں ایک کڑی بن گئی۔ بی بی جان میرے بچوں کی آیا اور اس گھر کی واحد ملازمہ تھی۔ ایک خوب رُو ادھیڑ پٹھان عورت، جس کا باپ بمبئی میں ٹرک چلایا کرتا تھا۔ اس کا بچپن بمبئی میں گزرا تھا۔ اس کا شوہر کراچی میں ٹرک چلاتا تھا۔ ایک اچانک حادثے میں اس کی موت کے باعث بی بی جان کو ملازمت ڈھونڈنی پڑی تھی۔ وہ اپنے سہارے جینا چاہتی تھی اور اپنے دو بچوں کی پرورش خود ہی کرنا چاہتی تھی۔

وہ ایک ہنس مکھ اور چلبلی عورت تھی۔ بیوگی نے اس کے فطری الھڑپن کو ذرا سا ہی متاثر کیا تھا۔ بچوں کو نہلانے دھلانے کے بعد، اور گھر میں جمع سوگوار اور سنجیدہ پارٹی کارکنوں کے لیے میری مدد سے دیگیں بھر کر چائے بنانے کے بعد، وہ محلّے کی سیر کو نکل پڑتی۔ پاس پڑوس کی پوری سن گن رکھتی اور سب کے مزے دار قصے مجھے رات گئے تک سناتی رہتی۔

وہ رمضان کا مہینا تھا جب بی بی جان نے مجھ سے کہا:

"بی گم ساب" وہ مجھے یہی کہتی تھی، "آپ قسم خدائی پاک کی، ملّا یوسف جان کے گھر ایک دن افطار کر کے دیکھو۔ آپ کو کیا بتاؤں، کتنی زیادہ چیزیں ہوتی ہیں اس کے دسترخوان پر۔ اور آپ تو بس پکوڑا بنا کر بیٹھ جاتی ہے۔"

"کیا کیا چیزیں ہوتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

وہ مجھے مٹھائیوں اور پھلوں کے نام گنوانے لگی اور اصرار کرنے لگی کہ دوسرے دن میں اس کے ساتھ ملّا یوسف ضیائی کے گھر روزہ افطار کرنے ضرور چلوں۔ میں ہنسنے لگی۔ میں نے اس سے کہا، "ایسا کرتے ہیں کہ کل ہم اپنی پکوڑوں کی افطاری ملّا یوسف کے گھر بھیجیں گے۔ جواب میں وہ ہمیں یقیناً بہت سی چیزیں بھجوادیں گے۔"

"یہ ترکیب ٹھیک ہے،" بی بی جان نے سر ہلا کر کہا۔ دوسرے دن افطار کے وقت وہ واقعی سینی بھر کر مٹھائیاں، کئی طرح کے حلوے اور پھل ملّا یوسف کے گھر سے لے آئی۔ میں پریشان ہو گئی۔ میں نے اس سے کہا:

"اری بی بی جان، میں نے تو مذاق میں کہا تھا۔ یہ تو کیوں اٹھا لائی؟ ایسا تھوڑا ہی کرتے ہیں!"

"کیوں کیوں بی گم ساب!" بی بی جان نے چمک کر کہا۔ "میں پکوڑا ان کے گھر لے گئی تھی، رکابی بھر کر، رکابی سے ڈھک کر۔۔۔" پھر وہ زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور افطاری کھانے لگی۔ اس نے ہنس کر مجھ سے کہا:

"کھاؤ کھاؤ بی گم ساب، کون سا ملّا یوسف جان کا اپنا مال ہے۔ یہ تو اُن کے گھر بھی بہت سے گھروں سے آتی ہے۔" پھر اس نے کہا، "ملّا یوسف اور اس کی بی بی آپ کو سلام بھیجتے ہیں۔ اس کی بی بی آپ کو بلاتی ہے۔"

حلووں سے بھری قاب کے بوجھ کے نیچے دب کر میں نے کہا:

"کل شام چلیں گے بی بی جان۔"

"اچّا، خا!" وہ خوش ہو گئی اور مجھے محلّے کے قصّے سنانے لگی۔

"آپ جانتی ہے بی گم ساب، یہ سامنے والی بی گم ساب کا چکّر پچھلی گلی کے بلوچ لڑکے کے ساتھ چل رہا ہے۔ یہ رات کو وہاں جاتا ہے۔ خدائے پاک کی قسم، میں نے خود دیکھا۔۔۔" اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کیا دیکھا تو نے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"سب کچھ۔۔۔ خود دیکھا!" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

میں قہقہہ لگا کر ہنسی۔ مجھے بی بی جان اچھی لگتی تھی۔ تھی بھی بہت دل چسپ عورت۔

"سب کچھ؟" میں نے کہا۔

"ہاں، سب کچھ!"

پھر میں اَور بھی ہنسی۔ میں نے کہا:

"افوہ بی بی جان۔ تو تم نے کیوں دیکھا؟ یہ تو حرام ہے!"

"نہیں بی گم ساب،" وہ وثوق سے سر ہلاتی۔ "دیکھنا حرام نہیں ہے۔"

"تو مکروہ ہو گا،" میں کہتی۔ "تمہارا وضو تو ضرور ٹوٹ گیا ہو گا۔"

Scanned with CamScanner

"وضو تو میں نماز سے پہلے دوبارہ کر لیتی ہے۔"
پھر وہ قہقہہ لگا کر مجھے کوئی ایسا قصہ سنانے لگی:
"بی گم ساب، بمبئی میں ہم ایک چالی میں رہتے تھے۔ تو اُدر مچھلی والیاں آتی تھیں۔ ایک دن میں اپنی کھولی کے دروازے کے سامنے بیٹھی تھی۔ مچھلی والیوں کے بڑے بڑے لال سبز لہنگے ہوتے تھے اور سر پر بڑی بڑی ٹوکریاں۔ دونوں ہاتھوں سے تو وہ مچھلی کی ٹوکریاں پکڑے رہتی تھیں۔ میں نے اس سے کہا: ایک مچھلی تو مجھے بھی دو۔ میرا دل چاہتا ہے مچھلی تل کر کھاؤں۔ اس نے کہا: پانچ روپے کی مچھلی ہے۔ میں نے کہا: پیسے تو میرے پاس نہیں۔ مچھلی والی نے میرا منھ چڑایا اور بولی: پیسے نہیں تو مچھلی بھی نہیں۔ یہ کہہ کر بی گم ساب وہ تو آگے جانے لگی۔ میں نے بی گم ساب اس کے لہنگے کا ازار بند کھینچ لیا۔ خیمے کے خیمے جیسا لہنگا پٹ سے نیچے گرنے لگا۔" اس نے ہنسی سے بے قابو ہو کر یاد کیا۔
"اُف! تو نے کیوں کیا ایسا بی جان، کسی عورت کے ساتھ!" میں نے دہل کر سر پیٹا۔
"وہ لہنگا پکڑنے لگی اور بی گم ساب، مچھلی کی ٹوکری زمین پر!" اس نے ہنستے ہنستے آنکھوں کا پانی صاف کیا۔ آخر میں بھی اس کے ساتھ ہنس پڑی۔ "پھر تو نے مچھلی کھائی؟"
"ام نے مچھلی کھائی۔۔ جی ہاں!"
قہقہے لگاتی بی بی جان عشا کی نماز کے لیے وضو کرنے چلی گئی۔
نہ جانے اس کے باپ دادا کب کابل سے خشک میوے کی بوریاں کمر پر لادے بمبئی پہنچے تھے۔ وہ کسی قافلے میں آئے تھے جس کے لوگ راستے میں کئی جگہ رہ گئے تھے۔ بی بی جان کا دادا بمبئی جا پہنچا تھا۔ بی بی جان وہیں پیدا ہوئی تھی۔ بچپن میں اس نے اپنے باپ کے ساتھ ٹرک میں سورت تک سفر کیا تھا۔ اسی لیے وہ سیلانی ہو گئی تھی۔ پاکستان آنے کے بعد وہ کراچی میں بس گئے تھے۔ مگر ستر اسی برس پرانی رشتے داریاں اُن لوگوں سے بھی تھیں جو علاقۂ غیر میں رہ گئے تھے اور پھر وہیں بس گئے تھے۔ وہ لوگ افغانستان اور پاکستان کے درمیان میں واقع اس آزاد قبائلی علاقے سے پاکستان آتے رہتے اور اگر انھیں یہاں روزگار مل جاتا تو ایک آدھ برس میں پاکستانی بن جاتے اور یہاں کے طور طریقے اپنا لیتے۔ "بلکہ ان میں سے کچھ تو،" بی بی جان نے مجھے بتایا تھا، "پاکستانی فوج میں بھرتی بھی ہو جاتے ہیں۔"

دوسرے دن شام کو میں نے بی بی جان کے ساتھ ملا یوسف ضیائی کے گھر پر دستک دی۔ ملا یوسف افطاری کے دستر خوان پر اپنی سات آٹھ برس کی بچی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کی بی بی باورچی خانے میں کباب تل رہی تھیں۔ ملا یوسف نے خوش خلقی سے کھڑے ہو کر ہمیں خوش آمدید کہا۔
گورے چٹے، بلند قد اور فربہ ملا یوسف، اپنی گھبری سیاہ داڑھی سمیت، ایک خوش گوار شخصیت تھے۔ ہنس مکھ اور مہمان نواز۔ وہ گرم جوشی سے ہماری خاطر تواضع کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ پڑوس کی مسجد میں امام مقرر ہو گئے ہیں۔ وہ فصیح و بلیغ اردو میں لچھے دار باتیں کر رہے تھے۔ ان کا انداز کسی

Scanned with CamScanner

سرطراز داستان گو کا سا تھا۔ میں بھی ان سے فصیح و بلیغ اردو میں گفتگو کرنے لگی۔ ملا یوسف حکومت کی تبدیلی سے بہت خوش تھے۔ وہ زکوٰۃ کی محلہ کمیٹی کے صدر بھی مقرر کر دیے گئے تھے۔ شہر کا کمشنر بھی ملاقات کے لیے انھیں اکثر بلا بھیجتا تھا۔ اپنی عزت افزائی اور تازہ یافتہ اہمیت کی خوشی سے ان کا لہجہ رقیق اور چہرہ منور تھا۔ وہ بہر حال اپنی جذباتی کیفیت کو جوشِ ایمانی ہی سمجھ رہے تھے۔ انھوں نے کئی بار ذکر کیا کہ اسلامی جذبے کی آخر کار فتح ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے، میں نے سوچا، کہ ان کا چہرہ اپنی اہمیت اور جذبۂ ایمان کے ملے جلے احساسات سے تابندہ نظر آ رہا ہو۔ یہ رعایت میں نے انھیں اس لیے دی کہ وہ مجھ جیسی بے پردہ عورت سے نہایت خوش اخلاقی سے پیش آ رہے تھے بلکہ میری فصیح و بلیغ اردو سن کر مجھے بہت پسندیدگی اور احترام کی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور خود بھی فصاحت کے دریا بہا رہے تھے۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش نظر آ رہے تھے اور ایک امنگ سے گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے سرخ و سفید، فطری طور پر خوش مزاج چہرے پر یہ احساس صاف جھلک رہا تھا کہ انھیں یقین ہے کہ ان کی فصاحت اور نکتہ رسی اس سننے والی پر رائیگاں نہ جائے گی، جیسا کہ شاید مسجد میں وعظ کرتے وقت ہوتا ہوگا۔

گفتگو کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ مجھے ان کی اردو میں پختون لہجے کا رنگ نظر نہیں آیا تھا۔ اس بات کے جواب میں انھوں نے مجھے اپنی حیران کن داستان سنائی۔

"کیا بتائیں محترمہ، کہ ہم کہاں کے رہنے والے ہیں۔ عزیزۂ من، میرے دادا قزاخستان کے متوطن تھے۔"

یہ سن کر میں حیران رہ گئی۔ میں نے پوچھا:

"تو آپ یہاں کیسے؟"

انھوں نے ہاتھ سے بے بسی کا اشارہ کیا۔

"بس کیا بتائیں، روسی ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ عزیزہ، ۱۹۱۷ کے انقلاب نے ہمارے خاندان کو تاراج کر دیا۔ دادا میرے دینی عالم اور قاضی تھے۔ قزاخستان میں ہماری وسیع جائیداد تھی۔ ہمارا خاندان نہایت متمول تھا۔ جب ظالم روسیوں نے قزاخستان پر حملہ کیا تو ہم اپنا ایمان بچا کر اہلِ خانہ کے ساتھ راتوں رات وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ انتہائی طویل اور پُر صعوبت سفر کرتے ہوئے ہم سنکیانگ کے علاقے میں داخل ہوئے اور وہاں مسلمانوں کی ایک بستی میں پند و وعظ شعار کیا۔"

"سنکیانگ --- چائنا ---" میں بڑبڑائی۔

"جی ہاں خاتونِ محترم۔ مگر سکون و خوش حالی کا یہ دور بھی عارضی ثابت ہوا۔ وہاں بھی کمیونسٹ انقلاب آ گیا۔ جائیدادیں ضبط ہونے لگیں۔ مساجد مقفل ہو گئیں۔ اہلِ ایمان پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے جانے لگے۔ ہمارا خاندان ایک بار پھر دربدر ہو گیا۔ ایک اور طویل اور پُر صعوبت سفر کے بعد براستہ پاراچنار ہم اس علاقے میں داخل ہوئے جو اب مملکتِ خداداد پاکستان کا حصہ اور نارتھ ویسٹ فرنٹیئر پراونس کے نام سے معروف ہے۔"

Scanned with CamScanner

"تو پھر تو آپ پاراچنار سے آئے ہیں،" میں نے دھیمے سے کہا۔

ان کی داستان سن کر میرا دل ڈوب رہا تھا۔ افغانستان میں کمیونسٹ انقلاب تازہ تازہ آیا تھا۔ مدتوں بعد ہمارے ساتھیوں کے زرد چہرے خوشی سے چمک اٹھے تھے۔ ہم دل کی گہرائیوں سے افغان کمیونسٹوں کے حامی تھے۔ چند دن پہلے ہی تو میں نے اپنے رسالے کے اداریے میں لکھا تھا: وسطِ ایشیا کی سنگلاخ زمینوں پر سامراجی راکب منھ کے بل گر پڑے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

انھوں نے مستعدی سے کہا:

"جی نہیں، خاکسار تو عرصہ پچیس برس سے کراچی میں مقیم ہے۔"

مجھے دل سے میں نے انھیں خدا حافظ کہا، ان کی خوب صورت مگر فربہ اندام بیوی اور سات سالہ نازک سی بچی پر نظر ڈال کر جسے انھوں نے ابھی سے سخت پردے میں بٹھا دیا تھا۔ ملا یوسف ضیائی کی افسانوی داستان پر میں نے کچھ یقین کیا تھا اور کچھ نہیں بھی کیا تھا۔ ان کے چہرے پر نظر ڈال کر البتہ گمان گزرتا تھا جیسے سچائی کا کوئی پرتو کہیں اس پُر گوشت چہرے میں چھپا ہے جس کی اُبھری رخساروں کی ہڈیاں اور ترچھی سیاہ آنکھیں فربہی نے معدوم کر رکھی تھیں۔ مگر اس طرح کے چہرے تو صوبہ سرحد اور بلوچستان میں عام پائے جاتے تھے۔ کیا یہ واقعی نسلی قزاخ ہیں؟ میں نے تعجب سے سوچا تھا۔ اُس وقت مجھے قزاخستان اور سنکیانگ پریوں کے دیس کی طرح دیومالائی سرزمینیں لگنے لگے تھے۔ جیسے وہ کہیں بھی نہ ہوں، صرف انسانی تصوّر کے کسی زرخیز علاقے میں وجود رکھتے ہوں۔

جو بات صاف ظاہر تھی وہ بہر حال ان کی کمیونسٹ دشمنی اور اُس وقت کی مارشل لائی حکومت سے وابستگی تھی۔ اپنے آپ سے اتنے نزدیک، جہاں دو گھرانوں کے بیچ میں سیمنٹ کی ایک پتلی سی دیوار کے سوا کچھ نہ تھا، ایک پختہ مخالف کی رہائش کے خیال نے مجھے گھبرا دیا تھا۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا، وہ ایک مشکل زمانہ تھا۔ مارشل لا نہایت سخت گیر تھا۔ سیاسی قیدیوں سے جیلیں پٹی پڑی تھیں اور کئیوں کو صرف "جیے بھٹو" کا نعرہ لگانے پر سرِعام کوڑے لگائے گئے تھے۔ ان حالات میں سیاسی حکمتِ عملی کی منصوبہ بندی اور پمفلٹوں کی تیاری قطعی خفیہ عمل تھا۔

"یہ یقیناً سرکاری جاسوس ہیں جنھیں خاص طور پر ہماری جاسوسی کرنے کے لیے حکومت نے اس گھر میں رکھا ہے،" میرے شوہر نے اس مخصوص میگلومےنیا کے جذبے سے کہا جو سیاسی تحریکوں میں قائدِاوّل بننے کی پوشیدہ آرزو رکھنے والے کارکنوں کا خاصہ ہے۔

پریشانی کے باوجود میں تھوڑا سا ہنسی۔ اپنے خواب و خیال میں رہنے کے باعث میں اس میگلومےنیا سے ایک حد تک بچی رہتی تھی۔ یوں بھی نصف ذہنی توانائی تو دال روٹی کے حصول میں خرچ ہوتی تھی۔

ملا یوسف کے گھر مجھے یاد نہیں کہ دوبارہ میں کبھی گئی ہوں۔ بی بی جان کی معرفت البتہ اس گھر سے افطاری، سویّوں اور حلووں وغیرہ کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ بی بی جان کو انھوں نے زکوٰۃ فنڈ سے ایک معقول رقم دلائی تھی۔

Scanned with CamScanner

اس زمانے میں ماہ و سال، حتیٰ کہ شب و روز بھی بھاری اہمیت کے حامل تھے۔ ہم اپنی مصروفیات میں اور فکروخیال میں ہمہ تن غرق تھے۔ افغانستان میں ثور انقلاب کی مخالفت زور پکڑ رہی تھی اور پاکستان کی حکومت کی جانب سے مزاحمت کی کھلے بندوں حمایت شروع ہو چکی تھی۔ پھر روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہو گئیں۔ انہیں دنوں میں نے انگریزی اخبار "گارجین" میں ایک ہولناک رپورٹ پڑھی۔ کسی مقام پر افغان مجاہدین نے چند روسی سپاہیوں کو پکڑ لیا۔ انھوں نے روسی سپاہیوں کو قتل کر کے ان کی کھال اتاری اور انہیں قسائی کی دکان پر کھونٹے سے لٹکا دیا۔

یہ رپورٹ پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دل میں ایک ہی خیال آیا کہ یہ روسی نوجوان افغانستان میں سرخ انقلاب کی حفاظت کرنے پہنچے تھے۔ یہ سوچ کر میرا دل خون ہو گیا۔ میں نے ایک نظم لکھنی شروع کی:

ٹانگتے ہو دکاں پر قصاب کی
لال گھبرو کا گورا بدن
یہ بدن ہم خریدیں گے۔۔۔

مگر یہ نظم مکمل نہ ہو سکی، اور دوسری مصروفیات میں اس کے بعد میں دو مصرعے ہی لکھ پائی:

اس سے آتی ہے بوئے اخوت
پیرہن ہم خریدیں گے۔۔۔

مگر دوسرا مصرعہ ناقص تھا۔ دونوں مصرعوں میں ربط پیدا کرنے والا لفظ بحر میں بیٹھ نہیں رہا تھا۔

نظم پوری نہ ہونے کی غالباً ایک غیر تکنیکی وجہ بھی تھی۔ روسی سفارت خانے کی ایک آدھ تقریب میں جہاں مجھے جانے کا اتفاق ہوا تھا، روسی سفارت کاروں کے جذبات سے عاری سپاٹ چہرے اور نوکرشاہانہ مزاج میرے فطرتاً باغی، آزادمنش دل کو ذرہ بھر نہ بھائے تھے اور مجھے ان سے چنداں "بوئے اخوت" نہ آئی تھی۔ گو میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا کہ تمام روسی ہرگز ایسے نہیں ہوتے ہوں گے: یہ دیگ کے وہ چاول نہ تھے جن سے اس پوری قوم کا اندازہ لگایا جا سکے۔ یہ روسی نہیں بلکہ نوکرشاہی کے کل پرزے تھے، اور تمام دنیا کی نوکرشاہی کے کارندے حیرت انگیز طور پر یکساں اور ایک دوسرے کی تصویر ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ ایک عالمی نسل کی صورت اختیار کر رہے ہیں۔ مگر میرے دل نے حسرت سے چاہا تھا اُن روسیوں کو دیکھنا جو سُرخ انقلاب لائے تھے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر، دل میں پوشیدہ ادب کی رسیا نے خواہش کی تھی اُن روسیوں کو دیکھنے کی جو دستووسکی اور تالستائی اور گوگول کے کردار تھے، جو نہ جانے کہاں تھے۔۔۔ سفارت خانے میں تو ہرگز نہ تھے۔

مگر، دل کو سمجھانے کے باوجود، لاشعور میں شاید کہیں روسیوں کی مزاحمت ابھی رہ گئی تھی اور وہ نظم کبھی مکمل نہ ہوئی تھی۔

پڑوس کی مسجد میں ملّا یوسف ضیائی کی امامت زیادہ عرصے نہ چل سکی۔ اُن تناؤ بھرے پُر آشوب دنوں میں ایک روز میں نے سنا کہ مسجد میں بہت ہنگامہ ہوا اور نمازیوں کے ایک گروہ نے ملّا یوسف کی پٹائی کر دی۔ انھیں امامت کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ دراصل ملّا یوسف دیوبندی خیالات کے تھے۔ اُس وقت کی حکومت کی وہابیت نے ان کے عقیدے کو اور بھی راسخ کر دیا تھا۔ وہ بھول گئے تھے کہ کراچی کے لوگوں کی بھٹو مخالفت ایک طرف، مگر یہ ایک بریلوی عقیدے کا شہر تھا اور اس کے باسی ملّا یوسف کے جارحانہ وہابی پندو موعظ کو زیادہ دن تک ہضم نہ کر سکتے تھے۔

سچ یہ ہے کہ یہ سن کر مجھے افسوس ہوا تھا۔ ملّا یوسف مجھے کبھی اپنے دشمن کیوں نہ لگے؟ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہوگا۔ وہ مجھ سے خوش اخلاقی سے ملتے تھے، بس اس سے زیادہ تو ان سے تعلق نہ تھا۔ انھیں یقین تھا کہ پندو وعظ کرنا اور نمازیوں سے تحفے وصول کرنا، زکوٰۃ کمیٹی کا صدر بننا، اور رفتہ رفتہ جائیدادیں بنا لینا عین فطری باتیں ہیں، اور وہ خوش مزاجی سے اپنی پسندیدہ راہ پر گام زن تھے۔ ان کے اپنی طرح کے اسلامی عقائد تھے جن پر وہ سختی سے کاربند تھے۔

بی بی جان البتہ چھپ چھپ کر ہنستی رہی۔ "بی گم ساب، ملّا کے پاس بوت مال تھا۔" اس دوران کسی بات پر اس کی ملّا یوسف ضیائی سے لڑائی ہو گئی تھی۔ تنازعہ غالباً زکوٰۃ ہی پر ہوا تھا۔

زندگی ایک جھپاکے میں گزرتی جا رہی تھی۔ بی بی جان کے قہقہے اس سنجیدہ گھر میں زندگی کی لہر دوڑا دیتے، لیکن ایک بار اُس کے خشم ناک غصّے کا مجھے بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔

بی بی جان سیلانی تھی۔ گھر کا کام پلک جھپکتے نمٹا کر وہ سر پر سفید شٹل کاک برقع ڈال کر، جو تمام تر اس کی پشت پر لہراتا رہتا اور اس کے بشاش قہقہوں میں مخل نہ ہوتا، دور دراز پختون بستیوں کی سمت نکل کھڑی ہوتی اور رات گئے کسی ٹرک پر بیٹھ کر واپس آتی۔ ایک دن وہ اپنے ساتھ میرے چھوٹے والے بچے کو بھی لے گئی۔ جب سورج ڈوبنے تک وہ نہ لوٹی تو میں بے حد پریشان ہو گئی۔ وہ واپس آئی تو بچہ اس کے کاندھے پر سو رہا تھا۔ غصّے میں میں نے اسے بہت بُرا بھلا کہا۔ اُس دن میری طبیعت بھی ٹھیک نہ تھی؛ مجھے صبح سے بخار تھا۔ شاید میں نے اسے آوارہ گرد کہا تھا۔ بی بی جان اس کا مطلب آوارہ سمجھی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ ایک لفظ منھ سے نکالے بغیر وہ برتن دھونے لگی۔ میں اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ گئی۔

تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا اور بی بی جان اندر داخل ہوئی۔ اس نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر میرے پلنگ کے سرہانے آ کھڑی ہوئی۔

"بی گم ساب!" اس نے تیز باریک آواز میں کہا۔ "تم نے مج کو گالی دیا۔ ابی اٹھو، ہمت ہے اور طاقت ہے تو مج سے مقابلہ کرو۔"

بستر پر لیٹے لیٹے میں اس دبلی پتلی دراز قد افغان النسل عورت کو دیکھ رہی تھی جو چاندی کے جھمکتے

زیور پہنے مجھ سے کشتی لڑنے پر آمادہ کھڑی تھی۔ کہہ نہیں سکتی کہ میں خوف زدہ زیادہ تھی یا اس منظر سے محظوظ زیادہ ہو رہی تھی۔ پل بھر کو تو میرے بدن میں بھی زور آزمائی کی تڑپ بجلی کے کوندے کی طرح گزری تھی۔ تن و توش میں وہ مجھ پر بھاری نہ تھی اور مجھے اپنی جسمانی طاقت پر کافی بھروسا بھی ہے، لیکن پھر اس کا بسورتا چہرہ دیکھ کر مجھے اس پر پیار آ گیا تھا۔ میں نے ہنسی چھپا کر اس سے کہا تھا:

"اچھا اچھا بی بی جان، آج میری طبیعت خراب ہے۔ مجھے بخار ہے، دیکھو۔" میں نے زبردستی اس کا ہاتھ اپنی کلائی پر رکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ چند لمحے وہ متذبذب سی کھڑی رہی اور پھر خاموشی سے کنڈی کھول کر باہر چلی گئی۔ دوسرے روز میں نے اسے گلے لگایا۔ وہ من گئی۔

"مگر بی گم ساب، آپ نے مجے گالی دیا!" میں نے اسے پیار سے سمجھایا کہ آوارہ گرد گالی نہیں۔ اس کا مطلب صرف گھومنے پھرنے کی شوقین ہو سکتا ہے۔ "ہم۔۔۔" وہ مطمئن ہو کر ہنسی اور مہندی اور خضاب گھولنے لگی۔ بی بی جان کے بال کچھ سفید ہو رہے تھے اور وہ بالوں میں خضاب لگاتی تھی۔

بال تو میرے بھی سفید ہو رہے تھے مگر میری خاص توجہ ان پر نہ تھی۔ "بی گم ساب، آپ کو بھی خضاب لگا دوں؟" وہ پیش کش کرتی۔

"نہیں،" میں کچھ مایوسی اور کچھ بے خیالی سے سر ہلا کر اسے منع کر دیتی۔ "بس جیسے قدرتی ہیں ویسے رہنے دو۔"

"ہم م!" وہ رازداری سے سر ہلاتی۔ رات دن کے ساتھ میں وہ ہماری ناآسودہ زندگی سے واقف ہو چکی تھی۔ "آپ کا خاوند آپ پر خیال نہیں کرتا؟" وہ چپکے سے کہتی۔ میں اس کی بات کا جواب نہ دیتی، یا کبھی کہہ دیتی: "ہاں،" اور پھر پل بھر کے لیے کوفت میں مبتلا ہو جاتی۔

"بی گم ساب، آپ فرشتی ہو،" بی بی جان پُرزور اصرار سے کہتی۔ اس کی بات سن کر میں خفیف ہو جاتی، بالکل بور ہو جاتی۔ صرف فرشتوں کے وجود پر یقین نہ کرنے کے باعث نہیں، بلکہ اس لیے کہ تاریخ کی وہ طویل ترین جنسی روزخوابی جو میرا مقدر تھی، میرے لاشعور تک میں فرشتوں کے خصائل میں شمار نہ ہو سکتی تھی۔

بس تو ایسی ہی تھی زندگی۔ بہت سی حقیقتیں شانہ بہ شانہ، سرِراہ ایستادہ۔ انقلابی اُمنگ اور ذاتی ناآسودگی، جو ایک دوسرے کا بال بھی بانکا نہ کر پائی تھیں اور برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھ ایک چھت کے تلے رہے چلی جا رہی تھیں، جیسے ایک دوسرے کی نفی کرنے سے قطعی معذور ہوں۔

بی بی جان نے میرے گھر ملازمت چھوڑ دی تھی۔ وہ محلے بھر کے مکینوں، ان کی بی بیوں اور ان کے نوجوان لڑکوں کی کارستانیاں مجھے سناتی تھی، اور پھر وضو کر کے نماز کے لیے کھڑی ہو جاتی تھی۔

ایک سہ پہر جب میں دفتر سے جلدی اٹھ کر گھر آئی تو بے خیالی میں اپنے گھر کی پیچ دار نیم تاریک سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں بی بی جان سے ٹکرا گئی تھی جو اس لمحے انقلابی کسان جماعت کے ایک کارکن

کی آغوش میں تھی اور ان کے لب ایک دوسرے سے پیوست تھے۔ ہوش سنبھال کر میں الٹے پاؤں زینے سے واپس آگئی تھی اور تھوڑی دیر تک اپنے دروازے کے باہر ہونقوں کی طرح کھڑی رہی تھی، یہاں تک کہ میرا دل ایک غیر متوقع احساسِ تفاخر اور بے نیازی سے بھر گیا۔ پھر میں دوبارہ زینہ چڑھتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی اور سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ایک رات بی بی جان مجھ سے زور آزمائی کرنا چاہتی تھی، مگر اس سہ پہر، ایک غیر مرئی کشتی میں جو ہم دو عورتوں کے زیریں شعور میں نہ جانے کب سے جاری تھی، بی بی جان اچانک چاروں شانے چت ہو گئی تھی۔

اتنے دنوں میں ہم دو عورتیں ایک دوسرے کی ہم درد تھیں، ایک دوسرے سے بہت اُنسیت محسوس کرنے لگی تھیں، تو پھر کیا اس کے باوجود ہم ایک دوسرے سے پنجہ کش تھے؟ یہ انکشاف مجھ پر صرف اس فتح کے واضح احساس نے کیا تھا جو اُس سہ پہر مجھ پر اچانک روشن ہوا۔ اسی لمحے مجھے یہ علم بھی ہوا تھا کہ اس کی ہم دردی (ترحم؟) کے لیے میرے مغرور دل میں کتنی مزاحمت تھی۔ کیا بی بی جان پر بھی یہ انکشاف ہوا تھا؟ کیوں کہ اس کے بعد وہ اپنا سامان اٹھا کر خاموشی سے میرے گھر سے چلی گئی تھی اور مجھے مدتوں بے طرح یاد آتی رہی تھی۔

اس کے کچھ عرصے بعد میرا مختصر خاندان سیاسی جکڑبندیوں اور حکومت کی جانب سے تھوپے ہوئے تابڑ توڑ خوف ناک مقدموں کے ہاتھوں طویل، ہفت سالہ، جلاوطنی سے دوچار ہو گیا تھا۔

***

اب اس لمبی سوچ سے ہم واپس آتے ہیں الما آتا کے کشادہ چوک پر، جہاں ایک شاعر کا مجسمہ ایستادہ ہے۔ ہم اس قزاخ شاعر کی ڈیڑھ صد سالہ برسی کی تقریب کے آغاز کے منتظر ہیں۔ چوک پر نو آزاد وسط ایشیائی ریاستوں کے کئی صدور جمع ہیں: ترکمانستان، کرغیزستان، تاجکستان، اُزبکستان، تاتارستان؛ نو آزاد، مسلمان اور روسیائے ہوئے۔ وہ چٹاچٹ ایک دوسرے کے رخساروں پر بوسے دے رہے ہیں۔

الما آتا کی سنہری دھوپ میں تاتاری حسینہ کسی سورج کی کرن کی طرح دمک رہی ہے۔

اور یہ ۱۹۹۵ ہے، صدی اپنی آخری سانسوں پر۔ الما آتا کے چھدرے سبز درختوں میں ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی ہے۔

سوویت یونین ختم ہوا۔۔۔ اور کمیونزم کا نظام بھی۔ جاتے جاتے یہ نظام قزاخوں کی اس سرزمین کو بلند و بالا عمارتیں، وسیع شاہراہیں اور سو فیصد خواندگی دے گیا ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہی کچھ تلخ یادیں بھی۔ سیمینار میں قزاخ ادیب نے کہا (سوویت نظام کی یادگار آلات سے اس کا فوری ترجمہ پندرہ زبانوں میں شرکا نے ہیڈفون لگا کر سنا):

"کمیونسٹ روسی حاکموں نے قزاخستان کے سرسبز میدانوں میں ایٹمی تجربے کیے۔ آج متعدد

مقامات پر ہمارے دریاؤں کا پانی اور میدانوں کی مٹی ایٹمی آلودگی کا شکار ہے۔"

سرد جنگ کی دو بڑی طاقتوں کی نفرت بھری پنجہ آزمائی کی یادگاریں: قزاخستان کا ایٹمی آلودہ پانی، اور امریکا کی ریاست نویڈا میں پلوٹونیم کے کئی ہزار ڈبے جن سے نجات پانے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آ رہا۔

قزاخستان میں آسمان تک بلند ہوتی مہنگائی، بڑھتی ہوئی جرائم کی شرح۔

کئی سچائیاں شانہ بہ شانہ ایستادہ، ایک دوسرے کا بال بھی بانکا نہ کرتی ہوئی۔

قزاخستان اب دیومالائی، پریوں کا دیس نہ تھا بلکہ ایک نوآزاد ریاست۔ مسلمان؟ ہاں مسلمان بھی۔ (کیا اب یہاں تحریکِ ختمِ نبوت کا آغاز ہوگا؟ کیا سپاہِ صحابہ یہاں آنے والی ہے؟ ہاں--- وہ جہاز بھر بھر کر آرہے ہیں---)

ایک ملک، تاریخ کے ایک نئے دوراہے پر۔

یہاں میں نے روسی دیکھے جو کئی نسلوں سے یہاں بس رہے ہیں۔ قزاخ قومیت رکھنے والے، مگر پھر بھی روسی۔ ان کے چہرے سپاٹ نہ تھے۔ حساس چہرے، نیلی آنکھیں، سنہری بال: گوگول، دستوئسکی اور تالستائی کے کردار۔ ہوٹل کے ریستوراں میں رات گئے ایک دبلا پتلا روسی لڑکا وائلن بجاتا ہے اور خاص ہماری میز پر بیٹھے مندوبین کے لیے وائلن پر ایک نغمے کی دُھن شروع کرتا ہے۔ دُھن ریستوراں میں گونجتی ہے اور بول ہمارے دماغوں میں صاف صاف اترتے ہیں:

"میرا جوتا ہے جاپانی، یہ پتلون انگلستانی

سر پہ لال ٹوپی روسی، پھر بھی دل ہے ہندوستانی"

ریستوراں میں بیٹھے قزاخ جھومتے ہیں۔ صرف ہم نہیں جھومتے، اس غلطی ہائے مضامیں پر جز بز، جب کہ دُھن کے ساتھ ہمارے ذہنوں میں راج کپور مارچ کررہا ہے۔

"ہندوستانی نہیں، پاکستانی---" ہم دانت پیس کر زیرِ لب بڑبڑاتے ہیں۔

"یہاں اتنے روسی اب تک کیوں ہیں؟" (ایک اٹھایا گیا سوال۔)

کیا انھیں نکالا جائے گا؟ اس وائلن نواز لڑکے کو، سڑک پر کھڑے ٹریفک کے سپاہی کو، منسٹری آف ٹرانسپورٹ کے انجینئر کو؟

تو پھر کون جیتا؟ میں نے سوچا۔ کیا میں قزاخوں کو آزاد دیکھ کر خوش تھی؟ ہاں، سچ یہی ہے کہ میں قزاخوں کو آزاد دیکھ کر خوش تھی۔ سوویت یونین کمیونسٹ تھا--- اور سامراجی بھی۔ یہ دونوں حقیقتیں ایک دوسرے کی نفی کرنے سے معذور تھیں۔

الما آتا امریکنوں سے بھرا ہوا ہے۔ امریکنوں سے، ترکوں سے جو اس نصف منگول اور نصف ترک نژاد قوم کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں۔ امریکن اس فکر میں ہیں کہ ان نوآزاد ریاستوں کو شدت پرست

اسلام پسند بن جانے سے باز رکھیں، اور دوبارہ روسی تسلط میں بھی نہ جانے دیں۔ اسلام پسند ان کے قابلِ رشک ایٹمی علوم سے کام لے کر انہیں جدید اسلامی ایٹمی کلب کا ممبر بنانا چاہتے ہیں، قزاخوں کو اسلامی مجاہدین کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں، مگر اس خدشے سے بھی کچھ پریشان ہیں کہ کہیں کماندار یہی روسیائے ہوئے گڈریے نہ بن بیٹھیں۔ شہر جاسوسوں سے بھرا ہوا ہے جو ہر قسم کی سن گن لے رہے ہیں۔

گلناز، جس کی کسی دور کی رشتہ دار بی بی جان نے ایک رات مجھ سے پنجہ آزمائی کرنی چاہی تھی اور میں جس سے بہت محبت کرتی ہوں (بی گم ساب، خدائی پاک کی قسم!)؛ گلناز، جو مجھے پشکن کی نظمیں سناتی ہے، اس نے یونیورسٹی میں ادب پڑھا ہے۔ "پشکن میں عرب خون تھا،" وہ کہتی ہے۔ وہ نسلاً خالص روسی نہیں تھا، اور اس نے روسی زبان گویا ازسرِ نو بنائی!

گلناز مسکراتی ہے اور کہتی ہے:

"اگر کسی بھی روسی کو ذرا سا کھرچیں تو اندر سے ایک مسلمان یا تاتار برآمد ہوگا۔ اتنے طویل عرصے تک ہمیں کولونائز کرنے نے ان کی فطرت کا خمیر ہم جیسا کر دیا ہے۔" گلناز ہنستی ہے۔ ہماری قزاخ مترجم گل سارا اس کی ہنسی میں شامل ہو جاتی ہے۔

"تو اب یہاں کے لوگ کس سمت جانا چاہتے ہیں؟" میں ان دونوں سے پوچھتی ہوں۔

"پتا نہیں!" گل سارا کہتی ہے۔ "لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ ہم تائیوان یا سنگاپور جیسا بننا چاہتے ہیں۔"

اس بات پر مجھے زور کی ہنسی آئی۔ اُفوہ! آخر کتنے ملک سنگاپور اور تائیوان بنیں گے؟ ہمیں وہاں جا کر دیکھنا تو چاہیے کہ یہ کیسے ہیں، جیسا کہ ہم بننا چاہتے ہیں۔

قزاخ مترجم گل سارا نے فزکس میں پوسٹ گریجویشن کی ہے، مگر اب وہ انگریزی سیکھ کر مترجم کا کام کر رہی ہے۔ اس نے آنکھوں پر نیلگوں آئی شیڈ لگایا ہے۔ وہ ایک بوتیک کھولنے کا سوچ رہی ہے۔

ہوا پتوں میں سرسرا رہی ہے۔

اور کل میں نے دو گلابی کبوتر زمین پر دانہ چگتے دیکھے ہیں۔

میں گل سارا کو نہیں بتاتی۔

جلاوطنی سے لوٹنے پر میں نے ملّا یوسف ضیائی کی بیوی اور بیٹی کو دیکھا تھا۔ کہاں؟

قصہ مختصر یہ کہ میرے بال اب زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ عمر اور بالوں کی سفیدی بڑھنے کے ساتھ ساتھ کسی جادو سے قدرتی رہنے کا جذبہ کمزور پڑ کر غائب ہو چکا تھا۔ میں اب اپنے بال رنگتی تھی جس کے لیے کسی سختی سے دبائی ہوئی پوشیدہ حسرت یا امید کا اعتراف تک ضروری نہ تھا۔

جلاوطنی سے واپسی کے چند برس بعد اپنے بالوں پر رنگ کروانے میں ایک بیوٹی پارلر میں گئی تھی۔ ملّا یوسف کی سات پردوں میں رہنے والی بیوی کو وہاں دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گئی تھی۔ ایک نوعمر حسین لڑکی

ان کے چہرے پر بیوٹی ماسک لگا رہی تھی۔

ہم دونوں وہاں ایک دوسرے کو دیکھ کر اتنے حیران ہوئے کہ اپنی بیئت کذائی اور جوانی سے چمٹے رہنے کی خواہش کے شرم ناک راز کے ایک دوسرے پر انکشاف (یعنی اُن کے منہ پر ہربل ماسک اور میرے بالوں میں مصنوعی سیاہی) پر شرمندہ تک ہونا بھول گئے۔ دیر تک ہم ایک دوسرے کی خیریت اور حال احوال پوچھتے رہے۔ ملا یوسف کی بیوی نے مجھے بتایا کہ پاکستان کی ہر دم بدلتی صورتِ حال سے دل شکستہ ہو کر ملا یوسف ضیائی اب امامت ترک کر چکے ہیں اور کھالوں کا کاروبار کرنے لگے ہیں۔

"آپ کی ایک بچی بھی تو تھی؟" میں نے یاد کیا۔

"ہاں وہی تو ہے یہ،" انھوں نے مجھے بتایا۔ "اسی کی خاطر میں یہاں آئی ہوں۔ یہ میرے چہرے پر پریکٹس کرنا چاہتی ہے۔ اس نے بیوٹیشین کا کورس کیا ہے۔"

تب، گلناز اور گل سارا، میں نے تمہاری اس چچیری بہن کو دیکھا۔ حسین خوش اندام، دبلی پتلی لڑکی، جس کے نازک لبوں پر تمہاری طرح شوخ لپ اسٹک لگی تھی۔ اس کے بال ترشے ہوئے تھے اور بیوٹی پارلر کے پنکھے کی ... سے اُڑاُڑ کر بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ وہ سخت پردہ، وہ طرزِ زندگی جس کو بچانے کی خاطر ملا یوسف ضیائی کے باپ دادا گھوڑوں اور خچروں پر سوار، سنکیانگ اور قزاخستان کے برف پوش پہاڑوں اور گھاٹیوں سے ایک پُر صعوبت سفر کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے، گزشتہ دس بارہ برس کے دوران کراچی میں چلنے والی ہواؤں میں کہیں دور اُڑ گیا تھا۔

وہ کہاں گیا؟

جہاں کمیونزم کا خواب گیا۔ ہواؤں میں سرسراتا ہوا، ہواؤں میں اڑتا، کہیں دور، بہت دور۔۔۔

تو پھر کون جیتا؟ میں نے خود سے سوال کیا۔

سوویت یونین کے ختم ہونے پر انگریزی جریدے "اکانومسٹ" نے اپنے اداریے میں لکھا تھا:

"بات یہ ہے کہ خوشی منانے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آ رہی۔ ایسا لگتا ہے کہ درحقیقت۔۔۔ جیتا تو کوئی بھی نہیں۔"

مگر، میں نے سوچا، گلابی کبوتر جیتے، گلابی کبوتر جو کسی مقابلے میں شامل نہ تھے۔

***

پس نوشت:

اور ہاں۔۔۔ جلاوطنی سے واپسی پر میں بی بی جان سے بھی ملی۔ اب وہ ایک دولت مند میمن گھرانے میں سب سے معتبر ملازمہ ہے۔ اس کی حیثیت کچھ کچھ چیف آف اسٹاف کی سی ہے۔ ریشمی، کڑھے ہوئے سوٹ میں وہ میرے گلے سے لپٹ گئی اور ہم دیر تک گلے مل مل کر خوشی سے ہنستے رہے۔ بی بی

Scanned with CamScanner

جان نے عقدِ ثانی نہیں کیا۔ اس نے اپنے بل بوتے پر اپنے دونوں بچوں کی پرورش کی، اور اب ان میں سے ایک، اس نے مجھے خوش ہو کر بتایا، فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔

**

اُدے پرکاش

جنوری ۱۹۵۲ میں چھتیس گڑھ آنچل کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دلی، میں تعلیم مکمل کی۔ شاعر اور کہانی کار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ٹائمز آف انڈیا پبلیکیشنز کے ہندی رسالے "دنمان" کے ادارتی عملے میں شامل ہیں۔ ۱۹۸۱ میں نظم "تبت" پر بھارت بھوشن اگروال ایوارڈ اور ۱۹۸۳ میں کہانیوں کے مجموعے "دریائی گھوڑا" پر اوم پرکاش ایوارڈ پایا۔ کہانیوں کا مجموعہ: "دریائی گھوڑا"۔ نظموں کے مجموعے: "سنو کاریگر"، "ابوتر کبوتر"۔

"آج" کے شمارہ ۱۸ ("ہندی کہانیاں") میں اُدے پرکاش کی دو کہانیاں "رام سجیون کی پریم کہانی" اور "ترچھ" شائع ہوئیں۔ آئندہ صفحات میں اُدے پرکاش کی جو نظمیں پیش کی جا رہی ہیں، وہ ان کے پہلے مجموعے "سنو کاریگر" میں شامل ہیں جو ۱۹۸۰ میں شائع ہوا تھا۔

Scanned with CamScanner

اُدے پرکاش

ہندی سے ترجمہ: اجمل کمال

تبت

تبت سے آئے ہوئے
لاما گھومتے رہتے ہیں
آج کل
منتر بُدبُداتے

اُن کے خچروں کے جھُنڈ
بغیچوں میں اُترتے ہیں
گیندے کے پودوں کو نہیں چرتے

گیندے کے ایک پھول میں
کتنے پھول ہوتے ہیں
پاپا؟

تبت میں برسات
جب ہوتی ہے

Scanned with CamScanner

تب ہم کس موسم میں ہوتے ہیں ؟

تبت میں جب تین بجتے ہیں
تب ہم کس سمے میں
ہوتے ہیں ؟

تبت میں
گوندے کے پھول ہوتے ہیں
کیا پاپا؟

لاما شنکھ بجاتے ہیں پاپا؟

پاپا،
لاماؤں کو
کمبل اوڑھ کر
اندھیرے میں
تیز تیز چلتے ہوئے دیکھا ہے
کبھی ؟

جب ل مر جاتے ہیں
تب اُن کی قبرو کے چاروں اور
سر جھکا کر
کھڑے ہو جاتے ہیں لاما

وہ منتر نہیں پڑھتے

وہ بُدبُداتے ہیں -- تبت
تبت تبت
تبت تبت

تبت تبت
اور روتے رہتے ہیں
رات رات بھر

کیا لاما
ہماری طرح ہی
روتے ہیں، پاپا؟

مرنا

آدمی
مرنے کے بعد
کچھ نہیں سوچتا

آدمی
مرنے کے بعد
کچھ نہیں بولتا

کچھ نہیں سوچنے
اور کچھ نہیں بولنے پر
آدمی
مر جاتا ہے

Scanned with CamScanner

سب سے اچھے دن

سب سے اچھے دن ہیں
یہ میرے

دوستوں کی خوب ساری چٹھیاں ہیں
پیار بھری
بچپن کی بے خوف
آزاد اُمنگیں ہیں

نوکری ملی ہے اور تھوڑے سے
روپے جن سے
اپنی پسند کی کتابیں اور
ایروگرام خرید سکتا ہوں میں
چائے پلا سکتا ہوں
دوستوں کو

چائے پیتے
ہنستے ہنستے دوست
کندھے پر ہاتھ مارتے ہیں
کہتے ہیں۔۔
چھوڑ یار، تجھے خوب
خوب جانتے ہیں ہم

تو میرے بھیتر
ایک گوریّا
پھُرر پھُدک پھُرر
ہو جاتی ہے

Scanned with CamScanner

پتنی کا چہرہ کتنا تو
شانت ہے
کیا میں اسے ٹھہری ہوا میں
ٹھنڈی جھیل کہوں ؟

میرے گھٹنوں کو پیڑ کا تنا سمجھتا ہے
میرا بچہ
دوڑ کر چڑھتا ہے
ڈگالوں پر جھولتا ہے
کوکتا ہے۔۔ کوؤوُو

تالی پیٹ کر غور سے
دیکھتا ہے مجھے
میں اُڑ گیا ہوں باہر پتنگیوں کی اور
یا بیٹھا رہ گیا ہوں
وہیں

سب سے اچھے دن ہیں یہ میرے
جنہیں دیا ہے مجھے
میرے بُرے دنوں نے
پہلی بار

نظم

میں نے جھک کر
اپنی کاپی میں لکھا
"پیڑ"

اور میں نے لمبے لمبے ڈگ بھر کر
جنگل کی اور غائب ہوتے دیکھا
پچھواڑے کے امرود کو

بیس سال سے
اُس امرود کے کندھوں پر بیٹھ کر
میں نے اس کے دیے
پھل کھائے تھے

بارش اور جاڑے کو
میں نے ہفتوں دھیرے دھیرے پکتے
دیکھا تھا

آپ جانتے ہوں گے
صبح صبح کی مہین ٹھنڈی ہوا
سب سے پہلے پتّیوں میں گھلتی ہے
مِصری کی طرح
پھر اُن کی سِہرن کے ساتھ ساتھ
ڈنٹھلوں تک پہنچتی ہے
اور پھلوں میں شِیتلتا اور شہد بن کر
تِھرا جاتی ہے

میں "پیڑ" لکھ کر
کیا اس امرود کے تنے پر
تین سال پُرانے چاقو کے گھاو کا درد
آپ تک پہنچا پاتا ہوں
یا پھلوں کے بھیتر
ترتوؤں کی مٹھاس اور مہک کا سواد
آپ کو دے پاتا ہوں

اتنی بڑی غلطی ہوئی
میں نے اِس اپنے سمبندھی کو
بیس سال پُرانی احسان مندی اور مہربانی کے باوجود
ایسا چلتاؤ سا نام دیا

میں کہنا چاہتا ہوں
مجھے معاف کرو
دادا، لوٹ آؤ
مجھے بھوک لگی ہے
اپنے اُلفت اور ہمدردی سے بھرے
پھل مجھے پروسو

میرے بھائی، جنگل میں
بڑی بھیڑ ہے
مجھ سے ناراض ہو کر
اُس گھٹن میں تو مت جاؤ
میں جانتا ہوں
اگر میں نے پھر پکارا تمھیں
"پیڑ" سمجھ کر

تو تم نہیں
باقی کا سارا جنگل
میرے پاس چلا آئے گا

سنو کاریگر

یہ بھی
کمزور سُوت سی نیند نہیں

جو اپنے آپ ٹوٹتی ہے

روز روز کی سخت مصیبتیں ہیں
جو آنکھیں کھول دیتی ہیں اچانک

سنو، بہت چپ چاپ پاؤوں سے
چلا آتا ہے کوئی دُکھ
پلکیں چھُونے کے لیے
سینے کے بھیتر آنے والے
کچھ اکیلے دنوں تک
بیٹھ جانے کے لیے

میں ایک اکیلا
تھکا ہارا کوی
کچھ بھی نہیں ہوں اکیلا
میری چھوڑی ہوئی ادھوری لڑائیاں
مجھے اَور تھکا دیں گی

سنو، یہیں تھا میں
اپنی تھکن، مایوسی، غصے
آنسوؤں، اکیلے پن اور
ایک آدھ چھوٹی موٹی
خوشی کے ساتھ

یہیں نیند میری ٹوٹی تھی
کوئی دُکھ تھا شاید
جو اَب صرف میرا نہیں تھا

اب صرف میں نہیں تھا اکیلا

اپنے جاگنے میں

چلنے کے پہلے
ایک بار اور پکارو مجھے

میں تمہارے ساتھ ہوں

تمہاری پکار کی انگلیاں تھام کر
چلتا چلا آؤں گا
تمہارے پیچھے پیچھے

اپنے پچھلے اندھیروں کو پار کرتا

صراحی

چکنی مٹّی کا
بے ڈول لوندا گھومتا ہے
گھومتی ہوئی چاک پر

مٹّی یوں ہی گھومتی رہے گی گھِرنی جیسی
گول گول گول
جب تک انگلیاں اسے تراشیں گی نہیں
اور بے کار مٹّی کھرونچ کر
چھانٹیں گی نہیں

انگلیوں کے بِنا
ماٹی ماٹی ہے
گھڑا نہیں

Scanned with CamScanner

انگلیوں کے بِنا
ماٹی ماٹی ہے
روٹی نہیں

تمہاری انگلیوں کے بِنا
پانی کیسے بھرے گا
ماٹی میں ٹھنڈا ٹھنڈا

اٹھو بھائی پریشر
آنتوں کے اشارے سے انگلیوں کو چھڑاؤ
ایک لوٹا پانی سرکاؤ
اور پھر
ہو جائے الہ آبادی آرٹ۔۔۔

رچاؤ پھر سے
یہ ماٹی آگ پانی کا کھیل
چھکاؤ اپنے پیٹ کو
دلاسا دو اپنی چُن مُن کی سسکیوں کو

بازار کے مطابق
تیار کرو صراحی
نہیں تو وہ گینڈا سا توندیل
ٹیڑھا میڑھا ہاتھی کا بچہ ٹھینگے دار کہے گا۔۔

"پریشرا، بول
ٹیڑھی کیسے ہے
صراحی کی گردن؟"

پِتا

پِتا
جھاڑ جھنکاڑ، گھاٹیوں اور پتھروں سے بھرے
چٹیل میدان میں،
پِتا
ساگوان، شیشم، ببول، تیندوؤں اور ہرنوں سے بھرے
بیہڑ تھے

بچپن میں اکثر
کسی اونچے ٹیلے پر چڑھ کر
میں آس پاس کے گاؤوں میں
للکار دیا کرتا تھا

ناکے کے پار
شہر تک میں
پِتا کا رعب تھا
ایک ایک عمارت پر
اُن کی کنیاں سرکی تھیں
ایک ایک دیوار پر
ان کی انگلیوں کے نشان تھے
ہر دروازے کے کاٹھ پر
ان کا رَندا چلا تھا

ناکے کے اس پار
جہاں سے گاؤں کی وِیراگنی شروع ہوتی ہے
ہر کھیت کی کٹھور چھاتی پر
پِتا اپنی کدُال
دھنسا گئے تھے

ہل کی ہر مُوٹھ پر
ان کی گٹھے دار ہتھیلیوں کی چھاپ تھی
ہر گریار بیل کے پُٹھوں پر
ان کے ڈنڈے کے داغ تھے۔۔۔

بچپن میں
پتا کے کندھے پر بیٹھ کر
میں بازار گھومنے جاتا تھا

پتا پہاڑ کی طرح
چلتے بھیڑ کے بیچ
ان کے کندھے پر مَیں
جنگلی توتے کی طرح بیٹھا رہتا

بعد میں پتا
غائب ہو گئے
کہتے ہیں کھیت، کدال
بیل، عمارت، اینٹیں، دروازے، بازار
انہیں بچا گئے

مجھے لگتا ہے
اُس چٹیل میدان
کے بھیتر (جو پتا تھے)
زمین کی دوسری تیسری پرتوں میں
سرکتا ہوا کوئی
نُم سوتا بھی تھا

جو محنت کرتے
پتا کی دیہہ کے علاوہ

کبھی کبھی میری آنکھوں میں بھی
رِسنے لگتا ہے

عمارت

کاریگر نہیں ہے
لیکن عمارت میں
کاریگر کا چہرہ پسینے میں
لت پت ہے

کاریگر کا چہرہ پسینے میں
لت پت ہے اِس لیے
عمارت کی دیواریں سیلن سے
بھر گئی ہیں

کاریگر کے شریر میں
جگہ جگہ زخم پک رہے ہیں
اس لیے عمارت کی دیواروں میں
دراریں پڑ گئی ہیں
اور نیو کو دیمک چاٹ رہی ہے

کاریگر بوڑھا ہو گیا ہے
اُس کے بال جھڑ رہے ہیں
اس لیے عمارت کے پلاسٹر
اکھڑ رہے ہیں

بہت بوڑھا ہو چلا ہے کاریگر
بہت پُرانی ہوئی عمارت

Scanned with CamScanner

ایک دن عمارت کا مالک
انجینیر کے ساتھ
عمارت کے معائنے پر آتا ہے

انجینیر عمارت کی جانچ
کرتا ہے

"کہاں ہے
کہاں ہے، کہاں ہے
کاریگر۔۔ کاریگر کو بُلاؤ
عمارت تو ہل رہی ہے
زور زور سے"
انجینیر کہتا ہے

نہیں جانتا انجینیر
یا جانتا ہے
کہ عمارت ہل رہی ہے
زور زور سے
کیوں کہ تین سو میل دور
گاؤں میں اپنی جھلنگی کھٹیا پر
پڑا ہوا کاریگر
کھانس رہا ہے زور زور سے

ڈاکیا

ڈاکیا
ہانپتا ہے
دُھول جھاڑتا ہے

Scanned with CamScanner

چائے کے لیے منع کرتا ہے

ڈاکیا
اپنی چپّل
پھر انگوٹھے میں سنبھال کر
پہنتا ہے

اور، منی آرڈر کے روپے
گِنتا ہے

سرکار

آئے
آئے چار جَن
آئے اور گاؤں کے باہر
چَوحدّی میں تمبو لگایا

چوحدّی میں بنا چبوترا
چُونے سے پیلا گیا
چار کرسیاں آئیں
چار ٹیبل لائے گئے

اور چاروں جَن
چار کرسیوں پر
ایک قطار میں بیٹھ گئے

پھر دھیرے دھیرے
گاؤں کے بوڑھے آئے

جوان آئے
بچے آئے
بہوئیں پتوہوئیں آئیں
بہنیں آئیں

سب ڈرے ڈرے
چاروں جنوں کے
چاروں اور بیٹھ گئے
کرسی کے نیچے
ٹیبل کے نیچے
چبوترے کے نیچے

چاروں نے چار کنٹھوں سے
ایک سُر میں کہا:
"ہمیں سرکار ہیں"
پھر چپ ہو گئے

چاروں میں سے ایک
جو خاکی تھا
اُس نے ہانک لگائی:
"دُکھن بہو حاضر ہووو!"

دُکھن بہو
دُکھن کی بیوی تھی
دکھن دُکھ بھوگتا فوت ہو گیا تھا
پانچ سال ہوئے

دکھن بہو نے کہا:
"سرکار لگان کی بابت

فریاد ہے
کہ بارش نہیں ہوئی
دھرتی جھُرا گئی
کھیت پھٹ گئے
گاچھوں کے پات
کھڑ کھڑ بجنے لگے۔۔۔

"کُٹھلا میں دانہ بھی نہیں
جو تھا سو ہم نے کھا لیا۔
جب کھا ہی لیا
تو کھیت میں چھینٹے کیا
سو لگان کی بابت
فریاد ہے۔۔۔"

"چپ رہو"۔۔۔ خاکی نے ڈانٹا
سفید نے آنکھ چڑھائی
پیلے نے جھڑکا
اور جو ست رنگا تھا
اس نے اپنا چشمہ ٹھیک کیا

پھر چاروں چار کنٹھ سے
ایک سُر میں بولے:
"ہم سرکار ہیں"

دکھن بہو بولی:
"جو سرکار ہو تو
رعایا کا دُکھ سمجھو
بارش کرو
کھیت میں فصل پیدا کرو۔۔۔

"تم کون سے سرکار ہو جو
راکھشس کی طرح آتے ہو
تباہی مچاتے ہو
سب سمیٹ بٹور کر لے جاتے ہو؟

"دُکھن تمہارے ڈر سے
چار مہینا جنگل میں لُکا رہا
پھر جانے کون سا
سرکاری باگھ اُسے کھا گیا۔۔۔"

خاکی نے کہا:
"بولتی بہت ہے یہ عورت"
سفید کھڑا ہوا
پیلا بڑبڑایا
اور ست رنگے نے قلم چلایا

نیچے لوگ جو دھرتی پر
بیٹھے تھے چُپ، وہ اٹھے
کھڑے ہوئے
تَن گئے
کُھس پُھس اُبھری
اور آپسی سمجھ داری کی
ندی بہنے لگی اُن کے بیچ

اُس ندی میں اونچی اونچی
غصیل لہریں تھیں
بھنور تھا اور پاگل دھار تھی
اور سب سے اونچی لہر پر
سوار تھی دُکھن بہو

پھر تھے دوسرے دوسرے
بے شمار، ان گنت، آپار لوگ

ایسی پاگل اور بے گوتی ندی کا
اتہاس کی کتابوں میں
کئی بار ذکر ہے
ویسی ہی ندی تھی یہ پہاڑی
کالی، مٹیالی، مغرور
سب کچھ ساتھ بہا کر لے جانے والی

تھے جو چار جَن
جو دُکھ کو سرکار بتلاتے تھے
گاہے بگاہے
بے دھڑک گاؤں میں آتے تھے
اور سب کچھ باندھ لے جاتے تھے

آج اُن کی ہوا بھی نہیں تھی
اُن کے چہرے
جستے کی طرح سفید تھے

دیکھا انھوں نے دیکھا
اپنی ڈوبتی آنکھوں سے دیکھا
کہ ایک ٹھاٹھ دار لہر اوپر اٹھی

سُنا انھوں نے سُنا
اپنے انتم سے انھوں نے صاف صاف سُنا
چبوترے کے چاروں طرف شور اٹھ رہا تھا:

"ہم سرکار ہیں"

مالک، آپ ناحق ناراض ہیں

مالک، آخر ہوا تو آپ کے کہنے سے نہیں چلتی،
دھوپ کا کیا کروگے آپ جو گِرے گی ہی
آپ کی برونیوں میں،
آپ کے اوپر چڑھ کر پھُدکیں گی ہی
روشنی کی نٹ کھٹ، چوکنّی گلہریاں

رنگوں پر تو بس نہیں ہے آپ کا
آپ جب بھی نہاریں گے
وہ کھلکھلائیں گے آپ کے خون میں
گھُس کر

ان سب کو منع تو نہیں
کر سکتے آپ

میں ٹھیک کہہ رہا ہوں مالک،
آپ ناحق ناراض ہیں
بھول جائیے بالکل اُن چیزوں کو
جن پر حکم نہیں چلتا آپ کا
آخر ہوا کِتنیا کہارِن تو ہے نہیں مالک،
جو کراہتی ہوئی
چوکا باسَن کرے آپ کا
بالٹی بھر بھر پانی
چھت تک چڑھائے
دو گھنٹے چھوٹے بابو کو بہلائے
اور پھر آپ کا
بچھونا بچھائے

آخر دھوپ سُرجا تو ہے نہیں مالک
جس کی قمیص آپ غصے میں پھاڑ دیں اور
جس کی کالی پیٹھ پر
اپنی چلمچی کے گل جھاڑ دیں

دھوپ سُرجا نہیں ہے مالک
جسے آپ اپنی بیٹھک میں اُکڑوں بٹھا کر
گریاتے رہیں
اور پیٹتے رہیں

اور رنگ،
رنگ آپ کے چاکر نہیں ہیں سرکار
جو آپ کا لحاظ کریں
حقہ بھر لائیں، سلام بجائیں
آپ کی ڈیوڑھی داری کریں

آپ کے بنی باروں کے بچے نہیں ہیں یہ
بھولے بھالے رنگ
جو آپ کو دیکھ کر
اپنے اپنے اوساروں میں چھپ جائیں
ان سب پر ناحق ہی بگڑ کر
اپنا خون جلا رہے ہیں آپ
بے بات کی بات بڑبڑا رہے ہیں آپ

آخر جیٹھ کی دھوپ میں
آنچ تو رہے گی ہی مالک
آخر ہوا میں دھوپ دھکڑ
تنکا پتا تو ہو گا ہی
آپ کے سامنے

کِستنیا کی طرح کھڑی تو نہیں رہے گی ہوا
سر جھکائے، ادب سے
چپ چاپ

مالک، یہ دھوپ ہے
جیٹھ کی، اصل
جیسے جیسے سورج چڑھے گا اور دھرتی گھومے گی
یہ اَور تپ تپائے گی
گرم لال لوہے کی طرح
اور موم کی طرح چُوئیں گے آپ

کلبلائیں گے
بلبلائیں گے آپ
کتنا ہی انگوچھا لگالیں سرکار

اور ہوا،
اس کے من کی بات تو مت پوچھیے مالک
جتنا ہی آپ غصائیں گے
اُتنا ہی سر پر دوڑے گی لنگھی پانی میٹتی ہوئی
آپ کی کوئی بات اگر اِس کے کھٹکے لگی
تو مت پوچھیے پھر سرکار
ہَوا بگڑا ٹھتی ہے تو قہر ڈھاتی ہے
کنگورے، گنبد، قلعے سب بکھیر ڈالتی ہے
جہازوں کو گیند کی طرح اُچھالتی ہے
ندیوں کو پھُوار بنا دیتی ہے
تِنکے کو بڑوا گن

آپ تو پھر کیا ہیں مالک!
بھُوسی کی طرح اُڑیں گے آندھڑ میں

پٹھنی کھائیں گے کھپریلوں میں
بے پردہ الگ ہو جائیں گے

اور نیچے دھرتی پر
اتنے سارے، اتنے سارے رنگ
سب کے سب
آپ کا مذاق بنائیں گے

گیم سینکچوری

ڈاک بنگلے میں جہاں شکار کے لیے
ٹھہرے ہوئے تھے نوجوان افسر
تھرمس میں سے کافی نکال نکال کر
پیتے، قہقہاتے... ٹھٹھ ٹھٹھ ٹھٹھ
"اَئی---می--- گوش" افسرنیاں کرتیں
کھِل کھِل، تاش کے پتے پھینٹتے جاتے

ہاتھی ہوتا سواری کے لیے تو جنگل کچھ اور ہوتا
ڈالیاں قریب ہوتیں سونیا
تمھارے گالوں کے--- ہا! ہا!

بوڑھا نوکر گمبھیر، غمزدہ آتا
ادب جتاتا ہوا، بھیتر بھیتر مسکراتا
سینتالیس سے پہلے جیسی ہی ہیں
ان نوجوان افسروں کی آنکھیں
وہی سب کچھ کھوجتی ہیں
اور میمیں تو ویسی ہی ہیں ہو بہو
بس ذرا سنولا گئی ہیں

Scanned with CamScanner

کولھے کچھ زیادہ بھاری ہو گئے ہیں اور
اُتنا پھُدک نہیں پاتیں
خوراک بھی ہے کچھ زیادہ--- گور نیں تو
ایک دو انڈا اور ایک آدھ سلائس بس---

نوکر پانی لے آؤ ٹھنڈا
دری بچھا دو نوکر اُس نیم کی چھاؤں میں
نوکر سلاد کاٹو
دوڑ کر بازار سے کاغذی نیبو لے آؤ
کاغذی نیبو صحت کے لیے مفید ہوتے ہیں
چربی گھٹتی ہے

یہاں کچرا ہے نوکر ذرا جھاڑو تو مار دو
کپڑے پریس ہوے کہ نہیں
دوپہر میں لنچ کیا بنایا ہے
سونیا نہائے گی پانی رکھو بالٹی میں
نوکر تم او نگھتے کچھوے کی طرح چلتے ہو

پتا نہیں ڈاک بنگلوں میں
ایسے بوڑھے، گندے اور سُست نوکر
کیوں رکھے جاتے ہیں
نوکر تو جوان اور چُست ہونے
چاہییں، میمیں ممیاتی ہیں

ڈاک بنگلوں میں آدی واسی بھیل کنیا
ہونی چاہیے، یہاں آئیں ہم تو لگے ہمیں
کہ ہم یہاں کے جن جیون کے ایک انگ ہیں
پورا ماحول بنانا چاہیے
آنے والوں کے لیے، گمبھیر کلا پریمی

Scanned with CamScanner

افسر کہتا ہے گمبھیر تا سے

نوکرانی ایسی ہو
کہ ہر بات میں ہنسے۔۔ کِھل کِھل
تو لگے جیسے ہزاروں جنگلی پھول
چٹک گئے ہوں
اور ایک بھولی ہرنی چونک کر
چوکڑی مار گئی ہو

نشے میں ہیں افسر
نشے میں ہیں میمیں

ڈولی، تمہارے گلے کے نیچے
ایک کیڑا چل رہا ہے
اجازت ہے؟ ہوہ! ہوہ!
ہے؟
نہیں۔
ہے؟
نہیں۔
ہے؟
ہے۔
تو۔۔۔

نوکر گیرج کا تالا کھولو
ذرا سلاد اور کاٹو
کیمرا، ریڈیو، باجا گاجا،
یہ ٹرنک، تھرمس جیپ میں رکھو

سنو نوکر،

ایک خالی گلاس اَور دے جاوٗ

نوکر، باوٗسیلی---
زندگی بھر یہ آدمی سوتا
رہا ہے

افسرنی تاش سمیٹتی ہے، اپنے
کپڑے سنبھالتی ہے، بوڑھے نوکر کو
گھورتی ہے غصّے میں
کلا پریمی افسر سمجھاتا ہے
نوکروں کے ساتھ ہمیں نرم ہونا چاہیے

نوکر، سائیکل چلا لیتے ہو؟
دوڑ کر بازار سے برف کی سِلّی لے آوٗ
انڈے بھی لے آنا نوکر

اے نوکر، ہمارے نوجوان
سُتین بابو کا تو کچھ خیال کرو
گمبھیر کلا پریمی افسر
دانت نکال کر آنکھ دباتا ہے بائیں

ڈولی اور سونیا ہنستی ہیں -- ہائی ہی ہی
گھنٹیاں ٹنٹناتی ہیں -- ٹُن ٹُن ٹُن

ڈولی کے گلے میں جل ترنگ ہے--- ہوہ! ہوہ!

جب بھی من پڑتا ہے
تمھیں تو بجا لیتے ہو باسٹرڈ--- کھی! کھی!

بوڑھا نوکر سنتا افسروں افسرنیوں کی باتیں
سب، گھرنی کی طرح گھومتا اِدھر سے اُدھر
اُدھر سے ادھر
بوڑھے نوکر کے پاؤں میں پھِرنی لگی ہے
کھانستا ہے بوڑھا نوکر۔۔ کھکھ۔۔۔ کھکھ۔۔۔
کانکھتا۔۔۔ اُونہہ۔۔۔ اُونہہ۔۔۔
برف کی سِلی ڈھوتا بوڑھا نوکر
کاغذی نیبو لاتا

سلاد کاٹتا
سلاد میں زیادہ مرچ ڈالتا
ڈولی اور سونیا کی بھی آنکھ ناک بہتی
گالیاں بکتیں، رومال لگاتیں
سونیا اپنی کانکھ کے بال کا پسینا
پونچھ کر سونگھتی
تمھارا نام کیا ہے نوکر؟

بوڑھے نوکر کو متلی آتی، میرا نام
نوکر ہے میم ساب، وہ کہتا، اور ہنستا
ڈاک بنگلے کا بوڑھا نوکر
دمہ ہوگا دمہ تمھیں
ہاتھی پاؤں ہوجائے گا پیروں میں
ٹُمیا کی دل کے مریض بنو گے
کولھے بل نہیں پائیں گے
گردے سے مواد آئے گا

فرنگیوں کی طرح سنو گے ایک دن
تم کہ پھر سے ایک اور سینتالیس آیا ہے
اُس رات گورا لاٹ اور اُس کی چھوکری

Scanned with CamScanner

رات بھر روتے رہے تھے۔۔۔

نوکر ایسا کرو
نوکر ویسا کرو
ٹھہرو نوکر، ادھر سنو
اسے اٹھاؤ نوکر، اُسے دھرو
جاؤ نوکر
آؤ نوکر

نوکر ہم جیپ میں بیٹھ کر
جنگل میں جائیں گے اور جھاڑیوں کے پیچھے
ڈولی اور سونیا کے ساتھ
پکنک منائیں گے

نوکر ٹفن لے کر تم بھی
جیپ کے پیچھے لٹک جاؤ

سوّر کے بارے میں کچھ کویتائیں

سوّر (۱)

ایک دن سوّر نے کہا
ہم خوش رہیں گے

وہ سارے دن
ہنستا رہا

Scanned with CamScanner

ایک دن سوَر نے کہا
ہم پیداوار بڑھائیں گے

وہ موٹا ہوتا
چلا گیا

ایک دن سوَر بولا:
باقی تو ٹھیک ہے
بس ہمیں محنت کرنی چاہیے
اُس دن سوَر
دن بھر سوتا رہا

ایک دن سوَر
صبح سے کچھ گھبرایا ہوا تھا
وہ کچھ بول نہیں سکا

اُس کے محلّے میں
صفائی محکمے کے اہلکاروں نے
ہڑتال کر رکھی تھی
انھیں پگار نہیں ملی تھی
بازار میں راشن نہیں تھا
سبزی غائب تھی
پھر بھی انھوں نے جانے کیوں
ایک بڑے سے چولھے پر
ایک بڑی سی کڑاہی چڑھا رکھی تھی

سوَر کڑاہی سے
ڈر گیا تھا

Scanned with CamScanner

سوَر (۲)

ایک اونچی عمارت سے
بالکل تڑکے
ایک تندرست سوَر نکلا
اور مگرمچھ جیسی کار میں
بیٹھ کر
شہر کی اور چلا گیا

شہر میں جلسہ تھا
فلیش چمکے
جَے جَے ہوئی
کافی بسکٹ بٹے
مالائیں اُچھلیں

اگلی صبح
سوَر اخبار میں
مسکرا رہا تھا
اُس نے کہا تھا
ہم ترقی کر رہے ہیں

اُسی رات شہر سے
چینی اور مٹی کا تیل
غائب تھے

Scanned with CamScanner

سوَر (۳)

ایک دن سوَر کو
خوب زوروں کا زکام ہوا

ناک بہنے لگی
گلے میں غرّاہٹ
اور کھانسی کے جھٹکے

ناک جب زیادہ بہے
تو اُسے پونچھنا تو ضروری ہے

ناک جب زیادہ بہنے لگی
تو سوَر نے
میمنے کو بُلایا

سوَر نے کہا:
"میمنے، اپنے نرم نرم
رووَں سے کتا
اُونی رومال مجھے دو
جو خوب صاف سفید ہو"

میمنا تین دن پہلے ہی تو
مُونڈھا گیا تھا
اُس کے رووَں سے کتی جیکٹ
سوَر نے پہن رکھی تھی
پھر میمنا اتنی جلد
اپنی پیٹھ پر
اور روئیں کیسے اُگاتا؟

Scanned with CamScanner

تو میمنا کچھ دیر سوچنے لگا
کچھ دیر سوچنے لگا
اس لیے کچھ دیر
چپ ہو گیا

تب تک سوٗر کی ناک
پھر بہنے لگی
سوٗر نے میمنے کو مارا
اُس کی کھال سے ناک پونچھی

پھر ایک ٹکڑا
درزی کو دیا
اور اپنے سر کے لیے
نرم نرم صاف سفید
ٹوپی سِلائی

سوٗر (۴)

سوٗر نے کہا:
ہرنوں نے شکایت کی ہے
کہ جنگل میں
گھاس کی کمی ہے

ہرنوں کی تعداد
زیادہ ہے
اور گھاس کم ہے

سوٗر نے کہا:

Scanned with CamScanner

ہرن جس تعداد میں
پیدا ہوتے ہیں
گھاس اُس مقدار میں
پیدا نہیں ہوتی

یہ کون سا طریقہ ہے
کہ ہرن
سوروں کی طرح بچے جنیں
پھر گھاس کی شکایت کریں

سوّر نے کہا:
چوں کہ ہرنوں نے
شکایت کی ہی ہے
اس لیے اب
ہرنوں اور گھاس کا
تناسب طے کرنا ہی ہوگا

ہرن کم ہوں گے
تو ایک ہرن کے حصّے میں
دن بھر زیادہ گھاس آئے گی

سوّر (۵)

دُنیا کے ہر بڑے شہر میں
سوّر کی عمارتیں تھیں
وہ ایک بہت بڑے مشینی پرندے پر بیٹھ کر
اُن شہروں کو جاتا تھا

دنیا میں جتنے ملک تھے
اُس سے کہیں زیادہ بڑے شہر تھے
اُس سے بھی کہیں زیادہ سوّر کی عمارتیں تھیں

ہر شہر کی
ہر عمارت میں
سوّر کی بیویاں تھیں

اس طرح دنیا میں
جتنے ملک تھے
اُس سے زیادہ شہر تھے
اُس سے زیادہ سوّر کی عمارتیں تھیں
اور اُس سے بھی کہیں زیادہ
سوّر کی بیویاں تھیں

ایک دن سوّر کو
ہر ملک کے ہر شہر کی
ہر عمارت میں رہنے بسنے والی
بیوی کی طرف سے بھیجے گئے
ایک ساتھ
کئی ٹیلی گرام ملے

سبھی میں سوّر کے
باپ بننے کی خبر تھی

سوّر بہت بڑے مشینی پرندے پر
بیٹھ کر
ہر شہر کی ہر عمارت میں گیا
اس کے کچھ دنوں بعد

Scanned with CamScanner

سوَر نے گول میز کانفرنس بلائی
جس میں سوَر کی
ساری بیویاں شامل ہوئیں

سوَر غصّے میں تھا
اُس نے غراتے ہوئے کہا:
"میرے کسی بھی بچے کا رنگ
میرے جیسا سیاہ کیوں نہیں ہے
ان کی کھال میری جیسی
کھردری، کٹھور اور ٹھونٹھ دار کیوں نہیں ہے
میرے جیسے تیکھے، مضبوط، نکیلے
کھیس کہاں ہیں
ان کی آنکھیں خرگوش کی طرح
پھوہڑ اور ڈرپوک کیوں
دکھائی دیتی ہیں؟

میری بیویاں بتائیں
کیا یہ میرے ہی بچے ہیں؟"

بیویوں نے اُسے سمجھایا:
"سنو ہمارے آقا،
کسی بھی سوَر کے بچے
شروع میں
سوَر نہیں ہوتے

وہ خرگوش اور میمنے سے بھی زیادہ
ملائم، نرم اور
گئے گزرے ہوتے ہیں
وہ تو ہم ہیں

جو اُنھیں پڑھاتے سکھاتے ہیں
نصیحتیں دیتے ہیں
ویسا ماحول بناتے ہیں

اس طرح
دھیرے دھیرے ہر روز
انھیں سوّر بناتے جاتے ہیں"

سوّر (٦)

سوّر نے دور جنگل میں
نیلے جھرنے کے پاس
ایک خوب صورت چڑیا کو
بانسری بجاتے سنا تھا

اُس نے سن رکھا تھا
کہ ہر نوں کا جوڑا
جب تنہائی میں ہوتا ہے
تو تان پورے کے تار چھیڑتا ہے

ایک دن سوّر نے کہا:
سنگیت اور کلا کے بنا
کوئی بھی سوّر
پونچھ کتا ہے
کلا میں سوّر کو ماہر ہونا چاہیے

سو سوّر نے
بانسری منگائی اور

تان پورہ منگایا

اُس نے محفل جُٹائی
اور تان پورے پر
کھیس اور کھُر
گھسنے لگا

تان پورے کے کئی تار ٹوٹے
کئی ڈھیلے پڑے

پھر سوَر نے
بانسری میں پھونک ماری

بانسری اور تان پورے پر
جتنے بھی سُر پیدا ہوئے
انھیں سن کر
اور دوسرے سوَر
مگن ہو، مُنڈ ہلانے لگے

سوَر نے کہا:
تو اس طرح کلا کے اِتہاس میں
سوَر سنگیت پیدا ہوا

ایک دن سوَر اُداس تھا
اُس نے کہا:
کیوں ہے ایسا کہ
سوَر سنگیت جب بجتا ہے تو
صرف سوَر سر ہلاتے ہیں
صرف سوَر گنگناتے ہیں

صرف سوَر مسکراتے ہیں

جب تک دوسرے
جل چَر، تھل چَرا سے نہیں اپناتے
تب تک سوَر سنگیت کا
سامراج کھنڈِت ہی رہے گا

سوَر سنگیت
کلا کا چکرورتی سمراٹ ہے

سوَر نے کہا:
ستا کو سوَر سنگیت کے
پھیلاو اور پرچار میں
جُٹ جانا چاہیے

اس طرح
ایک دن
سوَر نے
ہرن کو
دربار میں بلایا

بلایا اور ہرن کو اُس نے
دُوب کے ایک ہرے بھرے میدان میں
پوری طرح آزاد ہو کر
چرنے اور پھرنے کی اجازت دی

دُوب دھیرے دھیرے
ہرن کی آنکھوں میں چھانے لگی
ہرن کے دماغ کی اور

Scanned with CamScanner

جانے والی تمام نسوں میں
دُوب کی ہریالی
گشت لگانے لگی

اور تب
سوَر نے
اپنا
تان پورہ بجایا

ہرن نے شروع میں
دُوب کی اتھاہ گندھ میں ڈوب کر
باہ باد کی

باہ باد کی
پھر دھیرے دھیرے اُسے
سوَر سنگیت سچ مچ بھانے لگا
بھانے لگا
اور ہرن
سوَر سنگیت کے
دُرت اور ولمبت
گانے لگا

ہوتے ہوتے یہ ہوا
کہ ایک دن
ہرن کے لیے
سوَر سنگیت
دُوب کا ایک ہرا بھرا میدان بن گیا

اور ہوتے ہوتے یہ ہوا

کہ ہرن کے
خوب صورت چنچل کان
سوّر جیسے ہو گئے

اس طرح جب ہرن
ایک دن پوری طرح
سوّر بن گیا
تب سوّر نے اُسے
سوّر پیٹھ کا
سب سے اونچا اعزاز دے کر
سرفراز کیا

***

گریس اوگوٹ (Grace Ogot)

گریس اوگوٹ ۱۹۳۰ میں پیدا ہوئیں اور کینیا کے سنٹرل نیانزا نامی علاقے میں پرورش پائی۔ اوگوٹ نمایاں افریقی فکشن نگاروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ وہ نرس، مڈوائفری کی استاد، ریڈیو کی اسکرپٹ رائٹر اور براڈکاسٹر، اور کمیونٹی ڈویلپمنٹ آفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکی ہیں۔ ان کا ایک ناول *The Promised Land* شائع ہو چکا ہے، مگر ان کی بیش تر شہرت ان کی کہانیوں کی بدولت ہے جن کا مجموعہ *Land without Thunder* کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

جوناتھن ٹرائٹل (Jonathan Treitel)

جوناتھن ٹرائٹل ۱۹۵۹ میں لندن میں پیدا ہوے۔ ان کی تعلیم زیادہ تر کیلی فورنیا میں ہوئی جہاں انھوں نے فزی سسٹ کے طور پر کام بھی کیا۔ ان کی کہانی Stalin, Stalin and Stalin، جس کا ترجمہ صفحہ ۲۲۲ پر پیش کیا جا رہا ہے، "نیویارکر" کے ۲۱ ستمبر ۱۹۹۲ کے شمارے میں شائع ہوئی تھی اور بعد میں *The Minerva Book of Short Stories* کی جلد ۶ (۱۹۹۳) میں شامل کی گئی۔

Scanned with CamScanner

گریس اوگوٹ

انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمن

جگر خوار

سوڈان کے نیم صحرائی علاقے میں چھٹ برسات کا آغاز ہوا ہی تھا۔ اول وقت کی کُہر ابھی ابھی چھٹی تھی اور گرم دھوپ پڑنے سے گیلی زمین سے ہلکی نیلگوں بھاپ اٹھ رہی تھی۔

"پاتال والوں کے ہاں ہنڈیا چڑھ گئی!"

"پاتال والوں کے ہاں ہنڈیا چڑھ گئی!"

بچے ایک دوسرے کو گیلی ریت کے ڈلے مارتے ہوئے چلّا رہے تھے۔

"چل بھئی، اوپی جا،" تیکایو نے پکار کر اپنے لڑکے سے کہا۔ "میرا ہاتھ بٹا۔ دھوپ بہت تیز ہونے سے پہلے پہلے مجھے گائیں دریا تک لے جانی ہیں۔"

اوپی جاتے جاتے اپنے چھوٹے بھائی پر آخری بار مٹھی بھر کر ریت پھینکی اور تیکایو نے ادھوڑی کی تھیلی اٹھائی جس میں اس کا کھانا تھا، اور گایوں کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

ابھی وہ گھر سے زیادہ دور نہ گیا تھا کہ تیکایو کو سر پر ایک عقاب نظر آیا جو پنجوں میں گوشت کا بڑا سا ٹکڑا دابے اڑا جا رہا تھا۔ عقاب نیچا ہو کر اُڑ رہا تھا کیوں کہ وہ کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا جہاں بیٹھ کر اپنا پیٹ بھر سکے۔ تیکایو نے فوراً چھڑی پھینک کر ماری۔ چھڑی گوشت کو لگی اور وہ نیچے گر گیا۔ وہ کلیجی کا خاصا بڑا حصہ تھا اور تازہ لہو ابھی اس میں سے رس رہا تھا۔ تیکایو کلیجی کو پھینکنے ہی لگا تھا کہ اس نے ارادہ بدل دیا۔ اگر کلیجی بس پھینکنی ہی تھی تو عقاب سے اس کا نوالہ چھیننے کی کیا تُک تھی؟ کلیجی دیکھنے میں اچھی لگتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ ترکاری لے کر آیا تھا۔ کلیجی کے اضافے سے کھانے کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ اس نے کلیجی ایک پتے میں لپیٹ کر تھیلی میں ڈال لی۔

Scanned with CamScanner

وہ ایک ایسی جگہ جا پہنچا جہاں بہتیری گھاس تھی۔ تیکا یو نے گایوں کو چرنے چھوڑ دیا اور خود اوبیر کے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ ابھی دوپہر کے کھانے کا وقت نہیں ہوا تھا مگر تیکا یو سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ کلیجی کو چکھنے کی خواہش اس کے اندر بھڑک اٹھی تھی۔ اس نے کلیجی نکالی اور اوبیر کے پیڑ تلے لکڑوں کی آگ جلا کر بھونی۔ جب کلیجی بھن گئی تو وہ اسے ندیدوں کی طرح جوار کی روٹی سے کھا گیا جو اس کی بیوی نے رات پکائی تھی۔

"واہ جی واہ! کیسا لذیذ گوشت ہے،" تیکا یو نے بے اختیار کہا۔ انگلیوں پر لگی گاڑھی چکنائی کو چاٹتے ہوئے اس کا جی چاہا کہ کاش تھوڑی سی کلیجی کھانے کو اور مل جاتی۔ اس نے باقی ماندہ کھانا، جو کڑوی کسیلی جڑی بوٹیوں پر مشتمل تھا، اٹھا کر پھینک دیا۔ کلیجی اتنی ذائقہ دار تھی کہ جڑی بوٹیاں کھانے سے سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔

دھوپ بہت تیز ہو چلی تھی مگر گائیں دریا کنارے جا کر پیاس بجھانے کی طرف مائل نظر نہ آتی تھیں۔ وہ ایک ایک کر کے اِدھر اُدھر چھاؤں میں لیٹ کر جگالی کرنے لگیں۔ تیکا یو پر بھی سہ پہر کی تمازت غالب آ گئی۔ وہ پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر سو گیا۔

سوتے میں تیکا یو نے خواب دیکھا کہ وہ لکڑوں کی آگ جلائے کلیجی کا ایسا ہی بڑا سا ٹکڑا جیسا تھوڑی دیر پہلے کھایا تھا، بیٹھا بھون رہا ہے۔ بھنتے بوٹے میں سے گدز چربی ٹپ ٹپ آگ میں گرتی دیکھ کر اس کے منھ میں پانی آ گیا۔ اس سے صبر نہ ہو سکا۔ اس نے کلیجی کے پوری طرح بھننے کا انتظار بھی نہ کیا، اسے پہلے ہی آگ پر سے اتار لیا۔ شکاری چاقو سے کلیجی کے ٹکڑے کیے۔ لیکن ابھی وہ پہلا لقمہ منھ میں رکھنے ہی والا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔

تیکا یو نے حیران ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی کہ کلیجی آخر گئی کہاں؟ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا؟ "نہیں، نہیں،" اس نے زور سے کہا۔ "خواب اتنا صاف اور روشن کب ہوتا ہے۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ایک بار پھر اس امید میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ شاید کراماتی طور پر کہیں آس پاس لکڑوں کی آگ پر کلیجی کا ٹکڑا بھنتا نظر آ جائے۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اسے بس سال خوردہ درخت کی بڑی بڑی جڑیں دکھائی دیں جو زمین سے اس طرح اُبھری ہوئی تھیں جیسے روسلی مٹی میں شکرقندیاں دبی ہوں۔

گائیں بھٹک بھٹکا کر بہت دور نکل گئی تھیں۔ تیکا یو اٹھا اور ان کے پیچھے چل پڑا۔ چلتے چلتے دریا کا کنارہ آ گیا اور پیاس کی ماری گائیں دریا کی طرف دوڑیں۔ جتنی دیر گائیں پانی پیتی رہیں، تیکا یو ایک سفید پتھر پر بیٹھا پاؤں ٹھنڈے کرتا رہا اور الکسائے ہوئے انداز میں لبالب بہتے دریا کو دیکھا کیا جو زور شور سے میدان کی طرف رواں دواں تھا۔

دریا کے پرے بڑا بھاری "بھوت بن" واقع تھا۔ پُرنعمت گوشت کھانے کی شدید آرزو تیکا یو پر دوبارہ غالب آ گئی اور اس نے دبی زبان سے کہا: "جس جانور کی مزے دار کلیجی میں نے کھائی تھی وہ ضرور اسی جنگل میں ہو گا۔" وہ کچھ دیر وہاں بیٹھا سوچتا رہا۔ اس جانور کا شکار کھیلنے کی ہوس اسے ستا رہی تھی۔ لیکن

Scanned with CamScanner

اس نے اپنے ہَو کے پر قابو پا ہی لیا۔ سہ پہر خاصی ڈھل چکی تھی اور وہ گھر سے بہت دور تھا۔

اگلی صبح تیکایو معمول کے وقت سے پہلے ہی گھر سے نکل پڑا۔ بیوی نے منّت کی کہ دوپہر کا کھانا تیار ہونے کا انتظار تو کر لو، مگر اس نے ایک نہ سنی۔ شکار کھیلنے کے برچھے اٹھائے اور لپکا چلا گیا۔

تیکایو نے گایوں کے لیے گھاس چرنا ناممکن بنا دیا۔ وہ انہیں دوڑاتا ہوا لے چلا اور اگر کوئی گائے کسی جگہ ذرا ٹھٹک جاتی تو اسے مارنے لگتا۔ وہ گلّے سمیت "بھوت بن" کے کنارے جا پہنچا اور وہاں گایوں کو اکیلا چھوڑ دیا کہ جہاں جی چاہے چرتی پھریں۔

اسے کوئی لیک یا ڈگر "بھوت بن" میں جاتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ سارے کا سارا صبح سویرے کی اوس میں تربتر گھنی جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس کا انبار تھا۔ اور مع اختلاط پرندوں کی آوازوں کے سوا جنگل پر عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا جس سے تیکایو پر ہَول طاری ہو گیا۔ لیکن اس کے جی میں جو زور آور خواہش بسی ہوئی تھی اور وہ اسے گھنی گیلی گھاس میں اندھا دھند ہانکتی گئی۔

کچھ دیر تک چلنے کے بعد وہ رکا اور کان لگا کر سننے لگا۔ کوئی چیز اس کی طرف دوڑی آ رہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو واقعی ایک بڑا سا امپالا* بے تحاشا اس کی طرف دوڑا چلا آ رہا تھا۔ تیکایو کے بدن میں گرم لہو تیزی سے گردش کرنے لگا اور اس نے جانور کو مارنے کے لیے برچھا تان لیا۔ لیکن برچھا پھینکنے کی نوبت نہ آئی۔ ایک بڑی سی تیندوی، جو امپالا کا پیچھا کر رہی تھی، اس کے عین سامنے آ گئی۔ تیندوی تیکایو پر کئی مرتبہ گرجی جیسے اسے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے للکار رہی ہو۔ لیکن تیکایو نے آنکھ چرا لی، برچھا کانپتے ہاتھوں میں پکڑا کا پکڑا رہ گیا۔ لڑنے کو وہاں کوئی تھا ہی نہیں اور تیندوی اپنے شکار کے پیچھے چلی گئی۔

"کیسی خراب شروعات ہوئی،" تیکایو نے دل کی دھڑکن معمول پر آ جانے کے بعد ٹیر ٹیر کر دبی آواز میں کہا۔

"یہ جنگلی بلی اب میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔"

وہ اپنی بنائی ہوئی لیک پر الٹے پاؤں میدان کی طرف پھر گیا۔ تیندوی کو دیکھ کر اس کا دم ہوا ہو گیا تھا۔

اسے ایک اور ڈگر دکھائی دی جو جنگل کے اندر جا رہی تھی۔ وہ ذرا سا ہچکچایا اور پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی لیک چھوڑ کر نئی ڈگر پر چلا جائے۔ راستہ چوڑا ہونا شروع ہوا اور چوڑا ہوتا چلا گیا اور پھر اس سے پہلے کہ تیکایو کو کوئی سن گن ملتی، ولڈے بیسٹ** کا ایک پٹھورا اچانک سامنے آ گیا جو ایک پہاڑی کے دامن میں چرنے والی بڑی ڈار کے پیچھے جا رہا تھا۔ تیکایو نے بغیر کسی دقت کے اسے مار ڈالا۔ اس نے پٹھورے کی کھال اتاری، کلیجی نکال لی اور سر دھڑ وہیں پڑا رہنے دیا۔

---

* امپالا: بڑے جثّے کا بھورا افریقی ہرن

** ولڈے بیسٹ: بڑے جثّے کا بلدار سینگوں والا افریقی ہرن

Scanned with CamScanner

وہ اپنے گلّے کے پاس لوٹ آیا اور لکڑوں کی آگ جلا کر کلیجی بھوننے بیٹھ گیا۔ جب کلیجی بھُن گئی تو اس نے چکت ماری اور جلدی جلدی چبانے لگا۔ لیکن لقمہ اس کے حلق سے نہ اترا۔ اس نے جتنا چبایا تھا سارے کا سارا تھوک دیا۔ کلیجی انتہائی چرپری ہری بُوٹیوں جتنی بکسیلی تھی جو قبض میں مبتلا بچوں کو دی جاتی ہیں۔ تیکایو کو ایسے لگا جیسے اس کی جیبھ کا پچھلا حصّہ جل گیا ہو۔ اس نے باقی کلیجی پھینک دی اور گایوں کو لے کر گھر چلا گیا۔

تھکا ہارا اور مایوس وہ گھر پہنچا؛ اور جب جوان بیوی نے کھانا لا کے آگے رکھا تو اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ بہانہ یہ بنایا کہ پیٹ میں درد ہے اور کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ اس رات تیکایو بہت پژمردہ تھا۔ اس کی طبیعت جوان بیوی کی طرف بھی راغب نہیں ہوئی جو ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ صبح کو جوان بیوی دل شکستہ ہو کر اپنے جھونپڑے کو لوٹ گئی۔ وہ حیران تھی کہ اس کا مرد اس کی طرف ملتفت کیوں نہیں ہوا۔

جب تیکایو نے اپنے دروازے سے جھانکا تو باقی سب جھونپڑوں کے دروازے ابھی بند پڑے تھے۔ ٹھنڈی پُروا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا اور وہ جلدی سے دوبارہ دروازہ بھیڑ کر بیٹھ گیا۔

ذرا دیر ہو چلی تھی اور بچھڑے ڈکرا رہے تھے۔ لیکن بارش اتنی موسلادھار تھی کہ تیکایو دودھ دوہنا شروع نہ کر سکا تھا۔ وہ اپنے سخت بستر پر بیٹھا الاؤ کی ٹھنڈی راکھ کو دیکھتا رہا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پھر سے شکار کھیلنے نکل جائے۔

بارش تھمی تو تیکایو نے جلدی جلدی گایوں کو دوہا۔ جھونپڑے کے پاس دوپہر کا کھانا لا کر رکھ دیا گیا تھا۔ اس نے کھانا اٹھایا اور گاؤں سے نکل گیا۔ جس بیوی کا رات اس نے دل توڑا تھا وہ اسے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ گاؤں کے بڑے دروازے سے گزر کر اوجھل ہو گیا۔

"بھوت بن" پہنچا تو بوندا باندی دوبارہ شروع ہو گئی۔ جنگل اس قدر اُجاڑ اور سیلا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے حسب معمول گایوں کو چرتے چھوڑا اور جھاڑ بن میں قدم رکھا۔ وہ ٹپ ٹپ کرتے پتّوں میں دبے پاؤں چلتا گیا۔ جنگل کے زیادہ گنجان حصّے سے دور رہنے کے لیے بائیں طرف مڑا۔ قسمت یاور تھی۔ اسے ہرنوں کا ایک گُھم چرتا ہوا نظر آیا۔ ہرن اس سے زیادہ دور نہیں تھے۔ تیکایو گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھا یہاں تک کہ ان کے بالکل پاس جا پہنچا۔ پھر اس نے برچھا پھینک کر مارا اور ایک جانور کو فی الفور ہلاک کر دیا۔ کھال کھینچنے کے بعد اس نے کلیجی نکال لی اور گوشت کے چند عمدہ پارچے گھر والوں کے لیے کاٹ کر الگ کر لیے۔

جب وہ پیڑ کے نیچے کلیجی بھُوننے بیٹھا تو اسے پورا یقین تھا کہ وہ کامیاب ہو گیا ہے۔ لیکن جب اس نے کلیجی چکھی تو سر ہلا کر رہ گیا۔ گوشت خستہ تھا لیکن اس میں وہ خاصیت نہ تھی جس کی اسے تلاش تھی۔

وہ دریا کے کنارے جا پہنچا۔ پانی پینے کے بعد گایوں نے چرنے کا شغل جاری رکھا اور تیکایو، جو ابھی

Scanned with CamScanner

تک یہ تہیّہ کیے ہوئے تھا کہ اس عجوبہ کلغی والے جانور کو ڈھونڈ کر رہے گا، گھومتا گھامتا کہیں سے کہیں نکل گیا اور اسے یہ احساس ہی نہ ہوا کہ گلّہ بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ اچانک اس نے گھوم کر دیکھا تو گلّے کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ سورج کوہِ پاجولو کے عقب میں ڈوب رہا تھا اور تیکایو اپنی گایوں کو تلاش کرنے کے لیے در ڈنے دھوپنے لگا۔

گائیں، جن کے تھنوں سے دودھ ٹپکا پڑ رہا تھا، تیکایو کے بغیر ہی گھر کی طرف روانہ ہو گئی تھیں۔ کیوں کہ ایک دن تیکایو کے بچے جنگل میں رستہ بھول گئے تھے اور گائیں، اسی پرانی پگ ڈنڈی پر چلتی ہوئیں جو ان کی جانی پہچانی تھی، ان کے بغیر ہی گھر پہنچ گئی تھیں۔ اس دن پورا گاؤں بچوں کو تلاش کرنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ گاؤں والوں کو ڈر تھا کہ جنگلی جانوروں سے بچوں کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔

جب تیکایو گھر پہنچا تو اندھیرا ہو چلا تھا۔ انھوں نے دودھ دوہنا شروع کیا اور اودی پوچھنے لگا: "ارے بابا، آج تو تمھیں گھر آتے دیر ہو گئی۔"

"سچ کہتے ہو،" تیکایو نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ کالا بیل دیکھ رہے ہو اُدھر؟ یہ دریا پار کر کے ایک اَور گلّے میں جا ملا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ یہ غائب ہے۔ پلٹ چلنے کے سے خیال آیا۔ اب کسی دن اسے خصی کرنا پڑے گا۔ اس نے بڑا دق کیا ہے۔"

وہ چپ چاپ دودھ دوہتے رہے یہاں تک کہ گھرانے کی ایک لڑکی تھوڑا سا دودھ لینے آ گئی جو ترکاری کے سالن میں ڈالنے کے لیے درکار تھا۔

کھانے کا وقت ہوا تو خاندان کے سب مرد لکڑوں کی آگ کے گرد بیٹھ کر انتظار کرنے اور بتیانے لگے۔ مختلف جھونپڑوں سے ایک ایک کر کے باجرے کی روٹیوں کی چنگیریں اور مٹی کی رکابیوں میں گوشت اور ترکاری کے سالن آنے شروع ہوئے۔ مچھلی تھی، سکھایا ہوا گوشت تھا، تلی ہوئی دیمک اور جڑی بوٹیاں تھیں۔ تھوڑا سا سالن، آباؤاجداد کی خاطر، زمین پر ڈال دیا گیا اور اس کے بعد وہ کھانے میں مشغول ہو گئے۔ جو سالن ان کے سامنے تھے ان کی لذت کا موازنہ کرنے اور فرق بتانے لگے۔ لیکن تیکایو چپ رہا۔ اس رات جو چیز بھی اس نے کھائی وہ اسے پِت کی طرح کڑوی معلوم ہوئی۔

کھانا ختم ہوا تو بڑے چھوٹوں کو جنگوں اور قبیلوں کی کہانیاں سنانے لگے۔ وہ ان کی باتیں سن نہیں رہا تھا۔ وہ دھواں دھار بادلوں کو دیکھتا رہا جو آسمان پر اڑے جا رہے تھے۔

"ان بادلوں کے پچھواڑے، ان بادلوں کے پچھواڑے، میرا پردادا، او کین یو، بسرام کر رہے ہیں۔ دَیا کرو! دیا کرو!" تیکایو نے گڑگڑا کر کہا۔ "اے باپ، دَیا کرو، مجھے اس ہَوکے سے چھٹکارا دلا دو۔ مجھے میری مردمی لوٹا دو تاکہ میں اپنی بیویوں کی طرف راغب ہو سکوں۔ کیوں کہ وہ مرد ہی کیا جو اس رغبت سے محروم ہو۔"

ایک بڑے بادل نے چاند کو ڈھک لیا جس سے دنیا میں وقتی طور پر اندھیرا چھا گیا۔ آنسوؤں کی وجہ سے تیکایو کی آنکھوں میں جلن ہوئی اور اس نے اہلِ خاندان سے کہا کہ جا کر سو جائیں۔ جب اس نے اپنے

Scanned with CamScanner

جھونپڑے میں قدم رکھا تو ایک عورت چھوٹے چھوٹے کندے الاؤ میں ڈال رہی تھی۔

اس نے رفتگاں کی ارواح سے بار بار چوری چھپے دعا مانگی لیکن پُراسرار کلیجی کھانے کی تمنا کبھی اس کے دل سے فرو نہ ہو سکی۔ روزانہ صبح سویرے وہ اپنی گایوں کو ساتھ لے کر گھر سے نکل جاتا۔ اور جنگل کے پاس پہنچ کر انہیں اکیلا چھوڑ دیتا اور جا کے شکار کھیلنے لگتا۔ جو پُرصعوبت اور یاس انگیز زندگی تیکایو گزار رہا تھا وہ جلد ہی اس کے اہلِ خانہ پر واضح ہو گئی۔ وہ یکایک بوڑھا ہو گیا۔ اسے زندگی سے دل چسپی نہ رہی۔ رات کے وقت جب وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ الاؤ کے گرد بیٹھتا تو اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ ہوتا۔ اسے اپنی بیویوں کی طلب نہ رہی۔ تیکایو کے بیٹے لائیچ کے پاس گئے اور کہنے لگے: "اماں، ابا سے بات تو کرو۔ وہ بیمار ہیں۔ نہ ہم سے بولتے چالتے ہیں نہ کچھ کھاتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی توجہ کیسے حاصل کی جائے۔"

اگرچہ لائیچ عمر کے اس حصّے میں تھی جب عورت بچے جننے کے قابل نہیں رہتی اور اس نے رات کو تیکایو کے جھونپڑے جانا چھوڑ دیا تھا، لیکن وہ اس کی پہلی بیوی تھی اور تیکایو کو اس سے محبت تھی۔ لہذا وہ اس کے پاس گئی اور پوچھنے لگی: "اے میاں، تجھے کیا تکلیف ہے؟" تیکایو نے لائیچ کی صراحی دار گردن پر نظر ڈالی اور اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھنے لگا: "تُو پیتل کے ان وزنی کڑوں سے چھٹکارا پانا پسند کرے گی جو تیری گردن میں پڑے ہیں؟"

"کیوں؟" لائیچ نے قدرے متعجب ہو کر کہا۔

"کیوں کہ یہ اتنے تنگ معلوم ہوتے ہیں۔"

"لیکن یہ تنگ تو نہیں ہیں،" لائیچ آہستہ سے بولی۔ "ان کے بغیر مجھے یوں لگے گا جیسے ننگی ہو گئی ہوں۔"

اور تیکایو اپنی بیوی سے نظر ہٹا کر اَور طرف دیکھنے لگا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ لائیچ کو سب کچھ بتا دے اور اس پاگل بنا دینے والی خواہش کا بھید کھول دے جو اس کے تن بدن کے پُرزے اڑا رہی تھی۔ لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ لائیچ کو ہرگز خبر نہ ہونی چاہیے۔ وہ بات کو سمجھ نہ پائے گی۔ پھر اس نے لائیچ سے جھوٹ بولا۔

"مجھے پرانا عارضہ ہے بدہضمی کا۔ پچھلے کئی ہفتوں سے تکلیف میں مبتلا ہوں۔ جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

لائیچ کے ہونٹوں پر تمسخر آمیز مسکراہٹ کھیلنے لگی اور تیکایو سمجھ گیا کہ وہ قائل نہیں ہوئی۔ اتنے میں چند ملاقاتی آ گئے اور لائیچ شوہر کے پاس سے اٹھ گئی۔

تیکایو مہینوں شکار کھیلتا رہا لیکن اس جانور کو تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا جس کی مزے دار کلیجی اس نے کھائی تھی۔

ایک رات جب اس کی آنکھ نہ لگی تھی، لیٹے لیٹے، اس نے اپنے آپ سے پوچھا کہ وہ اَور کہاں جا کر

Scanned with CamScanner

شکار کھیلے۔ اور وہ جانور کون سا ہے جو اسے تلاش کرنا ہوگا؟ وہ "بھوت بن" میں تمام جانوروں کو مار چکا تھا۔ اس نے جان پر کھیل کر شیر ببر، تیندوے اور لکڑبھگے کا شکار کیا تھا اور ان کی کلیجی کھائی تھی۔ اور یہ تینوں جانور اس کے قبیلے پر حرام تھے۔

تیکایو کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ نیند کی جھپکی آئی تو اس نے شکر کیا۔ لیکن تب آپٹی سرہانے آ کھڑی ہوئی اور پکارنے لگی: "داداجان، داداجان، میں آئی ہوں۔" تیکایو اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن چھوٹی بچی وہاں نہیں تھی۔ وہ دوبارہ سو گیا۔ اور آپٹی آموجود ہوئی اور پکار کر بولی:

"آپ کو میری آواز سنائی نہیں دے رہی، داداجان؟"

تیکایو دوبارہ جاگ گیا۔ لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بغیر لیٹا رہا۔ بچی کی انگلیاں پھر سے بوڑھے کے جسم کو گدگدانے لگیں۔ تیکایو تیسری بار اٹھا اور کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن وہ اکیلا تھا۔ مرغ نے تیسری بار اذان دی اور صبح ہو گئی۔

اور لاپیچ اپنے شوہر کے راز سے آشنا ہوئے بغیر ہی فوت ہو گئی اور پہلی بیوی ہونے کے ناتے اُسے گاؤں کے بالکل بیچ میں دفن کیا گیا۔ تیکایو ایک مدت تک صبح شام اپنی بیوی کی قبر کے پاس بیٹھا رہا اور لاپیچ کے غم کے مارے نامعلوم جانور کی کلیجی کی جو بھوک اسے لگی رہتی تھی وہ جاتی رہی۔ وہ روتا رہا مگر اس طرح جیسے اسے چین آ گیا ہو، جیسے کلیجی کھانے کی طلب بیوی کے ساتھ ہی دفن ہو چکی ہو۔

سوگ کے انھیں دنوں میں تیکایو نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی شکار کھیلنے نہ جائے گا۔ وہ گھر بیٹھ کر اپنے ڈھیر سارے پوتے پوتیوں پر نظر رکھتا اور خاندان کے نوجوان افراد روز باہر جا کر کھیتوں میں کام کاج کرتے۔

اور پھر ایک دن تیکایو صبح صبح کھلیان کے پاس بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ اندھیرے کھلیان میں جمع اناج میں جو انکھوے پھوٹ رہے تھے ان کی باس سے اس کی طبیعت ذرا مالش کرنے لگی۔ اپنے پوتے پوتیوں کو شوروغل مچاتے اور گیت گاتے سنا تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ انھیں کھیلتے ہوئے دیکھ کر اس نے حیران ہو کر سوچا۔۔۔ کیا دنیا کا کوئی جاندار ایسا بھی ہے جس کی کلیجی اس نے نہ چکھی ہو؟ وہی پرانی خواہش اس طرح عود کر آئی کہ اس کا بدن اندر سے دُکھنے لگا۔

ان بچوں میں جو وہاں کھیل رہے تھے، آپٹی نام کی ایک چھوٹی سی خوب صورت بچی بھی تھی۔ وہ تیکایو کے سب سے بڑے لڑکے کی بیٹی تھی۔ تیکایو نے بچوں سے کہا کہ وہ کہیں اور جا کر کھیلیں اور جب وہ وہاں سے جانے لگے تو اس نے آپٹی کو آواز دی اور کہا: "چلو، میری ننھی بٹیا، دوڑ کے اپنی امی کے جھونپڑے میں جاؤ اور میرے لیے تونبے میں پانی لے آؤ۔"

آپٹی پانی لینے اپنی ماں کے جھونپڑے چلی گئی۔ جب وہ گھر کے ایک اندھیرے کونے میں ادھر اُدھر ہاتھ مار رہی تھی تو اسے یہ علم نہ تھا کہ تیکایو دبے پاؤں بڑی تیزی سے اس کے پیچھے پیچھے اندر گھس آیا ہے۔ اس نے اپنی گردن پر دو کھردرے ہاتھوں کی گرفت محسوس کی۔ بچی کا جسم ڈھیلا پڑ کے تیکایو کے

Scanned with CamScanner

ہاتھوں سے پھسل گیا اور دھم سے فرش پر جا گرا۔ اپنے قدموں میں پڑی لاش کو دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے اس کا جی متلا رہا ہو، جیسے وہ غش کھانے والا ہو۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ اس نے لاش اٹھائی اور جب وہ اسے اٹھا کر لڑکھڑاتا ہوا باہر آیا تو فضا تاریک معلوم ہو رہی تھی اور ہوا میں اڑنے والے پرندے نحوست بھرے انداز میں اس پر چلچلا رہے تھے۔ لیکن تیکایو کو تو اپنا پیٹ بھرنا تھا۔ اس نے قریب میں واقع ایک دیمک ٹیلے میں اُتھلا سا گڑھا کھود کر آپٹی کو توپ دیا۔

جب تیکایو ہتھیلی میں کلیجی لے کر واپس آیا تو باقی بچے ابھی میدان ہی میں کھیل رہے تھے۔ اس نے جھونپڑے میں بیٹھ کر کلیجی کو جھٹ پٹ بھونا اور ندیدوں کی طرح کھالی۔ اور افسوس! یہی وہ شے تھی جس کی اسے اتنے برسوں سے تلاش تھی۔ وہ الکسائے ہوئے انداز میں کھلیان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ڈکارنے اور دانتوں میں خلال کرنے لگا۔ بھوکے بچے، کھلے میدان سے کھیل کود کر پلٹے تو چھاؤں میں بیٹھ کر شکر قندیاں کھانے اور چھاچھ پینے میں مصروف ہو گئے۔

بڑی عمر کے لوگ شام پڑے واپس آئے اور بچے اپنے والدین سے ملنے دوڑے۔ لیکن آپٹی ان کے درمیان موجود نہ تھی۔ بہت ہی بوکھلا کر انھوں نے دادا سے بچی کے بارے میں دریافت کیا۔ لیکن تیکایو نے جواب دیا: "بچوں سے پوچھو۔ انھیں پتا ہونا چاہیے کہ آپٹی کہاں گئی۔ یہ سب مل جل کر میدانوں میں کھیلتے پھر رہے تھے۔"

اس وقت تک اندھیرا گھُپ ہو چکا تھا۔ آپٹی کے چھوٹے بھائی بہن الاؤ کے سامنے بیٹھ کر اپنی ماں کے ساتھ رونے دھونے لگے۔ تب انھیں یاد آیا کہ دادا نے آپٹی کو پانی لا کر دینے کے لیے بلایا تھا۔ بے اوسان والدین نے یہ اطلاع بڑے میاں کے سامنے دُہرائی اور پوچھا کہ کیا آپٹی نے صبح اسے پانی لا کر دیا تھا۔

"دیا تھا،" تیکایو بولا، "اور پھر بھاگ کر اُدھر چلی گئی تھی جدھر باقی بچے گئے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھا۔ جب بچے واپس آئے تو میں سو رہا تھا۔"

غم سے نڈھال گھر والے سر پکڑ کر الاؤ کے پاس بیٹھ گئے۔ نہ انھوں نے کچھ کھایا نہ پیا۔ باہر چھوٹے چھوٹے جھینگر یوں بول رہے تھے جیسے کوئی غم گین کہانی سنا رہے ہوں۔ تیکایو کو لگا کہ وہ معمول سے زیادہ بلند آواز میں جھنگار رہے ہیں۔

آپٹی کے ماں باپ بہت دن تک بچی کو ڈھونڈتے رہے۔ انھوں نے چپّا چپّا چھان مارا۔ لیکن اس کا کہیں سراغ نہ ملا۔ وہ غائب ہو گئی تھی۔ مہینے گزر گئے اور لوگوں نے آپٹی کی گمشدگی کا ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا۔ صرف ماں کو آپٹی یاد آتی رہتی تھی۔ وہ ابھی تک پُرامید تھی کہ ایک نہ ایک دن اپنی بچی اسے زندہ سلامت مل جائے گی۔

تیکایو کو یاد بھی نہ رہا کہ اس سے کیا حرکت سرزد ہوئی تھی۔ اور جب اس نے اپنی وحشیانہ اشتہا کی تسکین کے لیے ایک اور بچے کی جان لی تو اسے احساس تک نہ ہوا کہ وہ کر کیا رہا ہے۔ جب پریشان والدین

نے بچے کے بارے میں تیکایو سے پوچھا تو وہ رو کر کہنے لگا: "مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے؟ بچے تو اُدھر باہر میدانوں میں کھیلتے پھرتے ہیں۔ میں گھر بیٹھا رہتا ہوں۔"

اس سانحے کے بعد تیکایو کے بیٹوں نے آپس میں بات کی۔ "ہمارے بچے کون چُرا کر لے جا رہا ہے؟ یہ کون سے جانور کا کام ہے؟ کیا یہ لکڑبگھے کی حرکت ہے؟ یا تیندوے کی؟ لیکن یہ جانور تو صرف رات کو شکار کرنے نکلتے ہیں۔ کہیں یہ کسی عقاب کی کارستانی تو نہیں کیوں کہ وہ دن کے وقت شکار پکڑتا ہے؟ لیکن نہیں! عقاب ہوتا تو ابا کو نظر آ جاتا۔ وہ بچوں کی چیخوں کی آواز سن لیتے۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد آگندا نے اپنے بھائیوں سے کہا: "شاید یہ کوئی موذی جانور ہے جسے بدروحوں نے ہم پر مسلط کر دیا ہے۔"

"پھر تو میرے ابا اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں کہ بچوں کی نگہبانی نہیں کر سکتے،" اوسوگو بول اٹھا۔

"ہاں، ابا بہت ضعیف ہو گئے ہیں، ان کی جان بھی خطرے میں ہے،" باقیوں نے اتفاق کیا۔

اور اس وقت کے بعد سے بیٹے پوشیدہ طور پر اپنے باپ اور بچوں پر نظر رکھنے لگے۔ وہ کئی مہینے تک نگرانی کرتے رہے لیکن بڑے میاں اور بچوں پر کوئی آفت نہ آئی۔

بیٹے اس چوکی پہرے کو تقریباً ترک ہی کرنے والے تھے۔ لیکن ایک روز پہرہ دینے کی باری آپٹی کے باپ کی تھی۔ اس نے دیکھا کہ تیکایو نے بچوں سے کہا کہ وہ جا کر دور کہیں کھلے میدان میں کھیلیں مگر ایک بچے کو روک لیا۔ تیکایو نے بچے سے کہا کہ جا کر اس کے جھونپڑے سے پائپ اٹھا لائے۔ جب بچہ دوڑا دوڑا جھونپڑے کی طرف گیا تو تیکایو اس کے پیچھے ہو لیا۔ اس نے خوف زدہ بچے کو جا دبوچا اور اس طرف گھسیٹنے لگا جہاں الاؤ روشن کیا جاتا تھا۔ جب تیکایو بچے سے زور آزمائی کر رہا تھا تو اس کی بوڑھی کمر پر بڑے زور کا گھونسا پڑا۔ بچے کی گردن کو دونوں ہاتھوں سے اسی طرح پکڑے پکڑے تیکایو نے فوراً مڑ کر دیکھا۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا، آگندا، سامنے کھڑا تھا۔ تیکایو کے ڈھیلے پڑتے ہاتھوں سے بچے نے خود کو چھڑا لیا اور آگندا کے گھٹنے پکڑ لیے۔ "ابا!" آگندا نے چیخ کر کہا۔

یہ دیکھ کر کہ بچے کو کوئی گزند نہیں پہنچی تھی، آگندا نے اسے پرے دھکیل دیا اور کہنے لگا: "اپنی ماں کے جھونپڑے میں جا کر لیٹ جاؤ۔"

پھر اس نے بوڑھے کو پکڑ لیا اور گھسیٹتا ہوا اس چھوٹے سے جھونپڑے کی طرف لے چلا جو بھیڑ بکریوں کے لیے مخصوص تھا اور جس میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ جب اسے گھسیٹ کر لے جایا گیا تو بوڑھا زور زور سے یہی رٹ لگائے رہا: "اتیموانگعو؟ اتیموانگعو؟" -- "میرا کیا قصور ہے؟ میرا کیا قصور ہے؟"

آگندا نے بوڑھے کو چھوٹے جھونپڑے میں دھکیل کر باہر سے دروازہ اس طرح زنجیر کر دیا جیسے اندر کوئی جانور بند کیا گیا ہو۔ وہ بچے کے پاس چلا گیا جو اب تک سسکیاں بھر رہا تھا۔

خاندان کے باقی لوگ کھیتوں میدانوں سے لوٹ کر آئے اور جب آگندا نے یہ خبر انھیں سنائی تو وہ دہشت زدہ ہو گئے۔ اہلِ خاندان نے ماتمی لباس پہن لیا اور کھانا نہ کھایا۔

"تھو! تھو!" انھوں نے سورج کی طرف منھ کر کے تھوکا جو ان کے لیے غروب لیکن ان کے اجداد کے لیے طلوع ہونے والا تھا۔

"اے ہمارے پرکھو، ہمیں پاک کر دو!" ان سب نے پکار کر کہا۔

اور پھر انھوں نے بہت بڑا الاؤ جلایا۔ گاؤں میں اتنا زبردست الاؤ پہلے کبھی روشن نہ کیا گیا تھا۔ تیکایو کا سب سے بڑا بیٹا باپ کے جھونپڑے سے وہ پرانا، چربی سے چکنا ڈھول اٹھا لایا جو الاؤ کے اوپر ٹنگا رہتا تھا، اور اسے بجانے لگا۔ دھم دھم بجتے ڈھول کی غم آلود دھُنوں نے قبیلے کو خبردار کر دیا کہ تیکایو کے ہاں کوئی افسوس ناک واقعہ پیش آیا ہے۔ ڈھول بجتا سن کے لوگ اپنے سب کام کاج چھوڑ کر تیکایو کے گاؤں کی طرف دوڑ پڑے۔ ڈھول کی آواز ان کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں میں رشتے داروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے جن کے چہروں سے پریشانی عیاں تھی۔

"کیا خبر ہے؟ کیا خبر ہے؟" یہ پوچھتے ہوئے ان کی آوازیں کانپ رہی تھیں۔

"اور تیکایو کہاں ہے؟" ایک اور بوڑھے آدمی نے دریافت کیا۔

"اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" کسی اور نے پوچھا۔

وہاں ابتری اور سراسیمگی کا عالم تھا۔

"موت کی موت، موت کی دوا ہمیں کون لا کے دے گا؟ موت تمھارے دروازے پر دستک دیتی ہے اور تمھاری طرف سے اندر آنے کی اجازت ملنے سے پہلے ہی گھر میں آ دھمکتی ہے۔"

"سنو،" کسی نے اس بڑھیا کو چھو کر کہا جو موت کے بارے میں آہ و زاری کر رہی تھی۔ آگندا نے لوگوں سے خطاب کیا۔

"اے میرے قبیلے کے لوگو! ہم نے تمھیں یہاں خواہ مخواہ نہیں بلایا۔ جو میں کہتا ہوں سنو اور ہمارے غم میں شریک ہو۔ ہمارے ساتھ مل کر روؤ۔ کئی مہینے ایسا ہوتا رہا کہ ہم تو باہر کھیتوں میدانوں میں اپنا کام کاج کرتے اور ادھر ہماری عدم موجودگی میں ہمارے بچے غائب ہو جاتے۔ سب سے پہلے میری اپنی بچی آپٹی گم ہوئی۔" بچوں کے نام سن کر عورتوں کے درمیان سے سسکیوں کی آواز آنے لگی۔

"اے میرے لوگو!" آگندا نے بات جاری رکھی۔ "اس قبیلے کے بچے بیمار ہو کر مرتے ہیں۔ لیکن ہمارے بچے ایسے غائب ہوئے کہ ان کو دفنانے کی نوبت تک نہ آئی۔ ہم نے سوچا کہ بچوں پر پہرہ دیا جائے تاکہ جو کوئی بھی ہمارے بچے اٹھا کر لے جاتا ہے اسے پکڑا جا سکے۔ کئی مہینے ہم چوری چھپے پہرہ دیتے رہے۔ ہم اس نگرانی کو تقریباً ختم کرنے ہی والے تھے کیوں کہ ہمارا خیال تھا کہ غالباً ہم پر ہمارے آبا و اجداد کی طرف سے عذاب نازل ہوا ہے۔ لیکن آج میں نے اسے پکڑ لیا۔"

"کون ہے وہ؟ کون ہے وہ؟" لوگوں نے غصّے میں آ کر معلوم کرنا چاہا۔

"اور اس کا کس قبیلے سے تعلق ہے؟" دوسروں نے پوچھا۔

"ہمیں لازمی طور پر اس قبیلے کے خلاف اعلانِ جنگ کر دینا چاہیے۔ یہ ہم پر فرض ہو گیا۔ فرض ہو

Scanned with CamScanner

گیا۔"

آگندا ذرا کے ذرا رکا اور پھر اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں انہیں بتایا: "وہ آدمی اُس چھوٹے جھونپڑے میں ہے۔ اور وہ کوئی اَور نہیں میرا ہی باپ ہے۔"

"ہائے ہائے،" عورتیں چیخ اٹھیں۔ دھکم پیل ہوئی اور عورتیں اور بچے اس طرح چیخنے جیسے تیکایو ان کے آس پاس موجود ہو اور انہیں اس سے ڈر لگ رہا ہو۔ لیکن مرد خاموش رہے۔

جب افراتفری ختم ہوئی تو ایک بوڑھے نے پوچھا: "کیا تم سچ کہہ رہے ہو میاں؟"

بیٹے نے سر ہلایا۔ اب مرد عورت چلا چلا کر کہنے لگے: "کہاں ہے وہ آدمی؟ مار ڈالو، اسے مار ڈالو۔ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ وہ جانور ہے۔"

باہر کہی جانے والی کوئی بات بھی ایسی نہ تھی جو تیکایو کو سنائی نہ دی ہو۔ اور جھونپڑے میں وہ بچے جن کا اس نے خون کیا تھا اس کے اوسان پر سوار تھے۔ وہ جھونپڑے کی کھردری دیوار پر سر ٹکا کر لیٹ گیا اور رو پڑا۔

جھونپڑے کے باہر گاؤں والوں نے، جنہیں غصہ چڑھا ہوا تھا، اپنا مطالبہ جاری رکھا۔ وہ چیخ رہے تھے: "اسی وقت سنگسار کر دو اسے۔ اسی وقت سنگسار کر دو اسے۔ اس نے خود اپنی ہلاکت کا سامان کیا ہے۔"

لیکن بڑے بوڑھوں میں سے ایک آدمی اٹھا اور اس نے لوگوں کا جوش ٹھنڈا کیا۔ "ہم اسے اس وقت سنگسار نہیں کر سکتے۔ قبیلے کا دستور ہے کہ جو آدمی موذی بدذات ہو اسے ان دیہاڑے گاؤں کے باہر سنگسار کیا جائے۔ ہم اس دستور سے روگردانی نہیں کر سکتے۔"

"مجھے اسی وقت سنگسار کر دو، مجھے اسی وقت سنگسار کر دو،" تیکایو نے سرگوشی کی۔ "مجھے جلدی سے اس عذاب اور شرمساری سے نجات دلاؤ۔ مجھے مر جانے دو تاکہ میرا اٹنٹنا ختم ہو۔

مردوں کی غصیلی ہوا اور خوف زدہ عورتوں اور بچوں کی مہین چیخیں سن کر تیکایو سمجھ گیا کہ معاشرہ اسے دھتکار چکا ہے، یہی نہیں، اس سے زندہ رہنے کا حق بھی چھین چکا ہے۔ اس نے اپنا شکاری چاقو تلاش کرنے کے لیے کمر سے بندھی ادھوڑی کی تھیلی کو ٹٹولا۔ لیکن چاقو تھیلی میں نہ تھا۔ چاقو اس سے چھین لیا گیا تھا۔ باہر لوگ برابر شور کرتے اور بڑبڑاتے رہے۔ رونے دھونے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ تیکایو اب یہ سب کچھ بہت فاصلے سے سن رہا تھا جیسے کوئی زور آور موج اسے اپنے لوگوں سے دور بہت دور لیے جا رہی ہو۔

صبح سویرے گاؤں والے الاؤ کے پاس سے اٹھے تاکہ آس پاس کے میدانوں میں جا کر پتھر اکٹھے کریں۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا لیکن روشنی اتنی ہو گئی تھی کہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ قبیلے کے ہر آدمی پر فرض تھا کہ وہ قاتل کو پتھر مارے۔ پتھر نہ مارنا خرابی کا باعث تھا کیوں کہ کہا جاتا تھا کہ اگر کوئی شخص قاتل کی خبیث روح کو پتھر مار کر دور دفان کرنے میں ہاتھ نہیں بٹائے گا تو روح اُسی کو چمٹ جائے گی۔

جب سورج کی پہلی کرنیں نمودار ہوئیں تو گاؤں والے اتنے پتھر اکٹھے کر چکے تھے کہ ان کے نیچے کئی جسم دب سکتے تھے۔ وہ گاؤں واپس آئے تاکہ تیکایو کو جھونپڑے سے نکالیں اور گاؤں کے باہر خود اسی کے باغ کی طرف لے چلیں۔ وہ جھونپڑے کے چاروں طرف جمع ہو کر خاموش کھڑے ہو گئے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ تیکایو باہر آئے تو اس پر آوازے کسیں اور تھوکیں۔

آگندا اور تین دوسرے بوڑھوں نے نرسلوں کا بنا ہوا دروازہ دھڑاکے سے کھول دیا اور تیکایو کو باہر نکلنے کو کہا۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ وہ لپک کر جھونپڑے میں جا گھسے تاکہ اسے گھسیٹ کر لوگوں کے سامنے لے آئیں جو تقاضا کر رہے تھے: "باہر نکل! باہر نکل!"

شروع میں تو اندھیرا اتنا تھا کہ کچھ نظر نہ آیا۔ لیکن جلد ہی ان کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں۔ تب انھوں نے دیکھا کہ تیکایو کی لاش ایک چھوٹی سی رسّی سے لٹکی ہوئی ہے جو اس نے چھپّر میں سے کھول لی تھی۔

وہ چاروں سر ہلاتے ہوئے باہر آ گئے۔ مجمعے نے باری باری جھونپڑے میں جھانکا یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک نے تیکایو کا لٹکا ہوا جسم دیکھ لیا، اُس آدمی کو دیکھ لیا جسے سنگسار کرنے کی وہ تیاری کر رہے تھے۔ کوئی بولا تک نہیں۔ انھیں پتا تھا کہ ایسے شخص کو گاؤں کے باہر دفنانا پڑے گا۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ آئندہ کبھی کسی نوزائیدہ بچے کا نام تیکایو نہیں رکھا جائے گا۔

**

جوناتھن ٹرائٹل

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

اسٹالن، اسٹالن اور اسٹالن

اسٹالن کے (ریٹائرڈ) ہمشکلوں کی انجمن کا پہلا سالانہ اجتماع گریٹ ہال آف دی یونین کے بینکوئٹ چیمبر میں خزاں ۱۹۵۳ میں منعقد ہوا۔ یہ ایک تاریخی واقعہ تھا۔ سنگ سماک اور مرمر کے ستون عشائیے کی جگہ کو گھیرے ہوئے تھے۔ برقی فانوس اپنی بے شمار روشنی برسا رہا تھا۔ طویل چمکدار میز گلٹ کے کناروں والے بلوری گلاسوں، کلف لگے نیپکنوں (جن پر ہتھوڑے اور درانتی کے مونو گرام بنے تھے) اور نقرئی کاویار کی قابوں سے آراستہ تھی۔ ایک پوری دیوار کا احاطہ کیے ہوئے، ہمارے اوپر جھکتا ہوا، اسٹالن کا زندگی سے فزوں تر پورٹریٹ تھا۔

چوں کہ اسٹالن کی وفات کو صرف چند مہینے گزرے تھے، ہمارا ایک دوسرے سے کسی سماجی تقریب میں ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ ہم میں سے کچھ، جو ملک کے زیادہ الگ تھلگ حصوں میں کام کر چکے تھے، اس سے پہلے کسی اور اسٹالن کے روبرو نہیں آئے تھے؛ اور کسی انسان کا یہ گمان رکھنا کہ دنیا میں اُس جیسا (اصل اسٹالن کے سوا) کوئی اور نہیں ہے، کچھ ایسا غیر متوقع نہیں تھا۔

اس بات پر اصرار کرنا چاہیے کہ ہم مماثلت میں ہو بہو ایک جیسے نہیں تھے۔ اسٹالن کی شکل صرف مثالی پورٹریٹوں، خط و خال اُبھارے ہوئے فوٹوگرافوں اور گاہے بہ گاہے دھندلی نیوز فلموں سے پہچانی جاتی تھی، اس لیے کسی کو امید نہیں تھی کہ ایک اسٹالن گوشت پوست میں تصویری وجود کے بالکل مماثل ہو گا۔ اس کے علاوہ بھی، ہم میں سے کئی اُس وقت تک اپنی مونچھیں صاف اور اپنے بالوں کا انداز تبدیل کر چکے تھے۔ اس کی ایک سخت مثال واحد موجود خاتون (اسٹالن بیست و ہفتم: اصل نام اولگا کیروف، از

Scanned with CamScanner

ولادی وستوک) تھی، جس نے اپنی مونچھیں اکھاڑدی تھیں اور بالوں کے بلونڈ پَرم کا انتخاب کیا تھا۔ اب وہ صرف اپنے جبڑوں کی مخصوص چوکور ساخت اور آنکھوں کی سرد مہری کی وجہ سے ایک سابق ہمشکل کے طور پر دشواری کے ساتھ شناخت کے قابل رہ گئی تھی۔

ابتداً عام گفتگو سے ہوئی۔ پھر ہم کچھ کھلے۔ ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ کون اسٹالن کے کس (عسکری، زرعی، تعمیراتی وغیرہ) پہلو میں شامل تھا۔ خوش قسمتی سے یادداشت بڑھانے کی تکنیک کا کورس ہماری تربیت کا لازمی حصّہ تھا۔ ایک ہمشکل کے لیے ضروری ہے کہ اسے معلوم ہو کہ اسے کس سے ہاتھ ملانا ہے، کسے سلیوٹ کرنا ہے، کس کا دونوں گالوں پر بوسہ لینا ہے، کس کے پاس سے نظر ڈالے بغیر گزر جانا ہے۔۔ اس لیے ہم بہ آسانی ناموں کو چہروں سے جوڑنے کے اہل تھے۔ چھوٹے چھوٹے دل چسپ واقعات سننے میں آتے رہے، جیسے اسٹالن یازدہم نے پنج سالہ پلان مکمل کرنے والے کسانوں کی ایک کانفرنس سے سلینوگراڈ میں عین اُسی لمحے خطاب کیا تھا جب اسٹالن سوم اسی طرح کے ایک اجتماع کو سیمی پلاتنسک میں اپنی موجودگی سے سرفراز کر رہا تھا۔

اب ہمیں مہاگنی کی میز کے گرد اپنی نشستیں سنبھالنی تھیں۔ اس تقریب کے منتظم، اسٹالن چہارم (اصل نام موشے سیگال، ازوِتیبسک) نے ایک مختصر تقریر کی۔ وہ، جیسا کہ پتا چلا، ہم میں سے واحد فرد تھا جو ابھی تک سابقہ خدمات پر بحال تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ بسترِ مرگ کے مناظر کے لیے پوز کرنے میں مصروف رکھا گیا تھا، اور مادرِ وطن کو امپیریلسٹوں اور غدّاروں سے لاحق دائمی خطروں کے پیشِ نظر، اور صورتِ حال میں کہ جانشینی مالنکوف اور خروشچیف کے درمیان متنازعہ ہے، اسے پوری توقع تھی کہ نیم دھڑ مجسموں، ڈایوراموں اور اس طرح کی اور اشیا کی طلب آنے والے چند برسوں تک کم نہیں ہو گی۔ حالاں کہ اس کے موجودہ کام کا (اس نے اعتراف کیا) زندہ رہنما کی جگہ کھڑے ہونے کی سنسنی خیزی سے بہ مشکل ہی موازنہ کیا جاسکتا ہے، پھر بھی اس نے خود کو خدمت کے قابل سمجھے جانے اور اپنا کام جاری رکھنے پر افتخار محسوس کیا۔ وہ پُریقین تھا کہ ہم سب اس کے جذبات میں شریک ہیں۔ (تالیاں۔) یہ تاریخ کی منطق تھی جس نے اسٹالن کو صفِ اوّل میں پہنچایا، اور یہ تاریخ کی منطق تھی جس کا تقاضا تھا کہ اسٹالن کو اپنے ہمشکل رکھنے چاہییں۔ (زیادہ تالیاں اور متفقہ اثبات کا شور۔)

ہم کھڑے ہو گئے۔ ووڈکا کا دور شروع ہوا؛ بوتل ہر بار بائیں طرف کو آگے بڑھائی گئی۔ گلاس بلند کیے گئے۔ "کامریڈو! اسٹالن کے نام پر!" جام نوش کیا گیا اور پھر، بیک وقت، ہم نے گلاسوں کو اپنے شانوں کے اوپر اچھالا اور وہ دیواروں اور ستونوں سے ٹکرا کر چُور ہو گئے اور فرش رنگین کرچیوں سے بھر گیا۔

اب ہم زیادہ پُرسکون تھے۔ ہر ایک اپنی باری پر اپنا سب سے زیادہ ناقابلِ فراموش تجربہ بیان کیا۔ چند ایک اسٹالن کی آواز (ناگوار کھردرا جورجیائی لہجہ) بروئے کار لائے، جب کہ اَوروں نے اپنی روزمرہ کی آواز کے استعمال کو ترجیح دی۔ بہر حال، کئی ہمشکل محض بصری تھے، جیسے اسٹالن سیزدہم (اصل نام رحیم محمدوف، از باکو)، ایک سادہ لوح شخص جسے روسی زبان کے صرف چند الفاظ آتے تھے: ہیلو، کامریڈ،

شکریہ- کئی یادداشتیں بہت متاثر کن تھیں- اسٹالن پنجم نے ایک ملٹری اسپتال کا لینن گراڈ کے محاصرے کے بعد کی تباہی کے وقت دورہ کیا تھا: زخمی سپاہیوں نے اسے دیکھ کر فلک شگاف نعرے لگائے تھے: اس کی آنکھیں بھر آئیں- اسٹالن بیست و یکم کراسنویارسک کے اجتماعی فارم کے کنڈرگارٹن میں ایک بچے کو تھپتھپا رہا تھا کہ بچے نے مڑ کر اس کے ہاتھ کی انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان نرم حصّے کو کاٹ لیا تھا- اُسے اپنی چیخ روکنی پڑی تھی کہیں زیادہ جوشیلے باڈی گارڈ بچے اور اس کے خاندان کو نیست و نابود نہ کر دیں- دوسروں نے بھی اسٹالن پر نادر روشنی ڈالی- چند لوگوں کو معلوم تھا، مثال کے طور پر، کہ پوٹسڈام کانفرنس کے دوران وہ اپنی پشت پر ایک تکلیف دہ پھوڑے کو سہتا رہا تھا (اسٹالن نہم نے ہمیں یہی بتایا)، یا (اسٹالن بیست و یکم کے مطابق) وہ کبھی کبھی اپنا ٹوتھ برش چبا جاتا تھا- چند اسٹالن ان واقعات کے جلسے میں سنائے جانے کا غلط مطلب لیتے نظر آئے- اسٹالن پانزدہم نے برچ کے جنگلوں کے حسن کے بارے میں ایک چھوٹا سا نغمہ سنایا- اسٹالن سیئم نے بتایا کہ وہ اپنی بیوی سے کتنی محبت کرتا ہے-

پھر منتظم نے "ایوسف ویساریونووچ ژوگاشویلی کی مدح میں ایک نظم" پڑھ کر سنائی- مزید جام نوش کیے گئے- "پارٹی کے لیے! مالنکوف کے لیے! خروشچیف کے لیے! تاریخ کے لیے!" کاویار کھایا گیا- جورجیائی شمپین خوش آہنگی سے قلقل کرتی رہی- سادہ مگر تسکین بخش کھانا میز پر آیا اور ختم کیا گیا-

آخر میں منتظم کھڑا ہوا اور اس نے اعلان کیا کہ اگرچہ اصل میں اجتماع صرف ایک بار کے لیے سوچا گیا تھا، اب جب اسے اتنی پُرجوش کامیابی حاصل ہوئی ہے، کیوں نہ ہم اگلے سال، اس کے بعد کے سال، اور اسی طرح ہمیشہ آتے رہیں؟ (زوردار تالیاں-) "اسٹالن زندہ باد!"

چند اسٹالنوں نے جو دور اُفتادہ جمہوریاؤں سے تعلق رکھتے تھے، خیال ظاہر کیا کہ اگلا اجلاس موسکو سے باہر ہونا چاہیے- اس پر اتفاق کیا گیا- "پھر کہاں؟" اسٹالن گراڈ پر، علامتی لحاظ سے ایک موزوں شہر کی حیثیت سے، بحث ہوئی- اسٹالنسک اور اسٹالنو کے نام بھی تجویز کیے گئے- بہرحال تین مقامات جو سب سے زیادہ حمایت حاصل کرتے نظر آئے، وہ شہر تھے جو بعد میں براسوف، وارنا اور دونیتسک کے نام سے جانے گئے، مگر اُس وقت ان کے نام بالترتیب اسٹالن، اسٹالن اور اسٹالن تھے- بہت غور و فکر کے بعد یہ قرار پایا کہ ہم اگلے سال اسٹالن میں دوبارہ جمع ہوں گے-

۱۹۵۴ کا اجتماع مختصر اور کئی اعتبار سے گذشتہ سال کے مقابلے میں زیادہ بے تکلفانہ انداز میں تھا- میز کی شکل گول تھی- اسٹالن کا ایک پلاسٹک کا نیم دھڑ مجسمہ سنٹرپیس کے طور پر خشک فرن اور کانٹے دار پتّیوں کے بستر پر سجایا گیا تھا- اس بار سارے بمشکل شرکت کو نہیں آئے- بعضوں کے لیے سفر کا فاصلہ مانع تھا اور بعض کو ناگزیر مصروفیات پیش آ گئی تھیں- جو حاضر ہوئے، جہاں تک اُن کا تعلق ہے، کچھ بڑھتی ہوئی عمر کے باعث (اسٹالن سیزدہم کے گال چونکا دینے والی حد تک پھول چکے تھے: اسٹالن نوزدہم آدھا گنجا ہو چکا تھا)، اور کچھ مردانہ فیشن میں تبدیلیوں کی وجہ سے، ان کی اصل سے مشابہت ماند پڑ

Scanned with CamScanner

گئی تھی۔ مگر ایسی باتوں کی توقع ضرور رکھنی چاہیے تھی: اگر آج اسٹالن زندہ ہوتا تو وہ خود بھی بہت زیادہ اسٹالن کی طرح نہ ہوتا۔

حسبِ دستور جام نوش کیے گئے۔ "پارٹی کے لیے! خروشچیف کے لیے! بالنکوف کے لیے! اسٹالن کے لیے! تاریخ کے لیے!" لمپ فِش کاوِیار کو بہت سراہا گیا۔ سفید وائن خوش نما نازک گلاسوں میں انڈیلی گئی۔ خوش مزاجی کی تمام تر فضا کے باوجود اجتماع میں اس وقت تک گذشتہ سال کی سی ترنگ نہیں تھی -- ماضی کی کامیابی کو دُہرانے کی کوشش ہمیشہ غلط ثابت ہوتی ہے۔ پھر اسٹالن دوازدہم نے (اصل نام سرگئی بالن، از موسکو)، جو اس وقت ایگرونومیکل ڈویلپمنٹ انسٹیٹوٹ میں ٹیلی فون آپریٹر کے طور پر کام کررہا تھا، اپنی تحقیقات کے نتائج ظاہر کیے۔ اس نے بیان کیا کہ وہ اس مفروضے پر کام کررہا ہے کہ اسٹالن واحد سیاست داں نہیں رہا ہوگا جس نے اپنے ہمشکل رکھے۔ وہ دیگر عالمی رہنماؤں کے ہمشکل افراد سے رابطہ کرنے کی کوششوں میں مشغول تھا۔

ہم نے اپنی سانسیں تھام لیں، گھومنے والے دروازوں کی طرف نظر ڈالی۔ دو بٹلر، ہاتھوں میں گرینیڈ لیے، ڈیوٹی پر تعینات تھے۔ ہم نے تصوّر کیا کہ کسی بھی وقت بیسیوں چرچل اور روزویلٹ یالٹا کانفرنس کو متعدد بار دُہراتے ہوئے اندر داخل ہوسکتے ہیں، اور ممکن ہے کہ اس وقت بھی کئی لینن زندہ ہوں، بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دو چار جعلی ٹراٹسکی سائبیریا سے مارچ کرتے ہوئے آرہے ہوں۔

بالن نے اپنے ہاتھ بلند کیے۔ اس نے افسوس کا اظہار کیا کہ اس کی پوری کوشش کے باوجود اسے کسی بصری ہمشکل کی شہادت نہیں ملی مگر -- اور اس موقعے پر اس نے لاؤڈ سپیکر سسٹم کو، جو انٹر نیشنل سوئچ بورڈ سے منسلک تھا، چلایا -- اس وقت اس کے پاس لائن پر لندن سے نارمن جونز نامی ایک شخص تھا۔ جونز کی آواز زیادہ تر بلند اور صاف تھی، صرف کہیں کہیں ذرا اٹک جاتی تھی اور اس کے ساتھ عجیب طرح کی ہلکی سی گونج آتی تھی۔ اس نے ہمارا روسی میں خیر مقدم کیا اور بتایا کہ وہ اپنے وقت میں ایک چرچل تھا۔ یہ کوئی خاص کام نہیں تھا، خیال رہے، وہ صرف وائرلیس پر اُس کی تقریریں پڑھا کرتا تھا اور اصل وزیرِ اعظم کے دیے ہوئے خطبات کو دوبارہ ریاستہائے متحدہ اور نوآبادیات کو ٹرانسمیشن کے لیے ریکارڈ کرایا کرتا تھا۔ ہمیں محظوظ کرنے کے لیے اس نے اپنے سدابہار پسندیدہ چٹکلوں کا ایک انتخاب پیش کیا: 'Blood, toil, tears and sweat.' 'Some chicken. Some neck.' 'We shall fight on the beaches.' اس کا جملہ 'An iron curtain has descended across the continent' شاید بالکل دوستانہ نہیں تھا، مگر ہم میں سے وہ بھی جو انگریزی سے ناواقف تھے، جونز کی کسی نقص سے عاری غراہٹ اور لکنت اور اس کی نقلی دانتوں سے تھوک نگلنے کی ماہرانہ نقل سے بجا طور پر متاثر ہوئے۔

اور امریکیوں کا کیا بنا؟ بے چارے ناتواں روزویلٹ نے ضرور اسٹنٹ مینوں کو اپنی زیادہ اہم مصروفیات سے نبٹنے کے لیے بھیجا ہوگا۔ مگر بظاہر ایسا نہیں ہوا؛ کم از کم کوئی روزویلٹ ثانی سامنے نہیں

آیا۔ اس کے علاوہ، جیسا کہ استالن ہشتم (اصل نام بورس باکیف، از کیف) نے نشان دہی کی، اگر روزویلٹ کا کوئی ہمشکل ہوتا تو صدر کو ۱۹۴۵ میں ایسے نامناسب موقعے پر مرنے نہ دیا جاتا۔ جب تک جنگ کا اختتام نہ ہو جاتا، اس کا ہمشکل اس کا کردار ادا کر سکتا تھا۔

اس بات پر ہم سب کے ذہن میں ایک ہی سوال اُبھرا: استالن کو کیوں مر جانا پڑا؟ بلاشبہ اس کمرے میں موجود ہم میں سے کوئی بھی پارٹی کے چیئرمین اور ملک کے رہنما کے طور پر قابلِ قبول خدمت انجام دے سکتا تھا۔ ہم مشعل کو آگے لے جا سکتے تھے۔ کیا استالن کو مرنے کی واقعی ضرورت تھی؟ اسے عملاً لافانی بنانے کے لیے ہمشکلوں کی نئی نسل منتخب کی جا سکتی تھی اور انہیں تربیت دی جا سکتی تھی۔

انگلستان سے رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ شراب ختم ہو چکی تھی۔ یہ ہم سب لوگوں کے لیے گھر واپس جانے کا وقت تھا۔

تیسرا اجلاس اکتوبر ۱۹۵۵ میں استالن (وہ استالن نہیں جو گذشتہ سال کے اجلاس کا شہر تھا) میں مقامی پارٹی کے مرکز کے پاس ایک کمرے میں ہوا۔ شاید اس کی تشہیر اچھی طرح نہیں کی گئی تھی یا ہوٹل ریزرویشن کی دشواریاں تھیں، صرف درجن بھر یا پندرہ ہمشکل حاضر ہوئے۔ استالن کا رنگین ریپروڈکشن سماوار کے اوپر دیوار پر ایک چوکھٹے میں لگا تھا۔ کئی اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ زیادہ دوستانہ اور رازدارانہ موقع تھا۔ جام کئی بار تجویز کیے گئے (پارٹی کے لیے! خروشچیف کے لیے! استالن کے لیے! تاریخ کے لیے!)۔ اس سال کاویار دستیاب نہیں تھا، مگر بورش سُوپ غیر معمولی طور پر عمدہ تھا۔ چند زیادہ خوش مزاج استالنوں نے ـــ میں انہیں ہنگامہ پرور نہیں کہوں گا ـــ استالن کے چہرے کے تاثرات (کریم النفس مسکراہٹ، عوام کی حالت کے بارے میں تفکر کے انداز، زندہ دل مزدور کی دبی دبی ہنسی، تُند خو نگاہوں) کی نقل اتارنے کے ایک غیر رسمی مقابلے میں حصّہ لیا۔ انعام کے طور پر استالن دوازدہم کی طرف سے ایک تیز دھار اُسترا رکھا گیا تھا جس پر صابن کا جھاگ اور استالن کی ٹھوڑی کے چند بال جمے ہوئے تھے۔ اسے استالن پانزدہم نے اس کے سخت گیر انداز میں گھورنے کی خوف زدہ کر دینے والی حقیقت آسا نقل کے زور پر جیت لیا۔

استالن بیست و دوم (اصل نام ایوسف زابارودوف، از اُولان باتور) کھڑا ہوا اور گلا صاف کرنے کے بعد اس نے اعلان کیا کہ وہ ضرورت محسوس کرتا ہے کہ آج کے نوجوانوں میں استالن کی بابت دل چسپی کے مکمل فقدان کی مذمت میں کچھ کہے۔ استالن نے اپنے بچپن میں جو دلیرانہ کام کیے (ذخیرہ اندوزوں سے جنگ، شروع کے سرمایہ داروں کو ناکام بنانا، مخبروں کو علانیہ مجرم ٹھہرانا) اب اسکولوں میں بچوں کو سوشلسٹ طرزِ عمل کی مثالوں کے طور پر نہیں پڑھائے جاتے۔ اگرچہ اس کی تقریر اپنی روح میں ہمارے عمومی جذبات سے مطابقت رکھتی تھی، پھر بھی ہم میں سے بہتوں نے محسوس کیا یہ بہت زیادہ سنجیدہ بلکہ افسردہ کرنے والی تھی، کیوں کہ بہرحال اجلاس کو ایک پُرمسرت تقریب سمجھا گیا تھا۔

Scanned with CamScanner

ہم جلد رخصت ہو گئے۔

۱۹۵۶ کا جلسہ آخری تھا۔ اس کا ہم سب کو علم تھا۔ شروع میں اس کو ستمبر میں استالن نامی شہروں میں سے ایک کی پولیس بیرک میں ہونا تھا مگر شہر کا نام ایک ماہ پہلے تبدیل ہو گیا: یہ حقیقتاً کوئی نیک شگون نہیں تھا۔ اس کے علاوہ حاضری بھی کم متوقع تھی۔

اکتوبر کی ایک برفانی شام کو ہم موسکو کے مضافات میں تین منزلوں کے زینے چڑھ کر اور ایک پتلی راہداری سے گزر کر استالن چہارم کے اپارٹمنٹ کے تنگ لونگ روم میں پہنچے۔ ہم تیزابی سبز رنگ کے صوفے اور باورچی خانے کی لڑکھڑاتی کرسیوں پر بیٹھے؛ چند تاخیر سے آنے والوں کو قالین پر ڈھیر ہونا پڑا۔ ہماری تعداد دس سے بھی کم تھی۔ استالن کا ایک بلیک اینڈ وائٹ فوٹوگراف بک کیس کے ایک طرف پِن سے اٹکا تھا۔

اس دوران جو کچھ پیش آ چکا تھا وہ یوں تھا: اس سال فروری میں خروشچیف نے استالن کے "جرائم" کا بیسویں پارٹی کانگریس کے ایک بند اجلاس میں اپنی طویل آتشیں تقریر کے دوران اعلان کیا تھا: یہ واضح رہے کہ حکومتی طور پر یہ تقریر خفیہ مانی جاتی تھی، مگر ہر شخص اس سے آگاہ تھا۔

خاموشی کو توڑنے میں کوئی پہل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آخر کار استالن چہارم، جس نے تین سال پہلے ہماری انجمن کے پہلے شاندار اجلاس کا بندوبست کیا تھا، زیرِ لب بول پڑا: "میں نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ وہ بے عیب ہے۔" ہم سب نے اس پر اتفاق کیا کہ غلطیاں ہر شخص سے ہو سکتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ استالن نے بعض مواقع پر فیصلہ کرنے میں غلطی کی تھی۔

استالن دوازدہم نے بتایا کہ اس نے سیرین کو ایک ٹراٹسکیائٹ قرار دیتے ہوئے عدالت میں ایک غیظ آلود تقریر کی تھی اور شاید سیرین اصل میں بے قصور تھا۔ گذشتہ واقعات کے جائزے کے وقت انصاف پسند ہو جانا کتنا آسان ہے۔

ہم میں سے ہر ایک کے پاس اس طرح کے تجربات تھے۔ استالن ششم نے ۳۸-۱۹۳۷ میں ولادی وستوک کے نواح میں افسروں کے کئی کھلے مقدمات میں استالن کا کردار ادا کیا تھا، اس بات کو اچھی طرح جانتے ہوئے کہ وہ سب کے سب جاپانی جاسوس، بادشاہت پسند یا ہم جنس پرست نہیں تھے۔

استالن سیئم کو، جس نے تین سال ہوئے ہمیں بتایا تھا کہ اسے اپنی بیوی سے کتنی محبت ہے، اپنے سسر کو علانیہ مجرم ٹھہرانا پڑا۔

استالن ہفدہم ایک دوسرے ہم شکل، استالن ہشدہم (مرحوم) کی ایک زینوویئف کے پیرو علیحدگی پسند کی حیثیت سے گرفتاری تک کا ذمے دار تھا۔

درحقیقت ہم میں سے کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے استالن کی شخصیت کے صرف بہتر پہلوؤں کے لیے اس کی نقل ادا کی۔ ہم سب کے دامنوں پر داغ تھے۔ مگر ان تمام باتوں کے لیے (ہم

Scanned with CamScanner

نے دلیل دی) ایسا نہیں تھا کہ ہم ذاتی طور پر ذمے دار ہوں۔ بے شک اگر ہم **propriis personis** (ذاتی حیثیت) میں عمل کر رہے ہوتے تو ہم نے ایسے سفاکانہ رویے کا تصور بھی نہ کیا ہوتا، مگر ہم تو صرف وہ کر رہے تھے جو اسٹالن نے، اگر وہ ان کاموں کے لیے وقت نکال سکتا، خود کیا ہوتا۔

کیا پوری داستان یہی ہے؟ اسٹالن ششم نے یاد کیا کہ کئی بار جب اسے صرف غیر واضح، مثال کے طور پر ایک کھلے مقدمے میں حاضر ہونے اور عمومی گواہی پیش کرنے کی، ہدایات ملی تھیں، اس نے ملزم کے خلاف ایک زہر آلود بیان دیا، جب کہ ایک نسبتاً نرم سرزنش سے کام چل سکتا تھا۔ اور ہم میں سے ہر ایک اپنے تجربات سے اس طرح کے واقعات بیان کر سکتا تھا۔ ماضی کی طرف نظر ڈالتے ہوئے احساس ہوا کہ ہمیں کردار کے بنانے میں کافی آزادی دی گئی تھی مگر شاید ہم خوں آشامی کو مبالغے کی حد تک لے گئے۔

اصل میں دیکھا جائے تو ہم بمشکل اس بد نصیب عہد کے کئی المیہ پہلوؤں کے ذمے دار تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسٹالن بذاتِ خود معقول حد تک نرم خو رہا ہو۔ کاش ہم سے اسے سمجھنے میں غلطی نہ ہوئی ہوتی!

ووڈکا کی بوتل صوفے کے نیچے لڑھک گئی تھی، اسے باہر نکالا گیا۔ گلاسوں، پیالیوں، دانت صاف کرنے والے مگوں اور بڑے پیالوں میں شراب انڈیلی گئی۔ اسٹالن یا خروشچیف یا پارٹی کے نام پر جام تجویز کرنے کو کسی کا بھی دل نہ چاہا۔ پھر کوئی پکار اٹھا: "تاریخ کے لیے!"، اور اس پر ہم سب نے جام نوش کیا۔

**

انتخاب

برنارڈ مالامڈ (Bernard Malamud)

برنارڈ مالامڈ، جنھیں جدید امریکی فکشن کی نمایاں ترین شخصیات میں شمار کیا جاتا ہے، ۲۶ اپریل ۱۹۱۴ کو بروکلن، نیویارک، میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین، ماکس اور برتھا مالامڈ، روس سے ترکِ وطن کر کے امریکا میں آباد ہونے والے یہودیوں میں شامل تھے اور پُرمشقت زندگی بسر کرتے ہوئے، بروکلن کے علاقے میں کریانے کی دکان چلاتے اور دکان کے اوپر بنے ہوئے تنگ کمروں میں رہتے تھے۔ مالامڈ نے بی اے کرنے کے بعد بہت سی ملازمتیں کیں اور فرصت کے اوقات میں کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۲ میں مالامڈ نے کولمبیا یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۴۳ تک ان کی کئی کہانیاں شائع ہو چکی تھیں۔ اپنے پہلے ناول The Light Sleeper کا مسودہ مالامڈ نے جلا دیا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ وہ اس سے بہتر لکھ سکتے ہیں۔ ان کی پہلی کہانی جس کا انھیں معاوضہ ملا، The Cost of Living ("جینے کا مول") تھی جو ۱۹۴۹ میں شائع ہوئی۔ اسی سال انھوں نے اوریگان اسٹیٹ کالج میں تدریسی ملازمت شروع کی۔ ان کا پہلا شائع ہونے والا ناول *The Natural* (۱۹۵۲) تھا جسے بجا طور پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ اسی عرصے میں ان کی شاہکار کہانی The Magic Barrel چھپی۔ مالامڈ کے ناولوں میں *The Assistant* (۱۹۵۴)، *The Fixer* (۱۹۶۶)، *Pictures of Fidelman* (۱۹۶۹)، *The Tenants* (۱۹۷۱)، *Dubin's Lives* (۱۹۷۹) اور *God's Grace* (۱۹۸۲) شامل ہیں۔ مالامڈ کی زندگی میں ان کی کہانیوں کے چار مجموعے *The Magic Barrel* (۱۹۵۸)، *Idiots First* (۱۹۶۳)، *Rembrandt's Hat* (۱۹۷۳) اور *The Stories of Bernard Malamud* (۱۹۸۳) شائع ہوئے۔ مالامڈ کا انتقال ۱۸ مارچ ۱۹۸۶ کو نیویارک میں ہوا۔ ان کا نامکمل ناول اور غیر جمع شدہ کہانیاں ۱۹۸۹ میں *The People and Uncollected Stories* نامی کتاب میں شائع ہوئیں۔

Scanned with CamScanner

مالمڈ نے دوسرے درجے کا کوئی ناول نہیں لکھا، اور ان کی کہانیاں انہیں اس صنف کے ماسٹر کا درجہ عطا کرتی ہیں۔ وہ اپنی تحریروں کے سخت ترین نقاد تھے اور اس بات کے قائل تھے کہ لکھنے والے کو جو کچھ کہنا ہو وہ اسے کہانی کی ہیئت کے ذریعے سے کہتا ہے۔ مالمڈ کا کہنا ہے: "کچھ لوگ پیدائشی طور پر مکمل ہوتے ہیں؛ دوسروں کو تکمیل حاصل کرنے کی جدوجہد میں اس مبارک کیفیت کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اس تلاش میں کچھ نقصان نہیں؛ یہی تلاش آخرکار فکشن کا نفسِ مضمون ٹھہرتی ہے۔ دیکھنے، پڑھنے اور غور کرنے سے آدمی اپنے آپ کو دریافت کرتا ہے۔ ایک مانوس آواز سوال کرتی ہے: میں کون ہوں، اور جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ کیسے کہہ سکتا ہوں؟ وہ، یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا الفاظ اس سوال کا جواب دیتے ہیں یا نہیں، اپنے جملوں کو پڑھتا ہے۔ اس طرح لکھنے والا اپنے مستقبل کی نشان دہی کرسکتا ہے۔ اس کا تخیل اسے کئی زبانوں میں بولنے پر اُبھارتا ہے، ہرچند کہ ایک ہی بہت ہے۔ اس موڑ پر وہ ایک جرأت مندانہ کوشش، یعنی کہانی لکھنے، کا آغاز کرسکتا ہے۔۔۔ لکھنے کا پیشہ اپنانے کے تقریباً آغاز ہی سے میں نے ناول اور کہانی کو کم و بیش باری باری وقت دیا ہے۔ مجھے رفتار (pace) اور ہیئت کی تبدیلی پسند ہے۔ میں نے دونوں ہیئتوں پر کام کرنے میں لطف اٹھایا ہے۔۔ نثر اپنے مخصوص مطالبات رکھتی ہے۔۔ گو مجھے اعتراف ہے کہ میں کہانی سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ آدمی اگر زندگی میں جلد ہی کہانیاں گھڑنے اور سنانے لگے تو اس کے سُنے جانے کا امکان نسبتاً بہتر ہوتا ہے، بشرطے کہ وہ انہیں مختصر رکھے۔۔۔ میں مختصر کہانی لکھنے کی مسرتوں سے پیار کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک مسرت زود اثری ہے۔ جو کچھ پیش آتا ہے فوراً پیش آتا ہے۔ لکھنے والا اپنے ذاتی اُڑن گھوڑے (Pegasus) پر سوار ہوتا ہے، بھلے ہی وہ ایسا غائب دماغ گھوڑا ہو جس نے پہلے کبھی دوڑ میں حصہ ہی نہ لیا ہو؛ ایک ارتفاع پیش آتا ہے اور سو...ن شروع ہو جاتی ہے۔ نظارہ، اکثر، متحیر کرتا ہے، اور اسی طرح کچھ ایسے لوگ بھی جن سے آدمی کی راستے میں ملاقات ہوتی ہے۔ میں نے کسی جگہ کہا ہے کہ کہانی چند صفحات میں ایک وجود کو بیان کر کے اس کی پوری زندگی کی پیش گوئی کر دیتی ہے۔ ڈراما کشاکش سے پُر، تیز رو اور اکثر عجیب و غریب ہوتا ہے۔ ایک اچھی کہانی، آگہی کی حیرت اور تاثر پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ، زندگی کی پیچیدگی کو چند صفحوں میں منعکس کر دیتی ہے۔۔ یہ صلہ کچھ کم تو نہیں۔۔۔ سخت تکالیف کے باوجود تنہائی میں کہانیاں تخلیق کرتے رہنا، انسانی تنہائی کو جھیلنے کا کوئی بُرا طریقہ نہیں۔۔۔ فن زندگی کا مدح سرا ہے اور ہمیں ہماری قامت بخشتا ہے۔" (ترجمہ: راشد مفتی۔) مالمڈ کے مطابق، وہ ہر ناول یا کہانی کو تین بار لکھتے تھے: ایک بار اسے سمجھنے کے لیے، دوسری بار اس کی نثر کو بہتر بنانے کے لیے، اور تیسری بار اسے وہ کچھ کہنے کے قابل بنانے کے لیے جو کہا جانا ہے۔

Scanned with CamScanner

برنارڈ مالامڈ

انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی

جینے کا مول

جاڑا شہر کی گلیوں سے رخصت ہو چکا تھا مگر سام توماشیوسکی جب اپنی کریانے کی دکان کے عقبی کمرے میں لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا تو اس کا چہرہ برفانی طوفان کا سماں پیش کر رہا تھا۔ سُورا نے، جو گول میز پر بیٹھی ڈبل روٹی کے ساتھ نمک لگا ٹماٹر کھا رہی تھی، خوف زدہ ہو کر نظر اٹھائی اور ٹماٹر کا سرخ رنگ اور گہرا ہو گیا۔ اس نے جو لقمہ توڑا تھا اسے جلدی سے نگلا اور حلق سے اتارنے کے لیے اپنی چھوٹی سی پُرگوشت مٹھی کو زور سے سینے پر مارا۔ اس کی یہ حرکت ماتمی اشارہ رکھتی تھی کیوں کہ وہ سام کو دیکھتے ہی جان گئی تھی کہ پھر کوئی مشکل آ پڑی ہے۔

"خدایا!" سام کے حلق سے آواز نکلی۔

وہ چیخی تو سام نے جھرجھری لی اور تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ سُورا مشتعل اور خوف زدہ کھڑی تھی۔

"خدا کے لیے، بولو!"

"برابر میں،" سام بڑبڑایا۔

"کیا ہوا برابر میں؟" -- اپنی آواز کو بلند کرتے ہوئے۔

"دکان کھل رہی ہے!"

"کیسی دکان؟" سورا کی چیخ چھید دینے والی تھی۔

سام نے طیش میں آ کر اپنے بازو لہراتے۔ "برابر میں کریانے کی دکان کھل رہی ہے!"

"اُف!" سورا نے اپنی انگلیاں چبا ڈالیں اور کراہتی ہوئی بیٹھ گئی۔ اس سے بدتر کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔

خالی دکان، جو برسوں ایک اطالوی جفت ساز کی ملکیت رہی تھی، جاڑوں بھر ان کے ذہن پر مسلط رہی تھی۔ پھر اگلے بلاک میں جوتے مرمّت کرنے والی بڑی دکان کھل گئی جہاں لال قمیصیں پہنے دو آدمی دن بھر ٹھک ٹھک کرتے کھڑکی میں سے نظر آیا کرتے اور ہر راہ گیر دیکھنے کو ٹھہر جاتا۔ بیلیگرسنو کا دھندا یوں ٹھنڈا پڑتا گیا جیسے کوئی کسی ٹونٹی کو بند کر رہا ہو۔ ایک دن اس نے اپنی کام کرنے کی بنچ پر نظر ڈالی اور ہتھوڑے کی ضربوں سے اُچھلنے والی سب چیزوں کے ساکت ہونے پر وہ اسے بھدی اور خالی نظر آئی۔ وہ تمام صبح بے حرکت بیٹھا رہا تھا، لیکن سہ پہر کے وقت اس نے ہتھوڑا، جس کا دستہ اس نے مٹھی میں جکڑا ہوا تھا، رکھ کر اپنی جیکٹ اٹھائی اور پرانا میل خوردہ پناما ہیٹ، جو کوئی گاہک اُن دنوں سے واپس لینے نہیں آیا تھا جب وہ ہیٹوں کی صفائی اور مرمّت کیا کرتا تھا، سر پر رکھ کر پاس کے محلوں میں اپنے سابقہ گاہکوں سے یہ پوچھنے کو نکل گیا کہ آیا ان کے پاس جوتوں کی مرمّت کا کوئی کام ہے۔ اسے جوتوں کے دو جوڑے مل سکے: ایک گرمیوں میں پہننے والا براؤن اور سفید مردانہ جوتا، اور ایک رقص کرنے کا زنانہ سلیپر۔ اسی وقت سام نے محسوس کیا کہ اس کے جوتوں کے تلے اور ایڑیاں روز گھنٹوں چلتے رہنے کے باعث بالکل گھس چکی ہیں ۔۔ اسے تختوں کے فرش پر چلتے ہوئے لکڑی کی ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی۔ یہ سب ملا کر تین جوڑے بنے اور اُس ہفتے مسٹر بیلیگرسنو کو اتنا ہی کام مل سکا۔ اگلے ہفتے اسے مرمّت کرنے کے لیے جوتوں کا صرف ایک جوڑا ملا۔ جب اگلے مہینے کرائے کی ادائیگی کا وقت آیا تو اس نے دکان کی سب چیزیں کباڑی کے ہاتھ بیچ کر گلیوں میں پھیری لگانے کے لیے مٹھائی خرید لی، مگر تھوڑے ہی دن بعد جفت ساز، جو گول شیشوں کی عینک اور کھڑی مونچھوں والا فربہ اور پستہ قد آدمی تھا اور جاڑوں میں بھی گرمیوں کا ہیٹ پہنے رہتا تھا، کسی کو دکھائی نہیں دیا۔

جب دکان کا کاؤنٹر اور دوسرا سامان اکھاڑ کر باہر نکال دیا گیا اور عقب میں چمکتے ہوئے سنک کے سوا پوری دکان خالی ہو گئی تو سام کبھی کبھار رات کے وقت، جب اُس کی دکان کے سوا ساری دکانیں بند ہوتیں، وہاں جا کھڑا ہوتا اور تاریکی اُگلتی ہوئی کھڑکی میں جھانکتا۔ اکثر کھڑکی کے گرد آلود بڑے شیشے میں سے جھانکتے ہوئے، جس میں باہر کو دیکھتے ہوئے کریانہ فروش کا عکس جھلکتا، اسے وہی کچھ محسوس ہوتا جو وہ کاینتس پودولسکی کے گاؤں میں گزارے اپنے لڑکپن میں دو ہم عمروں کے ساتھ دریا کی طرف جاتے ہوئے محسوس کیا کرتا تھا۔ وہ راستے سے گزرتے ہوئے خوف زدہ نظر لکڑی کے اُس اونچے مکان پر ڈالتے جو پُراسرار طور پر تنگ اور جس کی چھت پر ایک عجیب دوہرا بُرج تھا، جہاں کبھی ایک ہولناک قتل ہو چکا تھا اور جہاں اب بھوتوں کا ڈیرا تھا۔ دیر گئے لوٹتے ہوئے بعض اوقات اوّل شب کی چاندنی میں اُس مکان کی پھاڑ کھانے والی خاموشی کو سنتے ہوئے وہ چپ چاپ اس سے دور دور چلتے جہاں کمرہ در کمرہ گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا اور جس کے بالکل وسط میں تلاطم خیز سکوت کا ایک گڑھا تھا جہاں سے، اگر کوئی اس کے بارے میں سوچتا،

Scanned with CamScanner

بدی پھوٹتی تھی۔ خالی دکان کے تاریک نہاں خانوں میں بھی، جہاں بے شمار جوتوں کو ہتھوڑے کی ضربوں نے زندگی میں ڈھالا تھا اور بے شمار لوگ آنے جانے میں اپنے وجود کا کچھ حصہ چھوڑ گئے تھے، ایسا ہی احساس ہوتا تھا کہ خالی پن میں بھی دکان اُترتے ہوئے زینے کی طرح اوپر تلے دھری ناگفتہ بازگشتوں کی شکل میں اُن موجودگیوں کی کچھ یادیں لیے ہے، اور ایک طرح سے یہی بات تھی جو اس قدر ڈرا دینے والی تھی۔ بعد ازاں سام جب دکان کے قریب سے گزرتا تو دن کی روشنی میں بھی اس کی طرف دیکھنے سے خوف کھاتا اور اسی تیزی سے گزر جاتا جس تیزی سے لڑکپن میں بھوتوں والے مکان کے پاس سے گزرا کرتا تھا۔

لیکن جب کبھی وہ آنکھیں بند کرتا تو دائمی گردش کرتے ہوئے ایک طویل بلیک ہول کی طرح خالی دکان اس کے سامنے آجاتی اور یوں، جب وہ سوتا تو دراصل سوتا نہیں تھا بلکہ اس کے اندر یہ سوال گردش کرتا رہتا: اگر یہی کچھ میرے ساتھ ہو جائے تو؟ اگر ستائیس سال کی مشقت کے بعد (اسے برسوں پہلے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا)، ان تمام برسوں کے بعد، اس کی اپنی دکان، اپنی دھندے کی جگہ بھی اسی طرح---وہ ہزاروں ڈبے جو اس نے جھاڑ پونچھ کر تھیلوں میں ڈالے، دودھ کے سیکڑوں کنستر جنھیں وہ پالے اور گرمی میں منھ اندھیرے بھاری پتھروں کی طرح گلی میں سے اندر گھسیٹ کر لایا؛ بے عزتیاں، چھوٹی موٹی چوریاں، اور غریبوں کا مفلس شدہ قرض خواہوں کو خیرات کی طرح قرض لوٹانا؛ پلستر جھاڑتی ہوئی چھت، غلاظت، سُوجی ہوئی رگیں، سولہ گھنٹے کا کمر توڑ دن جو صبح جاگتے ہی کھوپڑی پر چپت لگا کر سر کو پیچھے دھکیل دیتا ہے اور جسم کی ہڈیاں ٹیڑھی کر دیتا ہے: مسلسل کام کے طویل گھنٹے، طویل برس---میرے خدا! اب میری زندگی کہاں ہے؟ اب مجھے کون بچائے گا؟ میں کہاں جاؤں گا؟ کہاں؟ اس نے یہ باتیں اکثر سوچی تھیں۔ یہ خیالات مہینوں کی کوشش کے بعد مغلوب ہوئے تھے: "کرائے کے لیے" کا بھُرکیلا بورڈ زرد پڑ کر کھڑکی میں گر چکا تھا، سو اب کوئی کیسے جان سکتا تھا کہ دکان کرائے کے لیے خالی ہے؟ لیکن لوگ جانتے تھے۔ آج، جب وہ اپنے خوف کے بھوت کو تقریباً دفن کر چکا تھا، گلی میں لگے ایک سُرخ بینر کو دیکھ کر اس کی آنکھیں تڑخ گئیں: "قومی کریانہ والے اس جگہ اپنی ایک اَور سستے سودے کی دکان کھول رہے ہیں!" الم اس کے اندر اُتر کر اس کے دل کو لہولہان کر گیا۔

آخر کار سام نے سر اٹھایا اور اپنی بیوی سے کہا: "میں برابر والے مالک مکان سے ملتا ہوں۔"

سُورا نے سوجے ہوئے پپوٹوں سے اسے دیکھا۔ "کیا کہو گے اُس سے؟"

"میں اس سے بات کروں گا۔"

کوئی عام موقع ہوتا تو وہ کہہ دیتی: "سام، بے وقوف مت بنو!" مگر اس نے سام کو جانے دیا۔

کھڑکی میں لگے نئے سُرخ سائن بورڈ کی چمک سے اپنی نظریں بچاتے ہوئے وہ برابر کی عمارت کے ہال میں داخل ہوا۔ سیڑھیاں چڑھنے کی مشقت کے دوران چھت میں لگے روشندان کی بے کیف روشنی اس پر پڑنے لگی اور جوں جوں وہ اوپر گیا روشنی کی بے کیفی بڑھتی گئی۔ وہ بادلِ ناخواستہ جا رہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ مالک مکان سے آخر کہے گا کیا۔ آخری منزل پر پہنچ کر وہ دروازے کے آگے کسی عورت کی

بڑبڑاہٹ سن کر ٹھہر گیا جو اطالوی زبان میں اپنی قسمت کا ماتم کر رہی تھی۔ سام کا ایک پاؤں آخری سیڑھی پر تھا اور وہ واپس پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے کافی کا اشتہار سنا اور اسے احساس ہوا کہ یہ دراصل ایک ریڈیو ڈراما تھا۔ اب ریڈیو بند ہو چکا تھا اور راہداری میں مار ڈالنے والا سکوت تھا۔ اس نے سننے کے لیے کان لگائے اور جب پہلے پہل اندر کوئی آواز سنائی نہ دی تو اپنے آپ کو مزید سوچنے کا موقع دیے بغیر دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ وہ خوف زدہ سا تھا اور اس وقت تک تذبذب میں کھڑا رہا جب تک مالک مکان، جو سڑک کے اس پار حجام کی دکان بھی کرتا تھا، بھاری سُست قدموں سے چلتا دروازے تک نہ پہنچ گیا اور دروازہ، تالے کے بے صبری سے ٹٹولے جانے کے بعد، کھل نہ گیا۔

حجام نے جب سام کو ہال میں کھڑا دیکھا تو پریشان ہو گیا، اور سام فوراً جان گیا کہ وہ پچھلے دو ہفتوں میں ایک بار بھی اس کی دکان سے سودا لینے کیوں نہیں آیا۔ تاہم حجام نے پُرتپاک بن کر سام کو اندر باورچی خانے میں آنے کی دعوت دی جہاں اس کی بیوی اور ایک اجنبی کھانے کی میز پر بیٹھے لبالب بھری رکابیوں میں اسپاگیٹی کھا رہے تھے۔

"شکریہ،" سام نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں نے ابھی کھانا کھایا ہے۔"

حجام اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا ہوا ہال میں نکل آیا۔ اس نے نیچے جاتی سیڑھیوں پر مبہم سی نظر ڈالی اور سام کی طرف مڑا۔ اس کی حرکات سے ہچکچاہٹ ظاہر تھی۔ جنگ میں اپنے بیٹے کی ہلاکت کے بعد سے وہ غائب دماغ ہو گیا تھا اور بعض اوقات جب وہ چلتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی شے کو گھسیٹتا ہوا چل رہا ہو۔

"کیا یہ سچ ہے؟" سام نے پریشانی میں پوچھا۔ "نیچے سائن بورڈ پر جو لکھا ہے؟"

"سام،" حجام نے گمبھیر لہجے میں بات شروع کی۔ وہ ہاتھ میں لیے کاغذی رومال سے منہ صاف کرنے کو رکا اور پھر کہنے لگا: "سام، تم جانتے ہو، مجھے سات مہینے سے اس دکان کا کرایہ نہیں ملا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"میں اس کا مقدور نہیں رکھتا۔ میں کسی شراب کی دکان یا لوہے کے سامان والے کا انتظار کر رہا تھا لیکن اُن کی طرف سے کوئی پیش کش ہی نہیں ہوئی۔ پچھلے مہینے اس چین اسٹور نے مجھے پیش کش کی۔ پھر بھی میں نے پانچ ہفتے انتظار کیا کہ شاید کوئی اور آ جائے۔ آخر کار مجھے یہ پیش کش قبول کرنی پڑی۔ کوئی اور چارہ ہی نہیں تھا۔"

تاریکی میں سائے گہرے ہو گئے۔ ایک طرح سے پیلیگرینو بھی وہاں موجود تھا اور زینے کے سرے پر ان کے ساتھ کھڑا تھا۔

"کب آئیں گے یہ لوگ؟" سام نے آہ بھری۔

"مئی سے پہلے نہیں۔"

کریانہ فروش اتنا بے حواس تھا کہ کچھ بول نہ پایا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو تکتے رہے، ان کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کو کچھ نہ تھا۔ لیکن پھر حجام نے زبردستی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ زنجیری دکان

Scanned with CamScanner

سام کے کاروبار کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔
"کیوں نہیں پہنچائے گی؟"
"کیوں کہ تمہارے ہاں مختلف برانڈ کی چیزیں ہیں اور جب گاہکوں کو وہ برانڈ درکار ہوں گے تو وہ تمہارے پاس آئیں گے۔"
"میرے نرخ زیادہ ہیں تو وہ میرے پاس کیوں آئیں گے؟"
"چین اسٹور سے علاقے میں گاہکوں کی آمدورفت بڑھ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ان چیزوں کو پسند کریں جو تمہارے ہاں ہیں۔"
سام کو خفت محسوس ہوئی۔ اسے حجام کے اخلاص پر شبہ نہیں تھا لیکن اس کی دکان کا ذخیرہ محدود تھا اور وہ زنجیری دکان کے گاہکوں کو اپنی دکان میں دل چسپی لیتے قیاس نہ کر سکا۔
حجام نے سام کو بازو سے پکڑتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں اپنے ایک دوست کے بارے میں بتایا جو ایک اے اینڈ پی سُپر مارکیٹ کے برابر میں گوشت کی دکان چلا رہا تھا جو ٹھیک ٹھاک یافت دے رہی تھی۔
سام نے یہ یقین کرنے کی بہت کوشش کی کہ اس کا کاروبار بھی ٹھیک ٹھاک چلتا رہے گا مگر ناکام رہا۔
"تو تم نے معاہدے پر دستخط کر دیے؟"
"معاہدہ جمعے کو ہو گا۔"
"جمعے کو؟" سام اچانک پُر امید ہو گیا۔ "ہو سکتا ہے،" وہ خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا، "ہو سکتا ہے میں جمعے سے پہلے تمہیں ایک نیا کرایہ دار لا دوں۔"
"کس طرح کا کرایہ دار؟"
"کرایہ دار!" سام بولا۔
"کس چیز کی دکان کھولے گا؟"
سام نے سوچنے کی کوشش کی۔ "جوتوں کی دکان،" وہ بولا۔
"موچی؟"
"نہیں، جوتوں کی دکان جہاں جوتے بکتے ہیں۔"
حجام نے اس تجویز پر غور کیا۔ آخر کار اس نے کہا کہ اگر سام کوئی کرایہ دار لے آئے تو وہ زنجیری دکان سے معاہدہ نہیں کرے گا۔
سام جیسے جیسے سیڑھیاں اترا، آخری منزل پر لگے بلب کی روشنی اس کے کاندھوں پر کم ہوتی گئی لیکن اس کے ذہن پر بوجھ برقرار رہا، کیوں کہ اس کے ذہن میں ایسا کوئی شخص نہ تھا جو دکان کرائے پر لے سکتا۔
تاہم جمعے سے قبل اس نے دو افراد کے بارے میں سوچا۔ ایک تو کسی تھوک کریانہ فروش دلال کا لال

بالوں والا گماشتہ تھا جو پچھلے دنوں نئی دکانوں میں سرمایہ لگاتا رہا تھا، لیکن جب سام نے اس سے فون پر بات کی تو اس نے کہا کہ اسے صرف زیادہ آمدنی والی کریانہ کی دکانوں سے دل چسپی ہے۔ ظاہر ہے یہ مسئلے کا حل نہیں تھا۔ دوسرے آدمی سے بات کرنے میں سام کو تامل تھا کیوں کہ وہ اسے ناپسند تھا۔ یہ آدمی آئی کوفیین تھا، خشک اشیا کا سابق بیوپاری، جس کے دائیں ابرو کے نیچے ایک مسّا تھا۔ کوفیین نے جائیداد کے چند بڑے سودے کیے تھے اور خاصا دولت مند ہو گیا تھا۔ برسوں پہلے ولیمز برگ کی مارسی ایونیو پر اس کی اور سام کی دکانیں ساتھ ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ سام اسے گنوار سمجھتا تھا اور ایسا کہنے سے چوکتا بھی نہیں تھا۔ لیکن سُورا، یہ دیکھتے ہوئے وہ ترقی کر کے کہاں جا پہنچا ہے اور اس کا شوہر کہاں ہے، اکثر سام کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ اس کے باوجود سام اور کوفیین کے تعلقات نسبتاً بہتر رہے، شاید اس لیے کہ سام نے کبھی اس سے مدد طلب نہ کی تھی۔ جب کوفیین اپنی بیوک میں اتفاقاً ادھر آ نکلتا تو عموماً ان کے ہاں بھی آتا۔ سام کو یہ بات پسند نہ تھی کیوں کہ وہ بے حد و حساب مشورے دیا کرتا اور اس کے جانے کے بعد سُورا انہیں مزید ریگ مال لگاتی۔

شکوک و شبہات کے باوجود اس نے کوفیین کو فون کیا۔ کوفیین نے باوقار انداز میں حیرت کا اظہار کیا۔ تاہم اس نے کہا کہ وہ سوچے گا کہ اس بارے میں کیا کر سکتا ہے۔ جمعے کی صبح آئی تو حجام نے دکان کی کھڑکی میں سے سُرخ سائن بورڈ ہٹا لیا مبادا کوئی شخص ممکنہ سودے کے بارے میں پہلے سے کوئی رائے قائم کر لے۔ اُس سہ پہر جب کوفیین فوجی چال چلتا ہوا اپنی چھڑی کے ساتھ اندر آیا تو سام نے، جس نے سورا کی درخواست پر، پہلی بار اپنے ایپرن سے چھٹکارا پایا تھا، اس پر واضح کیا کہ ان کے خیال میں برابر والی دکان جوتوں کے کاروبار کے لیے موزوں ہے کیوں کہ علاقے میں جوتوں کی کوئی دکان ہے بھی نہیں اور پھر کرایہ بھی مناسب ہے۔ اور چوں کہ کوفیین کسی نہ کسی منصوبے میں ہمیشہ سرمایہ لگاتا رہتا ہے، لہذا انھوں نے سوچا کہ شاید اسے اس دکان میں بھی دل چسپی ہو۔ سڑک پار سے حجام بھی آ گیا اور اس نے دکان کا تالا کھولا۔ کوفیین خالی دکان میں داخل ہوا۔ اس نے دکان کے ڈھانچے کو آنکا، فرش کو جانچا، کھڑکی کی سلاخوں میں سے جھانک کر عقبی حصے کو دیکھا اور آنکھیں سکیڑتے ہوئے، ہلتے ہوئے ہونٹوں سے حساب لگایا کہ کتنے تختے لگانے ہوں گے اور ان پر کیا لاگت آئے گی۔ پھر اس نے حجام سے کرایہ پوچھا اور حجام نے ایک مناسب رقم بتا دی۔

کوفیین نے دانش مندانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دی لیکن وہاں ان دونوں میں سے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ البتہ کریانے کی دکان میں لوٹ کر اس نے سام کو اپنا وقت ضائع کرنے پر بُری طرح لتاڑا۔

"میں اُس غیر یہودی کے سامنے تمھیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔" غصّے میں اس کا مسّا بھی سُرخ ہو رہا تھا۔ "لیکن تمھارے خیال میں کون صحیح الدماغ آدمی اس سڑی ہوئی بستی میں جوتوں کی دکان کھولے گا؟"

رخصت ہونے سے قبل، جس طرح ٹیوب ٹوتھ پیسٹ نکالتی ہے، اس نے ڈھیر سارے مشورے

دیے اور سام سے یہ کہتے ہوئے اپنی بات ختم کی: "اگر چین اسٹور کھل گیا تو تم برباد ہو جاؤ گے۔ اس سے پہلے کہ گدھ تمھاری ہڈیوں سے گوشت نوچ ڈالیں، یہاں سے نکل جاؤ۔"

پھر وہ اپنی بیوک میں بیٹھ کر چلا گیا۔ سُورا کچھ تبصرہ شروع کرنے ہی والی تھی کہ سام نے اپنی مٹھی زور سے میز پر ماری اور بات وہیں ختم ہو گئی۔ اسی شام حجام نے کھڑکی میں سُرخ سائن بورڈ دوبارہ لگا دیا کہ اس نے معاہدے پر دستخط کر دیے تھے۔

راتوں کو بے خواب لیٹا سام جانتا تھا کہ دکان کے اندر کیا ہو رہا ہے، گو دکان کے قریب وہ کبھی نہیں گیا۔ وہ بڑھئیوں کو خوشبو دیتی ہوئی چیڑ کی لکڑی پر آرا چلاتے دیکھ سکتا تھا جس کی تیز دھار کے آگے لکڑی نے خوشی سے سپر ڈال دی تھی اور تقریباً چھت تک اٹھتی ہوئی تختوں کی متوازی قطاروں میں ڈھل گئی تھی۔ رنگ ساز آئے جن میں ایک طویل قامت تھا اور دوسرا پستہ قد، جس کے بارے میں سام کو یقین تھا کہ وہ اسے جانتا ہے۔ ان کے چہرے رنگ کے چھینٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے چھت کو گاڑھے چونے سے پوتا اور ہر شے کو شوخ رنگوں میں، جو کریانے کی دکان کے اعتبار سے عجیب مگر نظروں کے لیے خوش کن تھے، رنگ دیا۔ بجلی والے دودھیا لیمپوں کے ساتھ نمودار ہوئے جنھوں نے گول بلبوں کی زرد تاریکی کو موم کر دیا۔ پھر مستریوں نے اپنی گاڑیوں سے سنگِ مرمر کی سطح والے لمبے لمبے کاؤنٹر اور تین دروازوں والا چمکتا ہوا ریفریجریٹر اتارا جس میں کھانوں میں ڈالنے والے، درمیانے اور اعلیٰ درجے کے مکھن کے لیے الگ الگ خانے تھے اور منجمد کھانوں کے لیے ایک سفید براق الماری جو بالکل تازہ ایجاد تھی۔

ان سب چیزوں کو سراہنے کے دوران وہ یہ دیکھنے کو مڑا کہ اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے، اور اپنا اطمینان کرنے کے بعد جب اس نے دیکھنے کے لیے کھڑکی کی طرف دوبارہ رخ پھیرا تو کھڑکی کا شیشہ سفید ہو چکا تھا اور اب وہ کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تب اسے سگریٹ پینے کے لیے اٹھنا پڑا اور اسے ترغیب ہوئی کہ پتلون پہن کر چپلوں میں چپکے سے سیڑھیاں اتر جائے اور دیکھے آیا کھڑکی پر واقعی رنگ پھیرا گیا ہے۔ اس شک نے کہ غالباً ایسا ہی ہوا ہے، اسے جانے سے باز رکھا۔ سو وہ بستر پر واپس آ گیا اور چوں کہ ابھی تک سونے میں ناکام تھا لہٰذا اس نے ایک چیتھڑے کی مدد سے رنگ صاف کر کے کھڑکی کے وسط میں ایک سوراخ بنا لیا اور اسے بڑا کرتا رہا یہاں تک کہ اسے ہر چیز صاف نظر آنے لگی۔ دکان اب تیار تھی، بنی سنوری، کشادہ، اور مال وصول کرنے کے لیے تیار، اور اس میں داخل ہونا باعث مسرت تھا۔ اس نے اپنے آپ سے سرگوشی کی کہ اگر یہ میری ہوتی تو کیا اچھا تھا۔ لیکن تبھی الارم بجنے لگا اور اسے دودھ کے کنستر گھسیٹنے کے لیے بستر سے اٹھنا پڑا۔ آٹھ بجے تین بڑے بڑے ٹرک نمودار ہوئے، سفید براق جیکٹیں پہنے چھ نوجوان نیچے کودے اور انھوں نے سات گھنٹے میں دکان کو بھر دیا۔ سام کا دل تمام دن اس شدت سے دھڑکتا رہا کہ بعض اوقات اسے اپنے دل کو کسی ایسے پرندے کی طرح پچکارنا پڑا جو اُڑ جانا چاہتا ہو۔

جب مئی کے وسط میں، کھڑکی میں سجے نعل کی شکل کے گلابوں کے بڑے سے دستے کے ساتھ، زنجیری دکان کا افتتاح ہوا تو سُورا نے اُس رات بکری کا حساب لگانے کے بعد اعلان کیا کہ وہ دس ڈالر

خسارے میں ہیں۔ سام نے کہا کہ یہ کوئی زیادہ رقم نہیں ہے، مگر سورا نے اسے یاد دلایا کہ یہ ضرب دس ساٹھ ہوتے ہیں۔ وہ کھلے بندوں رو پڑی اور سسکیاں بھرتے ہوئے بولی کہ انہیں کچھ نہ کچھ ضرور کرنا ہوگا۔ اس نے سام کو گیلا کپڑا تھماتے ہوئے تختوں کی مکمل صفائی کرنے، فرش کو تیل لگانے اور سامنے کی کھڑکی کو، جو اس نے سفید ٹشو پیپر سے دوبارہ سجائی تھی، اندر باہر سے دھونے پر مجبور کر دیا۔ پھر اس نے سام سے تھوک فروش کو بلانے کے لیے کہا جس نے ہفتے کی خاص خاص چیزیں فہرست میں سے پڑھ کر سنائیں، اور جب وہ چیزیں دکان میں پہنچا دی گئیں تو سام نے کھڑکی میں ڈبوں کی تین پیٹیاں اہرام کی شکل میں سجا دیں۔ مگر کوئی خریدتا ہوا ہی نہیں لگتا تھا۔ اگلے ہفتے انہیں پچاس ڈالر کم ملے۔ سام نے سوچا کہ اگر بات یہیں تک رہے تو بھی ہم جی سکتے ہیں۔ اس نے بیئر کی قیمت گھٹا دی اور لپیٹنے والے کاغذ پر سیاہ کھریا سے موٹا موٹا لکھ کر کھڑکی میں رکھ دیا کہ بیئر کی قیمت میں کمی ہو گئی ہے۔ اس طرح اُس روز اس نے پورے پانچ ڈبے زیادہ بیچے، حالاں کہ سُورا ملامت کرتی رہی کہ اگر منافع ہی حاصل نہ ہو تو پھر اس سے کیا فائدہ، اور پھر جو گاہک بیئر یہاں سے لیتے تھے وہ ڈبل روٹی اور ڈبا بند چیزیں لینے برابر کی دکان میں جاتے تھے۔ تاہم سام ابھی تک پُرامید تھا۔ مگر اگلے ہفتے وہ بیئر ڈالر پیچھے رہ گئے اور دو ہفتوں میں خسارہ پورے سو ڈالر تک پہنچ گیا۔ زنجیری دکان جس میں ایک مینیجر اور دو کلرک تھے، سارا دن گاہکوں سے بھری رہتی، لیکن سام کے لیے اب بیئر جیسی کوئی چیز نہیں رہ گئی تھی۔ تب اس نے دریافت کیا کہ برابر والی دکان میں ہر وہ برانڈ موجود ہے جو اس کے ہاں ہے بلکہ اَور بھی بہت سے برانڈ جو اس کے ہاں نہیں ہیں۔ اس نے نجّام کے لیے سخت طیش محسوس کیا۔

گرمیوں کا موسم، جو عموماً اس کے کاروبار کے لیے اچھا رہتا تھا، اس بار خراب گزرا، اور خزاں اس سے بدتر۔ اس کی دکان میں ایسا سکوت تھا کہ جب کوئی دروازہ کھولتا تو خوشی اس کی رگوں میں اتر جاتی۔ وہ اور سورا اپنی دکان کے عقبی حصے میں گھنٹوں بے سرپوش بلب کے نیچے بیٹھے کئی کئی بار اخبار پڑھتے اور جب بھی کوئی باہر گلی میں گزرتا تو پُرامید ہو کر دیکھنے لگتے۔ حالاں کہ جب وہ جان لیتے کہ وہ برابر کی دکان میں جا رہا ہے تو اُدھر نہ دیکھنے کی کوشش کرتے۔ اب سام آدھی رات تک، مزید ایک گھنٹا، دکان کھلی رکھتا؛ گو یہ اضافی وقت اسے اَور تھکا دیتا لیکن کوئی بھولی بھٹکی خاتونِ خانہ جس کے ہاں دودھ ختم ہو جاتا یا جسے اپنے اسکول جانے والے بچوں کو سینڈوچ دینے کے لیے ڈبل روٹی کی ضرورت ہوتی، آ نکلتی اور یوں وہ دو ایک ڈالر کما لیتا۔ اخراجات کم کرنے کے لیے اس نے دکان کے ایک لیمپ کے علاوہ کھڑکی کی دو روشنیوں میں سے بھی ایک ہٹا دی۔ اس نے اپنا فون کٹوا دیا اور کاغذی تھیلے پھیری والوں سے لینے لگا۔ وہ داڑھی ایک دن چھوڑ کر مونڈنے لگا اور -- حالاں کہ وہ اسے تسلیم نہیں کرتا تھا -- کم کھانے لگا۔ پھر خوش امیدی کی ایک غیر متوقع لہر میں اس نے تھوک فروش کو مختلف اشیا کی اٹھارہ پیٹیوں کے لیے کہہ دیا اور اپنے تختوں کے خالی حصے، کم قیمت کے واضح اعلان کے ساتھ، ان چیزوں سے بھر لیے۔ لیکن، جیسا کہ سُورا نے کہا، جب کوئی اندر ہی نہیں آتا تو انہیں دیکھتا کون؟ جن لوگوں کو وہ دس، پندرہ، بلکہ بیس سال سے

ہر روز دیکھتا تھا اس طرح غائب ہو گئے گویا ترکِ سکونت کر گئے ہوں، یا مر گئے ہوں۔ بعض اوقات کسی گھر میں کوئی چھوٹا موٹا سودا پہنچاتے ہوئے وہ اپنے کسی سابق گاہک کو دیکھتا جو یا تو جلدی سے سڑک پار کر جاتا یا سر جھکا کر الٹا راستا چلتے ہوئے عمارت کے دوسری طرف گھوم جاتا۔ حجّام بھی اس سے کترانے لگا تھا، اور وہ بھی حجّام سے کتراتا تھا۔ سام نے کھلی چیزوں میں ڈنڈی مارنے کا منصوبہ بنایا لیکن خود کو اس پر آمادہ نہ کر سکا۔ اس نے محلّے میں گھر گھر جا کر ذاتی طور پر پہنچائے جانے والے سودے کے آرڈر لینے کے بارے میں سوچا لیکن اسے مسٹر پیلیگرینو یاد آ گیا اور اس نے یہ خیال ترک کر دیا۔ سُورا، جوان کی پوری شادی شدہ زندگی اسے طعنے دیتی رہی تھی، اب عقبی حصّے میں خاموش بیٹھی رہتی۔ جب سام نے دسمبر کے پہلے ہفتے کی بِکری کا حساب لگایا تو جان گیا کہ اب مزید امید بے کار ہے۔ باہر ہوا چل رہی تھی اور دکان یخ بستہ تھی۔ اس نے دکان بیچنی چاہی مگر کوئی لینے والا نہیں آیا۔

ایک صبح سُورا بیدار ہوئی اور آہستگی سے اپنے رخسار اپنے تیز ناخنوں سے کھرچ ڈالے۔ سام بال کٹوانے سڑک کے پار گیا۔ پہلے وہ مہینے میں ایک بار بال کٹواتا تھا لیکن اب اسے حجامت کرائے دس ہفتے ہو چکے تھے اور اس کی گدّی پر بالوں کا موٹا پشتہ تھا۔ حجّام نے اس کے بال آنکھیں بند کر کے تراشے۔ پھر سام نے ایک نیلام کرنے والے کو بلایا جو دو زندہ دل نائبوں اور نیلامی کے سُرخ پھریرے کے ساتھ آ پہنچا۔ پھریرا برفیلی ہوا میں اس طرح پھڑپھڑا رہا تھا گویا یہ کوئی تعطیل کا دن ہو۔ جو رقم انھیں ملی وہ اس کا چوتھائی بھی نہیں تھی جو انھیں قرض خواہوں کو دینی تھی۔ سام اور سُورا نے دکان بند کر دی اور کہیں چلے گئے۔ سام جب تک جیا اس علاقے میں نہیں پلٹا کیوں کہ اسے خوف تھا کہ اس کی دکان خالی پڑی ہے اور کھڑکی میں سے جھانکنے سے اسے دہشت آتی تھی۔

**

(انگریزی عنوان : The Cost of Living)

برنارڈ مالامڈ

انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی

میری موت

سفید ہوتے ہوئے گھنے بالوں، باریک اور نازک بھنوؤں اور فیض رساں ہاتھوں والا مارکس ایک خوش دل شخص تھا جو جنگ سے بہت پہلے درزی تھا لیکن زندگی میں نسبتاً دیر سے لباس فروش بن گیا تھا۔ خوش حالی کی قیمت اسے اپنی صحت سے چکانی پڑی تھی لہذا اسے عقبی کمرے میں ایک معاون درزی ملازم رکھنا پڑا جو ملبوسات میں کتر بیونت تو کر لیتا تھا مگر جب کام بڑھ جاتا تو استری کا کام نہیں سنبھال پاتا تھا۔ سو ایک استری کرنے والا رکھنا پڑا، اور یوں دکان گو اچھی خاصی چلتی تھی مگر بہت اچھی نہیں چلتی تھی۔

دکان بہتر یافت دے سکتی تھی مگر استری کرنے والے یوسپ بروزاک نے، جو بیسٹر کا دھتی اور پسینے میں نہایا رہنے والا بھاری بھر کم پولستانی تھا اور بنیان اور چپل پہنے اس انداز میں کام کرتا تھا کہ پتلون اس کے موٹے کولھوں پر ڈھیلی ہوتی اور ٹانگیں ٹخنوں پر گری پڑ رہی ہوتیں، درزی امیلیو ویزو کے خلاف سخت نفرت پیدا کر لی جو دبلا پتلا، کبوتر سینہ، خشک مزاج شخص تھا اور رسلی کا رہنے والا تھا۔ یا شاید معاملہ اس کے برعکس تھا، مارکس کو ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا۔ ممکن ہے درزی استری کرنے والے سے کینہ رکھتا ہو یا جواباً اس سے نفرت کرتا ہو۔ ان دونوں کے جھگڑوں کے باعث کاروبار پر بُرا اثر پڑ رہا تھا۔

ناراض مُرغوں کی طرح پھڑپھڑاتے، کٹکٹاتے اور اس عمل میں ہولناک زبان اور کھردرے الفاظ استعمال کرتے ہوئے، جنھیں سن کر گاہک توہین محسوس کرتے اور بعض اوقات مارکس کا سر غشی سے چکرانے لگتا، وہ آپس میں کیوں لڑتے ہیں، یہ بات لباس فروش کو چکرا دیتی جو اُن کے مصائب جانتا تھا اور محسوس کرتا تھا کہ وہ کافی حد تک یکساں ہیں۔ یوسپ، جو ایسٹ ریور کے قریب ایک نیم تباہ شدہ اقامتی

Scanned with CamScanner

عمارت میں رہتا تھا، برف سے بھری ایک زنگ آلود پرات میں درجن بھر بوتلیں رکھتا اور کام کرتے وقت مسلسل بیئر سُڑ سُڑکتا رہتا۔ جب مارکس نے شروع شروع میں اعتراض کیا تو یوسِپ، جو ہمیشہ لباس فروش کی عزت کرتا تھا، پرات کو بند کر کے عقبی دروازے سے گلی میں واقع شراب خانے میں غائب ہو گیا، اور اس عمل میں اتنا قیمتی وقت ضائع کیا کہ مارکس نے اسے دوبارہ بیئر کی پرات رکھنے کی اجازت دینا ہی سودمند سمجھا۔ ہر روز دوپہر کے کھانے کے وقت یوسِپ دراز میں سے ایک چھوٹا تیز چاقو نکال کر لہسن کی سخت سلامے کے بڑے بڑے ٹکڑے کاٹتا جنہیں وہ سفید روٹی کے پھُولے ہوئے ٹکڑوں کے ساتھ کھاتا اور پہلے بیئر اور پھر بغیر دودھ شکر کے اس قہوے کے ساتھ حلق سے اتار لیتا جو درزی کی استری کے گیس اسٹوو پر تیار کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ گوبھی سے کوئی شوربہ نما چیز بناتا جس کی بُو ساری دکان کو سڑا دیتی۔ لیکن مجموعی طور پر نہ تو اسے سلامے سے دل چسپی تھی نہ شوربے سے۔ وہ کئی کئی دن تک مضمحل اور بے چین رہتا جب تک ہر تیسرے ہفتے سمندر پار سے اس کے نام آنے والا خط نہ آ جاتا۔ جب اسے خط ملتا تو ایک سے زائد بار ایسا ہوا کہ اس نے اپنی جوش سے کانپتی انگلیوں سے اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ وہ اپنا کام بھول جاتا اور بغیر پشت کی کرسی پر بیٹھ کر اسی دراز سے جہاں اپنا سلامے رکھتا تھا، چٹخے ہوئے شیشوں والا چشمہ نکال کر پھندے دار ڈوریوں سے، جو اس نے ٹوٹی ہوئی کمانیوں کی جگہ باندھ رکھی تھیں، اپنے کانوں پر چڑھا لیتا۔ پھر وہ کھردری پولستانی زبان میں پھیکی بھوری روشنائی سے لکھے ہوئے پتلے کاغذوں کے ورق اپنی مٹھی میں سنبھال کر پڑھنا شروع کرتا۔ وہ ان خطوں کا ایک ایک لفظ اس طرح بہ آوازِ بلند ادا کرتا کہ مارکس، جو یہ زبان جانتا تھا، نہ چاہنے کے باوجود سنتا۔ ابھی وہ خط کی گہرائی میں دو جملوں تک بھی نہ گیا ہوتا کہ اس کے خدوخال بھیگ جاتے اور وہ رونے لگتا۔ آنسو اس کے گالوں اور ٹھوڑی کو یوں داغ دار کر دیتے جیسے ان پر کوئی مکھی مار دوا چھڑکی گئی ہو۔ خط ختم کر لینے کے بعد وہ زور زور سے سسکیاں لینے لگتا۔ یہ عمل، جس کا دیکھنا ایک ہولناک تجربہ تھا، اسے گھنٹوں کے لیے ناکارہ بنا کر رکھ دیتا اور یوں ساری صبح اکارت ہو جاتی۔

مارکس نے اکثر سوچا تھا کہ اسے اپنے خط گھر لے جا کر پڑھنے کو کہے، لیکن خطوں کے مضمون سے اس کا جی بھر آتا اور وہ یوسپ کو سخت سست کہنے پر خود کو آمادہ نہ کر پاتا، جو، بر سبیلِ تذکرہ، اپنے کام کا ماہر تھا۔ ایک بار جب وہ کپڑوں کا ڈھیر لگا کر استری کرنا شروع کرتا تو بھاپ دیتی ہوئی مشین رکے بغیر سُوں سُوں کرتی چلی جاتی اور ہر لباس اس صفائی سے باہر آتا کہ نہ تو اس میں کہیں اُبھار ہوتا اور نہ کوئی فالتو تہہ، اور آستینوں اور پائنچوں کی تہیں اور چُنٹیں تلوار کی دھار جیسی تیز ہوتیں۔ جہاں تک خطوں میں لکھی ہوئی باتوں کا تعلق ہے، وہ اس کی دق زدہ بیوی اور چودہ سالہ بد نصیب بیٹے کے غم انگیز تجربوں سے متعلق ہمیشہ ایک جیسی ہوتیں۔ اس لڑکے کو جو حقیقتاً سوروں کے ساتھ کیچڑ میں رہتا تھا، یوسپ نے تصویر کے سوا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر لڑکا بیمار بھی تھا۔ اگر اس کا باپ اسے امریکا بلا... کا کرایہ جمع بھی کر لیتا، اور لڑکے کو ویزا بھی مل جاتا، تو امیگریشن کے ڈاکٹر اسے اندر نہ آنے دیتے۔ مارکس نے ایک سے زائد بار

یوسپ کو اس کے بیٹے کے لیے کپڑے دیے اور کبھی کبھار کچھ رقم بھی، لیکن اسے شک ہی تھا کہ یہ چیزیں اُس تک پہنچی ہوں گی۔ اسے یہ بے چین کرنے والا خیال آتا کہ اگر یوسپ چاہتا تو گزشتہ چودہ سال کے عرصے میں اپنے بیٹے کو، اور دق کا شکار ہونے سے پہلے اپنی بیوی کو بھی، بلوا سکتا تھا، لیکن نہ جانے کیوں وہ انہیں وہیں رکھ کر ان کی یاد میں رونے کو ترجیح دیتا تھا۔

امیلیو درزی ایک اور تنہائی کا مارا شخص تھا۔ وہ ہر روز تین عمارت پرے واقع ریستوراں میں چالیس سینٹ کا کھانا کھاتا لیکن اپنا "کوریئر" رسالہ پڑھنے کے لیے جلدی لوٹ آتا۔ اس میں عجیب بات یہ تھی کہ ہمیشہ اپنے آپ سے سرگوشیاں کرتا رہتا تھا۔ کیا کہتا تھا یہ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن اس کی سرگوشیاں سسکاریوں جیسی اور توجہ طلب ہوتیں۔ حالاں کہ وہ کبھی روتا نہیں تھا مگر جہاں بھی کہیں کھڑا ہوتا، اس کی التجا کرتی، آہستہ سے کراہتی، سسکارتی ہوئی آواز ہر کوئی سن سکتا تھا۔ وہ کوئی بٹن لگا رہا ہو، آستین چھوٹی کر رہا ہو یا استری کر رہا ہو، سرگوشیاں مسلسل چلتی رہتیں۔ صبح جب وہ اپنا کوٹ اتار کر لٹکاتا تو سرگوشی کر رہا ہوتا اور جب رات کو اپنا سیاہ ہیٹ سر پر رکھ کر اپنے دبلے شانے کوٹ میں پھنسا کر تنہا دکان سے رخصت ہوتا تب بھی سرگوشی کر رہا ہوتا۔ صرف ایک بار، جب ایک صبح لباس فروش اس کے چہرے کی زردی دیکھ کر اس کے لیے قہوہ لایا، اس نے اشارتاً بتایا کہ یہ سرگوشی کیا ہے۔ اس نے مارکس کو ممنونیت کے ساتھ رازدار بناتے ہوئے بتایا کہ اس کی بیوی، جو پچھلے ہفتے لوٹ آئی تھی، اس ہفتے پھر اسے چھوڑ گئی ہے، اور یہ بتانے کے لیے کہ وہ پانچ بار اسے چھوڑ کر بھاگ چکی ہے، اس نے اپنے استخوانی ہاتھ کی انگلیاں سامنے کر دیں۔ مارکس نے اس سے اظہار ہمدردی کیا اور اس کے بعد وہ جب کبھی دکان کے عقبی کمرے میں درزی کو سرگوشی کرتے سنتا تو ہمیشہ چشم تصور سے اس کی بیوی کو، جہاں کہیں بھی وہ تھی وہاں سے، اس کے پاس لوٹتے دیکھتا؛ وہ کہہ رہی ہوتی، قسم کھا رہی ہوتی، کہ اس بار ہمیشہ اس کے پاس رہے گی، مگر رات کو جب وہ لیٹتے اور درزی اس کے آس پاس سرگوشیاں کرنا شروع کرتا تو وہ سوچتی کہ ان سرگوشیوں سے عاجز آ چکی ہے اور صبح ہوتے ہی پھر چلی جاتی۔ اور یوں درزی کی بے انت سرگوشیاں مارکس کو دق کرتی رہتیں اور اسے خاموشی کو سننے کی غرض سے دکان سے باہر جانا پڑتا۔ اس کے باوجود وہ امیلیو کو رکھے رہا کیوں کہ وہ بہر حال ایک عمدہ درزی تھا۔ وہ سوئی ہاتھ میں لے کر کسی جن کی طرح کام کرتا اور ایک عام کاریگر ناپ لینے میں جتنا وقت لگاتا ہے اُس سے بھی کم وقت میں ایک پورا کف سی لیتا۔ وہ اس قسم کا درزی تھا جنھیں ڈھونڈنے نکلو تو مشکل ہی سے ہاتھ آتے ہیں۔

اس امر کے باوجود کہ عقبی کمرے میں دونوں ہی شور مچایا کرتے تھے، ایک سال سے زیادہ عرصے تک استری کرنے والا اور درزی ایک دوسرے پر کوئی توجہ دیتے نظر نہ آتے تھے۔ پھر ایک دن، جیسے ان کے درمیان کوئی غیر مرئی دیوار ڈھے گئی ہو، انھوں نے ایک دوسرے کا گلا دبوچ لیا۔ ایک سہ پہر کو جب مارکس دکان میں ایک گاہک کو چھوڑ کر نشان لگانے والا چاک لینے عقب میں گیا تو ایسا لگا جیسے اس نے ان کے باہمی بغض کی عین پیدائش کے وقت اندر قدم رکھا ہو۔ اس کے سامنے ایسا منظر تھا جس نے اسے

منجمد کر دیا۔ سہ پہر کی دھوپ میں، جو دکان کے عقبی حصّے کو بھرے دیتی تھی اور جس نے لباس فروش کو لمحاتی طور پر اندھا کر کے یہ سوچنے کا وقت دے دیا تھا کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ ممکنہ طور پر دیکھ نہیں سکتا، وہ مقابل گوشوں میں بیٹھے شدید نفرت کی ایک زندہ، تقریباً بالوں بھری، ٹکٹکی کے ساتھ ایک دوسرے کو چپ چاپ گھور رہے تھے۔ حقارت سے مسکراتے ہوئے پولستانی نے اپنے ایک کانپتے ہاتھ میں لکڑی کا بھاری کندہ دبا رکھا تھا جب کہ غضب ناک درزی، جس نے اپنی پشت بلی کی طرح دیوار سے لگا رکھی تھی، اپنی سخت انگلیوں میں کپڑا تراشنے کی قینچی ہوا میں بلند کیے ہوئے تھا۔

"کیا ہوا؟" جب مارکس کی گویائی بحال ہوئی تو اس نے چلّا کر پوچھا لیکن دونوں میں سے کوئی سکوت توڑنے پر تیار نہ ہوا اور دونوں اسی حالت میں دکان کے مخالف گوشوں سے ایک دوسرے پر نظر جمائے رہے جس حالت میں مارکس نے انھیں پایا تھا۔ درزی کے ہونٹ حرکت کر رہے تھے اور استری والا کسی گرمی میں آئے ہوئے کتّے کی طرح زور زور سے سانس لے رہا تھا، اور دونوں پر ایسی اجنبیت طاری تھی جس کا مارکس نے کبھی شبہ تک نہیں کیا تھا۔

"میرے خدا،" وہ رینگتی ہوئی سرد نمی میں شرابور بدن کے ساتھ چلّایا۔ "مجھے بتاؤ، آخر ہوا کیا ہے؟" لیکن دونوں میں سے کسی نے ایک آواز تک نہ نکالی، سو وہ اپنے گلے کے کھنچاؤ میں سے چیخا جس کے باعث الفاظ بھیت ناک طور پر ر گڑھاتے ہوئے لگے: "چلو اپنے کام پر۔۔۔" اسے یقین نہیں تھا کہ وہ دونوں تعمیل کریں گے لیکن جب انھوں نے اس کا کہا مان لیا اور یوسپ کسی ڈھیر کی طرح واپس مشین پر چلا گیا اور بدن اکڑائے ہوئے درزی نے اپنی گرم استری سنبھال لی تو اس کا دل بھر آیا اور اس نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے، جیسے وہ بچوں سے مخاطب ہو، ان سے کہا: "لڑکو، یاد رکھنا، لڑنا نہیں۔"

بعد ازاں لباس فروش اپنی دکان کے سائے میں تنہا کھڑا، سامنے کے دروازے کے شیشے میں سے مطلقاً کسی بھی شے کو نہ گھورتا ہوا، اپنے بالکل عقب میں موجود ان دونوں کے بارے میں سوچتا، خاکستری گھاس اور بپھرتی دھوپ، کراہوں اور بُوئے خوں کی ہولناک دنیا میں گم رہا۔ انھوں نے اس کا سر چکرا دیا تھا۔ دل میں یہ دعا مانگتے ہوئے کہ جب تک وہ اپنی کراہت پر بخوبی قابو نہ پا لے کوئی گاہک دکان میں داخل نہ ہو، اس نے خود کو چمڑے کی کرسی پر گرا دیا۔ آہیں بھرتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں موند لیں اور اپنی چشمِ تصوّر سے انھیں ایک دوسرے کے مسلسل تعاقب میں دیکھ کر اپنی کھوپڑی میں ایک نئی دہشت کو جنم لیتا محسوس کیا۔ ان میں سے ایک، دوسرے کے پیچھے جس نے اس کے ٹوٹے ہوئے بٹنوں کا ڈبّا چرا لیا تھا، گرتا پڑتا دیوانہ وار بھاگ رہا تھا، اور آگے بھاگنے والا عالمِ فرار میں تمازت جلتی اور دھواں دیتی ہوئی ریت کے کنارے کنارے وہ ایک اونچی ڈھلواں چٹان پر چڑھ گئے۔ دو ہاتھوں کی کشمکش میں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے، وہ دونوں لگر پر لڑکھڑاتے رہے یہاں تک کہ ان میں سے ایک کا پیر کیچڑ میں پھسلا اور اس نے دوسرے کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ خالی ہاتھ آگے بڑھانے پر وہ اپنی اکڑی ہوئی انگلیوں سے صرف ہوا کو پکڑ سکے اور مارکس، جو تماشائی تھا، ان کے مفقود ہونے پر آواز نکالے بغیر چیختا رہا۔

Scanned with CamScanner

وہ گھومتے ہوئے سر کے ساتھ بیٹھا رہا یہاں تک ان سوچوں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔

جب وہ اپنے آپ میں آیا تو یاد نے اس واقعے کو ایک طرح کے خواب کی صورت دے دی اور وہ کسی ناخوشگوار واقعے کے پیش آنے سے منکر ہو گیا۔ تاہم وہ جانتا تھا کہ ایسا ہوا ہے، سو اس نے اسے معمولی بات کا نام دے دیا۔ کیا اس نے اُس کارخانے میں جہاں وہ امریکا آنے کے بعد کام کرتا تھا، لوگوں کے درمیان ایسی لڑائیاں بارہا نہیں دیکھی تھیں؟ معمولی باتوں کو سب بھول جاتے ہیں، خواہ وہ لحاظ طور پر کیسی ہی شدید ہوں۔

تاہم اگلے ہی روز، اور اس کے بعد ایک دن کے ناغے کے بغیر ہر روز، اُن دونوں کی نفرت شدید اور پُرشور جھگڑے کی صورت میں پھٹ پڑی جس سے کاروبار متاثر ہونے لگا۔ وہ بدنما آوازوں میں ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے۔ لباس فروش اس قدر خفیف ہوا کہ اس نے پیمائش کا فیتہ، جسے وہ پوشاک کی طرح شانوں پر ڈالے رہتا تھا، ایک بار تو اپنی گردن میں لپیٹ لیا۔ گاہک اور لباس فروش نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا اور مارکس کو جلدی جلدی اس کا ناپ نمٹاتے بنی۔ گاہک جو عموماً اپنے نئے لباس سے متعلق گفتگو کو طول دینا پسند کرتا تھا، ادائیگی کے بعد تیزی سے رخصت ہو گیا تاکہ ان نفرت انگیز گالیوں کے سَیل سے بچ سکے جو عقبی کمرے میں یوں اچھالی جا رہی تھیں کہ انھیں سامنے کے حصے میں بھی واضح طور پر سنا جا سکتا تھا اور کسی کو خلوت میسّر نہ تھی۔

وہ صرف ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتے ہوئے دشنام طرازی ہی نہیں کر رہے تھے بلکہ اپنی اپنی زبان میں ہولناک باتیں بھی بڑبڑا رہے تھے۔ لباس فروش سمجھ گیا کہ یوسپ چیخ چیخ کر کسی کے اعضائے تناسل کاٹ کر وہاں نمک بھرنے کی بات کر رہا ہے لہٰذا اس نے اندازہ لگایا کہ امیلیو بھی ایسا ہی کچھ چلّا رہا ہو گا، اور وہ بیک وقت اداس اور مشتعل ہو گیا۔

وہ انھیں سمجھانے کئی بار عقب میں گیا اور انھوں نے اس کا ایک ایک لفظ توجہ اور تحمّل سے سنا، کیوں کہ لباس فروش نیک دل ہونے کے علاوہ، جو اس کی آنکھوں سے عیاں تھا، بلیغ بھی تھا اور اس خصوصیت کے وہ دونوں شائق تھے۔ لیکن اس کے الفاظ، جو کچھ بھی تھے، رائیگاں گئے، کیوں کہ جوں ہی وہ اپنی بات ختم کر کے واپس مڑتا، وہ دونوں پھر سے شروع ہو جاتے۔ زخم خوردہ مارکس دکان میں سمٹ جاتا اور سنہری لمحے گِنتے ہوئے زرد چہرہ گھنٹے کے نیچے بیٹھا اپنے زخم چاٹا کرتا یہاں تک کہ کام بند کرنے (حیرت تھی کہ وہ اب بھی کچھ کام کر لیتے تھے) اور گھر جانے کا وقت ہو جاتا۔

اس کی خواہش تو یہ تھی کہ انھیں چوتڑوں پہ لات مار کے نکال دے، لیکن وہ تصور نہ کر پایا کہ ایک بہت بڑی رقم خرچ کیے بغیر دو اور مددگار، جو اِن دونوں جیسے، ہنرمند اور ماہر ہوں، کہاں سے لائے گا۔ لہٰذا اپنے ذہن میں اصلاح کو اوّلیت دیتے ہوئے اس نے ایک دوپہر امیلیو کو، جب وہ کھانا کھانے جا رہا تھا، روک لیا، اسے سرگوشی کر کے ایک کونے میں لے گیا اور اس سے کہا: "سنو امیلیو، دونوں میں تمھیں ذہین ہو، مجھے بتاؤ کہ تم لڑتے کیوں ہو۔ اور ایک دوسرے سے نفرت کیوں کرتے ہو اور ایسے گندے گندے الفاظ

کیوں استعمال کرتے ہو؟"

اگرچہ درزی کو اس کا یوں سرگوشی کرنا اچھا لگا اور وہ لباس فروش کی ہتھیلیوں میں موم ہو گیا مگر ان چھوٹی چھوٹی نوازشوں کو پسند کرنے کے باوجود اس نے نظریں جھکا لیں اور اس کا چہرہ بری طرح سُرخ ہو گیا۔ لیکن یا تو وہ جواب دینا ہی نہیں چاہتا تھا یا پھر دے نہیں سکا۔

چناں چہ مارکس پوری سہ پہر کانوں میں انگلیاں دیے گھنٹے کے نیچے بیٹھا رہا۔ اسی شام اس نے دکان سے باہر نکلتے استری والے کو روک کر اس سے کہا: "مہربانی کر کے یوسپ، مجھے بتاؤ اس نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟ یوسپ، تم کیوں لڑتے ہو؟ تمھارے پیچھے ایک بیمار بیوی اور لڑکا ہے۔" لیکن یوسپ نے، جو خود لباس فروش کے لیے لگاؤ محسوس کرتا تھا اور پولستانی ہوتے ہوئے بھی یہود دشمن نہیں تھا، اسے محض اپنے موٹے موٹے بازوؤں میں بھر لیا اور اگرچہ اسے اپنی پھسلتی ہوئی پتلون، جو اس کی حرکات میں رکاوٹ ڈال رہی تھی، بار بار سنبھالنی پڑتی تھی، وہ مارکس کو لپٹا کر بے لطف سا پولکا ناچنے لگا۔ پھر کھی کھی کرتے ہوئے اسے ایک طرف دھکیل کر اپنی بیسُر ترنگ میں ناچتا ہوا باہر نکل گیا۔

جب اگلی صبح ان دونوں نے وہی گھٹیا ہنگامہ پھر شروع کر دیا اور ایک گاہک کو فوراً بھگا دیا تو مارکس عقبی کمرے کی طرف لپکا۔ انھوں نے اپنی گالم گلوچ روک دی کہ دونوں تھک چکے تھے اور ان کے گلے بیٹھ گئے تھے۔ وہ مارکس کی بات سننے لگے جو گڑگڑاتے اور روتے ہوئے انہیں شرم دلا رہا تھا۔ لیکن جب مارکس نے مزید چیخنا چلّانا اپنے لیے نامناسب پا کر اسے ترک کیا اور پُرکشش مدھم لہجے میں نصیحت اور وعظ کرنے لگا تو وہ خاص طور پر متوجہ ہو گئے۔ وہ ایک دراز قد آدمی تھا اور بیمار ہونے کے باعث بالکل دُبلا۔ اس کے بدن پر جو تھوڑا بہت گوشت بچا تھا وہ ان کٹھن مہینوں میں مزید گُھل گیا تھا، اور اب اس کے بال سفید تھے جن کی وجہ سے، ان کے سامنے کھڑا ردو کد اور نصیحتیں کرتا ہوا، وہ شباہت میں اگر ولی نہیں تو کوئی بوڑھا راہب ضرور لگ رہا تھا اور اس کے دونوں کارکن اس کی تقریر بظاہر احترام اور دل چسپی سے سن رہے تھے۔

یہ خطبہ اس کے باپ کے بارے میں تھا، جو دیر ہوئی مرحوم ہو چکا تھا، اور اُن دنوں کی بات تھی جب وہ سب بچے تھے اور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں والے ایک پس ماندہ گاؤں میں رہتے تھے۔ ان کا مفلوک الحال کنبہ دس افراد پر مشتمل تھا جس میں دس لڑکے اور اپنی عمر سے کم جسامت کی ایک لڑکی تھی۔ آہ، وہ ناقابلِ یقین حد تک غریب تھے۔ ایک موقعے پر تو اسے چھال بلکہ گھاس تک چبانی پڑی تھی جس سے اس کا پیٹ پھول گیا تھا۔ لڑکے، بشمول اپنی بہن کے، بھوک کی شدّت سے اکثر ایک دوسرے کو بازوؤں پر کاٹ کھایا کرتے تھے۔

"سو میرا غریب باپ جس کی یہاں تک لمبی داڑھی تھی،" اس نے اپنے گھٹنے کو ہاتھ سے چھوا اور یوسپ کی آنکھوں میں فوراً آنسو بھر آئے، "میرے باپ نے کہا: بچو، ہم غریب ہیں، ہم جہاں کہیں بھی جائیں اجنبی ہی رہیں گے۔ کم سے کم ہمیں امن سے تو رہنا چاہیے، اگر نہیں تو---" لیکن وہ اپنی بات

پوری نہ کر سکا کیوں کہ استری والا لڑکھڑاتا ہوا اس بے پشت کرسی پر جا کر ڈھیر ہو گیا جہاں بیٹھ کر اپنے خط پڑھا کرتا تھا۔ اس نے سسکنا اور پھر چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا اور درزی کو، جو اپنے گلے سے عجیب کٹ کٹ کا شور پیدا کر رہا تھا، اپنا منہ پھیر لینا پڑا۔

"وعدہ کرو،" مارکس گڑگڑایا، "کہ اب تم کبھی نہیں لڑو گے۔"

یوسپ نے روتے ہوئے وعدہ کیا اور امیلیو نے بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ سنجیدگی سے سر ہلا دیا۔

مسرور لباس فروش نے اسے رفاقت پر محمول کیا اور دونوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر رخصت ہو گیا، لیکن ابھی وہ پوری طرح گیا بھی نہ تھا کہ اس کے عقب میں فضا ایک بار پھر ان دونوں کے غیظ سے آلودہ ہو گئی۔

چوبیس گھنٹے بعد اس نے ان دونوں کو الگ الگ احاطوں میں بٹھا دیا۔ ایک بڑھئی نے استری والے اور درزی کے کام کی جگہوں کو آدھا آدھا کرتے ہوئے ایک موٹی دیوار بنا دی، اور ایک بار تو ان کے درمیان حیران کن خاموشی چھا گئی۔ درحقیقت وہ پورے ایک ہفتے تک مطلقاً خاموش رہے۔ مارکس میں اگر اتنی توانائی ہوتی تو وہ خوشی سے اچھل پڑتا بلکہ ناچنے لگتا۔ تاہم اس نے دیکھا کہ استری والا کبھی کبھی کام روک کر نئے میں چکرایا ہوا سا نئے دروازے تک یہ دیکھنے آتا ہے کہ درزی ابھی تک موجود ہے یا نہیں، اور اگرچہ درزی بھی یہی کچھ کرتا تھا لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھی۔ اس کے بعد نہ تو امیلیو ویزو نے سرگوشی کی اور نہ یوسپ بروزاک نے بیئر کو ہاتھ لگایا۔ اور جب سمندر پار سے وہ فاقہ کش خط آتے تو وہ انہیں اپنے تاریک کمرے کی گندی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر پڑھنے کے لیے گھر لے جاتا اور رات کے وقت، وہاں بجلی ہونے کے باوجود، موم بتی کی روشنی میں پڑھنے کو ترجیح دیتا۔

ایک سوموار کی صبح جب اُس نے اپنی لہسن والی سلامی نکالنے کے لیے دراز کھولی تو اسے بیچ میں سے ٹوٹا ہوا پایا۔ وہ اپنا نوکیلا چاقو لیے ہوئے درزی کی طرف لپکا جو عین اس لمحے، کہ اس کا سیاہ ہیٹ کسی نے موڑ توڑ دیا تھا، جلتی ہوئی استری لیے اس کی طرف دوڑا آ رہا تھا۔ اُس نے استری والے کو کہنی سے پکڑا اور ٹھیک اس وقت جب یوسپ نے اس کی جانگھ پر وار کیا اور چاقو وہیں لٹکتا چھوڑ دیا، اس کی کلائی میں ایک بُو دیتا گلابی زخم کھول دیا۔

دہاڑتا، آہ و فغاں کرتا لباس فروش اندر دوڑا اور ان کے زخموں کے باوجود انہیں کھڑے کھڑے نکال دیا۔ جوں ہی وہ گیا، دونوں چیختے چلاتے ہوئے پھر ایک دوسرے سے گتھ گئے۔

مارکس، جس کا جی متلا رہا تھا اور ساری طاقت نچڑ چکی تھی، اپنے سوکھے ہوئے بازو خرمن چوب کی طرح ہلاتا، چلاتا ہوا پھر اندر لپکا۔ "نہیں نہیں، مہربانی کرو، مہربانی کرو۔" (اس شور و غوغا میں وہ جو کچھ سن سکا وہ گرجتے ہوئے گھنٹے کی آواز تھی۔) اس کا دل کسی نازک کوزے کی طرح بے توازن ہو کر طاق سے نیچے آ گرا اور سیڑھیوں پر سے لڑھکتا، فضا میں ہر سُو کرچیں بکھیرتا ہوا ٹوٹ گیا۔

حالاں کہ گرتے وقت ضعیف یہودی کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں مگر قاتل ان میں صاف پڑھ سکتے تھے:
میں نے تم سے کیا کہا تھا؟ دیکھا تم نے؟

**

(The Death of Me : انگریزی عنوان)

برنارڈ مالامڈ

انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی

اُدھار

اینٹوں کی بنی پُرانی اقامتی عمارتوں کی ٹیڑھی قطار والی وہ گلی اگرچہ کہیں دریا کے آس پاس تھی مگر ہر طرف سے گھری ہوئی اور تنگ تھی۔ کوئی بچہ اگر گیند کو سیدھا اوپر اُچھالتا تو زرد آسمان کا ایک ہی ٹکڑا دیکھتا۔ نکڑ پر اُس کانی لگی عمارت کے مقابل جہاں شلیگل دربان کے طور پر کام کرتا تھا، اُسی جیسی ایک اور عمارت تھی۔ کچھ فرق تھا تو بس یہ کہ بعد والی عمارت کے تہ خانے میں، جہاں پانچ پتھریلی سیڑھیاں اُتر کے جانا پڑتا تھا، گلی کی واحد دکان واقع تھی جس میں ایف پانیسا اور اس کی بیوی کھانے پینے کی چیزوں کا ایک چھوٹا سا تاریک اسٹور چلاتے تھے: یہ دکان حقیقتاً دیوار میں ایک گڑھے سے زیادہ نہ تھی۔

انھوں نے اپنی بچی کھچی پونجی سے اسے حال ہی میں خریدا ہے، مسز پانیسا نے دربان کی بیوی کو بتایا، تاکہ انھیں اپنی کسی بیٹی پر انحصار نہ کرنا پڑے جو دونوں کی دونوں، شلیگل کی بیوی کی سمجھ میں آیا، ایسے خودغرض مردوں سے بیاہی گئی تھیں جنھوں نے ان کے کردار کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ ان پر انحصار سے بالکل آزاد رہنے کے لیے پانیسا نے، جو ایک کارخانے کا سابق کارکن تھا، اپنے بچائے ہوئے تین ہزار نکلوائے اور یہ اسٹور خرید لیا۔ شلیگل کی بیوی نے چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے -- حالاں کہ وہ اس اسٹور کو، جب سے وہ اور ولی سڑک کے پار والی عمارت میں دربان تھے، اچھی طرح جانتی تھی -- جب یہ پوچھا: "تم نے اسی کو کیوں خریدا؟" تو پانیسا کی بیوی نے خوش دلی سے جواب دیا، اس لیے کہ یہ چھوٹی سی جگہ ہے اور انھیں یہاں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ پانیسا تریسٹھ سال کا ہے۔ وہ یہاں پیسا بنانے نہیں بلکہ زیادہ مشقت کیے بغیر اپنا پیٹ پالنے آئے ہیں۔ اس مسئلے پر کئی راتیں اور کئی دن سوچ بچار کرنے

کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ دکان انھیں کم سے کم روزی تو مہیا کر سکے گی۔ اس نے ایتا شلیگل کی تیکھی آنکھوں میں جھانکا اور ایتا نے کہا کہ ہاں، امید تو ہے۔
اُس نے وِلی کو سڑک کے پار نئے آنے والے جوڑے کے بارے میں بتایا جنھوں نے یہودی سے دکان خرید لی تھی اور کہا کہ، موقع ہو تو، وہ لوگ وہاں سے خریداری کیا کریں۔ اس سے مراد یہ تھی کہ وہ معمول کی خریداری تو سیلف سروس والی دکان ہی سے کرتے رہیں لیکن جب کوئی چیز خریدنا بھول جائیں تو پانیسا کی دکان سے لے لیا کریں۔ وِلی نے وہی کیا جو اسے کہا گیا تھا۔ وہ چوڑی پیٹھ والا طویل قامت شخص تھا۔ کوئلے اور راکھ نے، جسے وہ جاڑوں بھر بیلچے کی مدد سے ادھر سے اُدھر لاتا لے جاتا رہتا تھا، اس کے بھاری چہرے پر سیاہ نشان ڈال دیے تھے، اور اس کے بال راکھ دانوں میں سے اڑتی گرد سے -- جب وہ انھیں ٹرک میں لادے جانے کے لیے قطار میں رکھ رہا ہوتا تھا -- اکثر خاکستری نظر آتے تھے۔ وہ ہر وقت ڈانگری پہنے رہتا تھا -- اسے شکایت تھی کہ اس کا کام کبھی ختم ہی نہیں ہوتا -- اور جب بھی کسی چیز کی ضرورت پڑتی، سڑک پار کر کے تہہ خانے کی سیڑھیاں اتر جاتا اور پائپ سلگاتے ہوئے مسز پانیسا کے پاس کھڑا ہو کر باتیں کرنے لگتا، جب کہ مسٹر پانیسا، جو متلون مسکراہٹ والا پستہ قد کبڑا سا آدمی تھا، کاؤنٹر کے پیچھے اس انتظار میں رہتا کہ دیر تک باتیں بنانے کے بعد دربان کو یاد آئے گا اور وہ ایک آدھ ڈائم قیمت کی کسی چھوٹی موٹی چیز کے لیے کہے گا۔ یہ سودا نصف ڈالر سے زیادہ کا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ پھر ایک دن وِلی نے یہ قصہ چھیڑ دیا کہ کرایہ دار کس طرح اسے ہر وقت تنگ کرتے ہیں اور ظالم اور بخیل مالک مکان اس پانچ منزلہ بدبودار مکان میں اس کے لیے کیسے کیسے کام نکالتا رہتا ہے۔ وہ اپنے بیان میں محو تھا اور اس سے پہلے کہ اسے احساس ہوتا، اس نے تین ڈالر کا سودا بندھوا لیا حالاں کہ اس کے پاس صرف پچاس سینٹ تھے۔ وہ ایک ایسا کتا نظر آنے لگا جسے ابھی ابھی خوب مار پڑی ہو، لیکن مسٹر پانیسا نے، گلا صاف کرنے کے بعد، خوش مزاجی سے کہا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور بقایا رقم وہ جب چاہے دے سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ ہر چیز اُدھار پر چلتی ہے، کاروبار اور ہر دوسری چیز، کیوں کہ اُدھار آخر اس حقیقت کے سوا کیا ہے کہ لوگ انسان ہیں اور اگر کوئی واقعی انسان ہے تو وہ کسی کو ادھار دیتا ہے اور کوئی دوسرا اُسے دیتا ہے۔ وِلی اس بات پر حیران ہوا، کیوں کہ اس نے کسی دکان دار کو ایسی باتیں کرتے کبھی نہیں سنا تھا۔ ڈھائی ڈالر کی بقیہ رقم وِلی نے چند دن بعد ادا کر دی لیکن جب پانیسا نے کہا کہ وہ جب چاہے ادھار لے سکتا ہے تو اس نے اپنے پائپ کا اس زور سے کش لیا کہ اس سے شعلہ بلند ہوا، اور پھر وہ ہر قسم کی چیزیں خریدنے لگا۔

جب وہ سودا سلف سے بھرے دو بڑے بڑے تھیلے لے کر گھر پہنچا تو ایتا چلائی کہ ضرور اس کا دماغ چل گیا ہے۔ وِلی نے جواب دیا کہ اس نے ہر چیز کی قیمت لگائی ہے مگر نقد کچھ نہیں دیا۔
"لیکن کبھی نہ کبھی تو ہمیں ادائیگی کرنی ہو گی، کیوں؟" ایتا چلائی۔ "اور سیلف سروس والی دکان کی نسبت زیادہ قیمت دینی ہو گی۔" پھر اس نے وہی بات کہی جو وہ ہمیشہ کہتی تھی: "ہم غریب ہیں وِلی،

ہم بہت زیادہ خریداری نہیں کر سکتے۔"

گو وِلی نے اس کے جملوں میں چھپی سچائی کو محسوس کر لیا تھا، مگر اس کے بُرا بھلا کہنے کے باوجود سڑک کے پار جا جا کر اُدھار چیزیں لیتا رہا۔ ایک بار اس کی جیب میں دس ڈالر کا مڑا تڑا نوٹ تھا اور سودے کی رقم چار ڈالر سے بھی کم تھی، مگر اس نے ادائیگی کی کوشش نہیں کی اور پانیسا کو اپنی کتاب میں رقم درج کرنے دی۔ ایتا جانتی تھی کہ اس کے پاس پیسے ہیں، اس لیے جب اس نے ادھار خریداری کا اقرار کیا تو وہ چیخ اٹھی۔

"تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ جب تمہارے پاس پیسے ہیں تو دے کیوں نہیں دیتے؟"

اس نے جواب نہیں دیا مگر تھوڑی دیر بعد بولا کہ اسے کبھی کبھی دوسری چیزیں بھی خریدنی پڑتی ہیں۔ وہ بھٹی والے کمرے میں گیا اور ایک لپٹے ہوئے پیکٹ کے ساتھ باہر آیا۔ اس نے پیکٹ کھولا جس میں موتیوں والا ایک سیاہ لباس تھا۔

ایتا لباس کو دیکھ کر پیٹنے لگی۔ اس نے کہا کہ وہ اسے کبھی نہیں پہنے گی کیوں کہ وہ اس کے لیے کوئی چیز تبھی خریدتا ہے جب اس نے کوئی غلط کام کیا ہو۔ اس کے بعد سے اس نے سودا سلف کی تمام خریداری وِلی پر چھوڑ دی اور جب وہ اُدھار سامان لے کر آتا تو وہ کچھ نہیں بولتی تھی۔

وِلی پانیسا کے ہاں سے خریداری کرتا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ میاں بیوی اسی کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے۔ وہ دکان کی اوپر والی منزل کے تین چھوٹے کمروں میں رہتے تھے اور جب مسز پانیسا اپنی کھڑکی میں سے اسے آتا دیکھتی تو فوراً دوڑ کر نیچے دکان میں پہنچ جاتی۔ وِلی اپنے تہہ خانے میں سے نکل کر اوپر آتا، سڑک پار کرتا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے اسٹور میں چلا آتا۔ دروازہ کھولتے ہوئے اس کا دراز قد کچھ اَور دراز لگتا۔ وہ جب بھی سودا لیتا تو دو ڈالر سے کم رقم کبھی نہیں بنتی تھی، اور کبھی کبھی تو پانچ ڈالر تک پہنچ جاتی تھی۔ جب پانیسا ہر چیز شمار کر کے اس کا حساب ایک داغ دار پنسل سے اپنی کھلے ورقوں والی کاپی میں لکھ لیتا تو مسز پانیسا سارا سودا ایک دوہرے بڑے تھیلے میں ڈال دیتی۔ وِلی جب بھی اندر آتا، پانیسا اپنی کاپی کھولتا اور اپنی انگلی کی پور گیلی کر کے بہت سارے ورق اُلٹ کر کاپی کے وسط میں وِلی کے کھاتے پر پہنچ جاتا۔ جب سودا باندھ کر تھیلے میں ڈال دیا جاتا تو پانیسا ہر ہندسے کو پنسل سے چھوتے اور اپنے آپ سے سرگوشی کرتے ہوئے رقم جوڑنا شروع کرتا۔ مسز پانیسا کی طائرانہ نظریں اعداد و شمار کا تعاقب کرتی رہتیں یہاں تک کہ پانیسا نیا حاصل جمع لکھ لیتا اور اس نئی رقم کے نیچے۔۔ نظر اٹھا کر یہ یقین کرنے کے بعد کہ وِلی دیکھ رہا ہے۔۔ دو بار لکیر لگاتا اور پھر کاپی بند کر دیتا۔ جب تک کاپی کاؤنٹر کے نیچے نہ رکھ دی جاتی، وِلی، جس کے ہونٹوں میں اَن جلا پائپ لٹک رہا ہوتا، اپنی جگہ سے نہ ہلتا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوتا اور لفافوں کو بازوؤں میں تھامتے ہوئے، جنھیں سڑک کے پہنچانے میں مدد دینے کی وہ میاں بیوی ہر بار پیش کش کرتے اور وہ ہر بار رد کر دیتا، دکان سے باہر نکل جاتا۔

ایک دن جب کل رقم تراسی ڈالر اور کچھ سینٹ ہو گئی تو پانیسا نے سر اٹھا کر وِلی سے پوچھا کہ وہ حساب میں کچھ ادائیگی کب تک کر سکتا ہے۔ وِلی نے اگلے ہی دن سے پانیسا کے ہاں سے خریداری کرنی چھوڑ دی، اور پھر ایتا دوبارہ اپنا ڈوریوں والا تھیلا اٹھائے سیلف سروس والی دکان سے سودا سلف لینے جانے لگی۔ دونوں میں سے کوئی، پاؤنڈ بھر آلو بخارے یا نمک کے ڈبے کے لیے بھی، جو وہ خریدنا بھول جاتے، سڑک کے پار نہیں جاتا تھا۔

ایتا جب سیلف سروس سے خریداری کر کے لوٹتی تو پانیسا کی دکان سے امکان بھر دور رہنے کے لیے سڑک کی اپنی طرف والی دیوار سے لگی ہوئی چلتی۔

بعدازاں اس نے وِلی سے پوچھا کہ کیا اس نے انھیں کچھ ادائیگی کی ہے۔

اس نے جواب دیا: نہیں۔

"کب کرو گے؟"

اس نے کہا وہ نہیں کہہ سکتا۔

ایک مہینا گزر گیا۔ پھر نکڑ کے پاس ایتا کا مسز پانیسا سے سامنا ہو گیا اور اگرچہ مسز پانیسا نے، جو ناخوش لگ رہی تھی، ادائیگی کے بارے میں کچھ نہیں کہا، مگر ایتا نے گھر آ کر وِلی کو یاددہانی کرائی۔

"مجھے پریشان مت کرو،" وہ بولا۔ "میری اپنی مشکل ہی بہت ہے۔"

"کیا مشکل ہے تمھیں، وِلی؟"

"یہ بدبخت کرایہ دار اور وہ بدبخت مالک مکان،" وہ چلّایا، اور زور سے دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

جب وہ لوٹا تو کہنے لگا: "میرے پاس ہے ہی کیا جو میں ادائیگی کروں۔ کیا میں اپنی زندگی کے ہر دن غریب نہیں ہوتا؟"

ایتا میز پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے بازو نیچے کیے اور ان پر سر رکھتے ہوئے رو پڑی۔

"کس چیز سے ادائیگی کروں؟" وہ چیخ کر بولا۔ اس کا چہرہ تاریکی سے روشن ہو اٹھا اور اس پر جالے سے تن گئے۔ "اپنی ہڈیوں کے گوشت سے؟ اپنی آنکھوں میں اڑتی ہوئی راکھ سے؟ اس پیشاب سے جو میں فرش پر سے صاف کرتا ہوں؟ اپنے پھیپھڑوں کی اس ٹھنڈ سے جس کے ساتھ میں سوتا ہوں؟"

اس نے پانیسا اور اس کی بیوی کے لیے شدید نفرت محسوس کی اور کبھی ادائیگی نہ کرنے کا عہد کیا، کیوں کہ وہ ان سے نفرت کرتا تھا، خاص طور پر اس کبڑے سے جو کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھتا تھا۔ اگر وہ کبھی اپنی ان ذلیل آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو وہ اسے فرش سے اٹھا کر اس کی ٹیڑھی میڑھی ہڈیاں چٹخا دے گا۔

اُس رات وہ باہر گیا اور پی کر مدہوش ہو گیا اور صبح تک نالے میں پڑا رہا۔ گندے کپڑوں اور خون جیسی سُرخ آنکھوں کے ساتھ جب وہ لوٹا تو ایتا نے اپنے چار سالہ بچے کی تصویر، جو خناق میں مبتلا ہو کر مرا

تھا، اس کے آگے کر دی۔ ولی نے موٹے موٹے آنسو بہاتے ہوئے قسم کھائی کہ آئندہ ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکے گا۔

ہر صبح جب وہ راکھ دان قطار میں لگانے جاتا تو نظر بھر کر سڑک کے اُس پار نہیں دیکھتا تھا۔

''اور دو اُدھار، '' وہ طنزیہ نقل اتارتا۔ ''اور دو اُدھار!''

پھر کٹھن زمانہ آ گیا۔ مالک مکان نے حرارت میں کٹوتی کر دی، گرم پانی میں کٹوتی کر دی۔ اس نے ولی کے اخراجات کی رقم اور تنخواہ میں بھی کٹوتی کر دی۔ کرایہ دار مشتعل ہو گئے۔ وہ مکھیوں کے جھنڈ کی طرح دن بھر ولی کو تنگ کرتے اور ولی انھیں بتاتا کہ مالک مکان نے کیا حکم دیا ہے۔ انھوں نے محکمۂ صحت والوں کو فون کیا لیکن جب انسپکٹر آئے تو انھوں نے کہا کہ عمارت اگرچہ ہوا کی زد پر ہے مگر درجۂ حرارت کم سے کم قانونی حد کے اندر ہے۔ تاہم کرایہ دار ٹھنڈ کی شکایت پھر بھی کرتے رہے۔ وہ اس بارے میں ولی کو دن بھر پریشان کرتے اور وہ کہتا کہ ٹھنڈ اُسے بھی لگتی ہے؛ اس کا کہنا تھا کہ وہ منجمد ہو رہا ہے لیکن اس کی بات پر کوئی یقین نہیں کرتا تھا۔

ایک دن صفائی والے ٹرک میں لادے جانے کے لیے چار راکھ دان قطار میں رکھنے کے بعد اس نے نظر اٹھائی تو مسٹر اور مسز پانیسا کو دکان میں سے اپنی طرف دیکھتے پایا۔ وہ سامنے والے شیشے کے دروازے میں سے اس پر ٹکٹکی باندھے ہوئے تھے؛ جب اس نے انھیں دیکھا تو پہلے اس کی آنکھیں دھندلا گئیں اور پھر وہ دونوں اسے ڈھیلے پروں والے دبلے پتلے پرندوں کی طرح لگے۔

وہ گلی میں ایک دوسرے دربان سے پانا لینے گیا اور جب واپس آیا تو انھیں وہیں دیکھ کر اسے لکڑی کے فرش سے پھوٹتی ہوئی بے برگ و بار جھاڑیوں کی یاد آئی۔ وہ جھاڑیوں میں سے خالی طاقوں تک دیکھ سکتا تھا۔

موسمِ بہار میں جب گھاس کے انکھوے پیادہ رووں کی درزوں میں سے سر اٹھا رہے تھے، اس نے ایتا کو بتایا: ''میں صرف اس وقت کا منتظر ہوں جب پوری ادائیگی کر سکوں۔''

''کیسے، ولی؟''

''ہم پیسے جمع کر سکتے ہیں۔''

''کیسے؟''

''ہم مہینے میں کتنا بچاتے ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''تم نے کتنا چھپا رکھا ہے؟''

''اب تو کچھ بھی نہیں۔''

''میں تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کر دوں گا۔ یسوع کی قسم، میں ادا کر دوں گا۔''

مشکل یہ تھی کہ کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں سے انھیں پیسا مل سکتا۔ بعض اوقات جب وہ پیسا حاصل

Scanned with CamScanner

کرنے کے مختلف طریقوں کے بارے میں سوچتا تو اس کا خیال آگے آگے دوڑتا اور وہ دیکھنے لگتا کہ ادائیگی کرتے ہوئے کیسا لگے گا۔ وہ نوٹوں کی گڈی کو ربڑ کی ایک چوڑی پٹی میں لپیٹ کر سیڑھیاں چڑھے گا اور سڑک پار کرکے، پانچ سیڑھیاں اُتر کر دکان میں جائے گا؛ وہ پانیسا سے کہے گا: "یہ رہی رقم، بڑے میاں، اور میں شرط لگاتا ہوں، تم نہیں سمجھتے تھے کہ میں ادائیگی کروں گا، اور میرا خیال نہیں کہ کوئی اور بھی ایسا سمجھتا ہو، بعض اوقات تو میں خود بھی سمجھتا تھا۔ لیکن یہ رہے ربڑ کی پٹی میں بندھے نوٹ، تمھاری رقم۔" اس نے گڈی ہاتھ میں اٹھا کر تھوڑی دیر تولنے کے بعد کاؤنٹر کے وسط میں اس طرح رکھی گویا بساط پر چال چلنے جا رہا ہو۔ کبڑے آدمی اور اس کی بیوی، دونوں نے ایک ایک گندے نوٹ پر خوشی اور انبساط کی چیخیں مارتے ہوئے رقم کو گنا۔ وہ حیران تھے کہ اتنے سارے نوٹ اتنی چھوٹی سی گڈی میں سما کیسے گئے۔

یہ وہ خواب تھا جو ولی دیکھا کرتا تھا، لیکن اس خواب کی تعبیر وہ کبھی نہ پا سکا۔

مگر وہ اس خواب کو سچا کرنے کے لیے محنت کرتا تھا۔ وہ جلدی بیدار ہوتا اور تہہ خانے سے چھت تک کی سیڑھیاں صابن اور ایک سخت برش سے رگڑتا، پھر ان پر گیلا پوچا لگاتا یہاں تک کہ وہ پُرپیچ و خم راستے میں نیچے تک چمکنے لگتیں۔ وہ راہداری میں لگے ڈاک کے ڈبوں کو دھاتی پالش اور نرم چیتھڑے سے رگڑتا یہاں تک کہ وہ ایسے ہو جاتے کہ آدمی ان میں اپنا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ ان میں اپنا بھاری چہرہ حال ہی میں رکھی حیران کن بھوری مونچھوں اور اس زرد فیلٹ کی ٹوپی کے ساتھ دیکھتا جو ایک کرایہ دار جاتے ہوئے کاٹھ کباڑ سے بھری الماری میں چھوڑ گیا تھا۔ ایتا اس کی مدد کرتی اور وہ پورے تہہ خانے اور تاریک احاطے کی صفائی کرتے جہاں کپڑے سکھانے کی ڈوریاں ایک دوسرے کو قطع کرتی بندھی ہوئی تھیں۔ وہ سِنک یا پاخانے کی مرمّت کی ہر قسم کی درخواست، چاہے وہ ناپسندیدہ کرایہ داروں ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو، تیزی سے نمٹاتے۔ وہ ہر روز کام کرتے کرتے تھکن سے چُور ہو جاتے لیکن، جیسا کہ وہ شروع ہی سے جانتے تھے، زائد آمدنی ناپید رہی۔

ایک صبح، جب ولی ڈاک کے ڈبوں کو چمکا رہا تھا، اسے اپنے ڈبّے میں ایک خط ملا جو اسی کے نام تھا۔ اس نے ٹوپی اتار کر لفافہ کھولا اور کاغذ کو روشنی کی جانب کرکے کانپتی ہوئی تحریر پڑھنے لگا۔ خط مسز پانیسا کا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس کا شوہر بیمار ہے اور گھر میں پیسے نہیں ہیں، اس لیے کیا وہ فی الحال صرف دس ڈالر دے سکتا ہے، باقی رقم بعد میں آتی رہے گی۔

اس نے خط پھاڑ دیا اور دن بھر تہہ خانے میں چھپا رہا۔ اس شب ایتا نے، جو اسے گلیوں میں تلاش کرتی رہی تھی، اسے بھٹی کے پیچھے پائپوں کے درمیان پایا۔ اس نے پوچھا کہ وہ وہاں کیا کر رہا ہے۔

ولی نے خط کے بارے میں بتایا۔

"چھپنے سے تمھارا مسئلہ کبھی حل نہیں ہوگا،" وہ مایوسی سے بولی۔

"پھر کیا کرنا چاہیے مجھے؟"

"میرے خیال میں سو جانا چاہیے۔"

Scanned with CamScanner

وہ سو گیا، لیکن اگلی صبح ہڑبڑا کر بستر سے نکلا، بدن پر ڈانگری چڑھائی اور کندھوں پر اوور کوٹ ڈالتا ہوا گھر سے باہر دوڑ گیا۔ نکڑ کے پاس اسے ایک گروی والی دکان مل گئی جہاں کوٹ کے عوض اسے دس ڈالر مل گئے۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔

لیکن جب وہ دوڑتا ہوا واپس آیا تو اس نے سڑک کے پار ایک میت گاڑی یا ایسی ہی کوئی چیز دیکھی۔ سیاہ لباس میں دو افراد چیڑ کا چھوٹا اور تنگ تابوت مکان میں سے باہر لا رہے تھے۔

"کون فوت ہو گیا ہے؟ کوئی بچہ؟" اس نے ایک کرایہ دار سے پوچھا۔

"نہیں، مسٹر پانیسا نامی ایک آدمی گزر گیا ہے۔"

ولی گنگ ہو گیا۔ اس کا گلا ہڈی میں تبدیل ہو چکا تھا۔

جب چیڑ کا تابوت راہداری کے دروازوں میں سے پھنس پھنسا کر نکل چکا تو مسز پانیسا جو سراپا الم تھی، تنہا باہر آئی۔ ولی نے اپنا چہرہ پھیر لیا، حالاں کہ اس کا خیال تھا کہ اس کی نئی مونچھوں اور زرد ٹوپی کی وجہ سے وہ اسے پہچان نہیں سکے گی۔

"موت کیسے ہوئی؟" اس نے کرایہ دار سے سرگوشی کی۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

لیکن تابوت کے عقب میں چلتی ہوئی مسز پانیسا نے سن لیا تھا۔

"بڑھاپے سے،" اس نے پلٹ کر تیکھی آواز میں جواب دیا۔

ولی نے دل دہی کی کوئی بات کہنے کی کوشش کی، مگر اس کے منہ میں زبان یوں لٹکی ہوئی تھی جیسے کسی درخت پر مردہ پھل، اور اس کا دل ایک تختہ بند سیاہ کھڑکی کے مانند تھا۔

مسز پانیسا پہلے ایک سنگ چہرہ بیٹی کے ساتھ، اور پھر دوسری کے ساتھ رہنے چلی گئی۔ اور ادھار کبھی ادا نہیں ہوا۔

**

(انگریزی عنوان : The Bill)

Scanned with CamScanner

برنارڈ مالامڈ

انگریزی سے ترجمہ : راشد مفتی

زندگی غنیمت ہے

ایتا کو لگ رہا تھا کہ وہ آدمی اسے گئے سال کے اسی دن سے یاد ہے۔ کبھی کبھار مڑ کر ارد گرد نظر ڈالتا ہوا وہ ایک پاس کی قبر کے سرہانے کھڑا تھا، جب کہ ایتا، ہاتھ میں تسبیح لیے، اپنے شوہر ارماندو کے ابدی سکون کے لیے دعا کر رہی تھی۔ بعض اوقات وہ یہ دعا کرتی کہ اس کا شوہر کروٹ بدلے اور اسے بھی اپنے پہلو میں لیٹ جانے دے۔ نومبر کا دوسرا دن تھا اور کامپو ویرانو کے قبرستان میں یومِ ارواح منایا جا رہا تھا۔ وہ زرد پھولوں کا دستہ قبر پر رکھ چکی تو پھوار پڑنے لگی۔ ارماندو کو یہ قبر کبھی نصیب نہ ہوتی اگر اس کا ایک فیاض چچا، جو پیرو گیا میں ڈاکٹر تھا، مہربان نہ ہوتا۔ ایتا نہیں جانتی تھی کہ اگر یہ چچا نہ ہوتا تو ارماندو کہاں دفن ہوتا: بلاشبہ اس سے کہیں کم پُرکشش قبر میں، اگر وہ اُس کی جلائے جانے کی خواہش کی، جس کا اظہار وہ اکثر کیا کرتا تھا، مزاحمت کرتی۔

ایتا بہت معمولی اُجرت کے عوض ایک لباس فروش کے ہاں کام کرتی تھی، اور ارماندو نے اپنے پیچھے پیسے کی کوئی رقم نہیں چھوڑی تھی۔ نومبر کی مغموم فضا میں گھاس پر دمکتے ہوئے بڑے بڑے روشن پھولوں کے نظارے سے اس کا دل بھر آیا اور آنسو بہنے لگے۔ ہر چند کہ اس طرح رونے سے وہ بخار کی سی بے آرام کیفیت محسوس کرنے لگتی تھی مگر پھر بھی خوش تھی کیوں کہ رونا ہی وہ واحد عمل تھا جو اسے سکون بخشتا تھا۔ وہ تیس برس کی تھی اور مکمل ماتمی لباس پہنے تھی۔ اس کا بدن دُبلا تھا، بھُوری نم آنکھوں کے کنارے سُرخ تھے اور ان کے گرد سیاہی مائل حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اس کی جلد زرد اور خدوخال نازک تھے۔ ارماندو کی حادثاتی موت کے بعد سے، جس کو اب سال سے چند ماہ اوپر ہو گئے تھے، وہ تقریباً ہر روز، روم کی

طویل سہ پہر کے دوران، اس کی قبر پر دعا مانگنے آتی تھی۔ وہ اندر سے منتشر اور اس کی یاد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہفتے میں دو بار وہ اعتراف کے لیے جاتی اور ہر اتوار کو عشائے ربانی میں شرکت کرتی۔ وہ لامیدونا ایدولوراتا میں ارماندو کے لیے شمعیں جلاتی اور مہینے میں ایک بار اور جب کبھی تھوڑے زیادہ پیسے ہوتے تو کئی بار، عبادت کراتی۔ جب وہ اپنے سرد فلیٹ میں لوٹتی، جہاں وہ اب تک رہتی تھی اور اس لیے خالی نہیں کر سکتی تھی کہ یہ کبھی اُس کا بھی تھا، تو ارماندو کے بارے میں سوچا کرتی۔ اور اس کے ذہن میں ارماندو کی جو تصویر آتی وہ اس کی موت کے وقت کی نہیں بلکہ دس برس پہلے کی ہوتی۔ وہ ہمیشہ دم گھونٹ دینے والی بھوک محسوس کرتی اور بہت کم کھاتی تھی۔

اس نے اپنی تسبیح ختم کی تو بارش خاموشی سے ہو رہی تھی۔ اس نے تسبیح اپنے پرس میں رکھی اور ایک سیاہ چھتری کھول لی۔ دوسری قبر کے پاس کھڑا آدمی، جو گہرا سبز ہیٹ اور چست سیاہ اوور کوٹ پہنے تھا، اس سے چند قدم پیچھے ٹھہر گیا تھا اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی آڑ کیے سگریٹ جلا رہا تھا۔ ایتا کو قبر کے پاس سے ہٹتے دیکھ کر اس نے اپنا ہیٹ چھوا۔ وہ چھوٹے قد کا سیاہ چشم آدمی تھا اور اس کی مونچھیں اتنی ہلکی تھیں کہ مشکل ہی سے نظر آتی تھیں۔ اس کے کان بہت موٹے تھے، تاہم وہ خوش شکل تھا۔

"آپ کے شوہر؟" اس نے منہ سے دھواں نکالتے اور سگریٹ کو بھیگنے سے بچانے کے لیے اپنی ہتھیلی کی آڑ میں رکھتے ہوئے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔

ایتا نے اثبات میں جواب دیا۔

اس نے اُس قبر کی طرف سر سے اشارہ کیا جہاں وہ کھڑا رہا تھا۔ "میری بیوی۔ ایک دن جب میں کام پر تھا، وہ اپنے عاشق سے ملنے کی جلدی میں پیازا بولونیا میں ایک ٹیکسی سے کچل کر مر گئی۔" وہ تلخی یا کسی اور ظاہری جذبے کے بغیر بول رہا تھا لیکن اس کی نظریں مضطرب تھیں۔

ایتا نے دیکھا کہ اس نے اپنے کوٹ کا کالر چڑھا لیا ہے اور وہ بھیگ رہا ہے۔ اس نے جھجکتے ہوئے اُسے بس اسٹاپ تک اپنی چھتری کے نیچے آنے کی پیش کش کی۔

"سیزارے موتالدو،" اس نے منہ ہی منہ میں تعارف کرایا اور گمبھیرتا سے قبول کرتے ہوئے اسے اتنا بلند کر لیا کہ دونوں کے لیے کافی ہو جائے۔

"ایتا اولیوا۔" اونچی ایڑی کے جوتوں میں وہ اس سے کم و بیش نصف ہاتھ اونچی تھی۔

وہ قبرستان کے پھاٹک کی طرف جانے والی سڑک پر آہستہ آہستہ چلنے لگے جس کے دونوں طرف نم آلود سرو ایستادہ تھے۔ ایتا نے اس سے یہ بات مخفی رکھی کہ وہ اس کی کہانی سے اس قدر متاثر ہوئی ہے کہ ہمدردی کا ایک جملہ بھی نہیں کہہ سکتی۔

"ماتم گساری بڑا جان لیوا کام ہے،" سیزارے بولا۔ "لوگ یہ بات جانتے تو کم موتیں ہوتیں۔" وہ آہ بھرتے ہوئے ذرا سا مسکرائی۔

بس اسٹاپ پر سڑک کے اُس پار ایک شراب خانہ تھا جہاں سائبان کے نیچے میزیں پڑی تھیں۔ سیزارے نے کافی یا آئس کریم کی تجویز پیش کی۔

ایتا نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ انکار کرنے ہی والی تھی کہ سیزارے کے اداس تاثر نے اس کا خیال بدل دیا اور وہ اس کے ساتھ سڑک کے پار چلی گئی۔ اس نے آہستگی سے ایتا کی کہنی پکڑتے ہوئے اس کی رہنمائی کی اور دوسرے ہاتھ سے مضبوطی کے ساتھ دونوں پر چھتری تانے رہا۔ ایتا نے کہا کہ اسے ٹھنڈ لگ رہی ہے اور وہ اندر چلے گئے۔

اس نے اپنے لیے ایسپریسو کافی منگوائی مگر ایتا نے ایک پیسٹری پر اکتفا کیا جسے وہ نزاکت کے ساتھ کانٹے سے کھاتی رہی۔ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے وہ اپنے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اس کی آواز دھیمی تھی اور اسے بولنے کا ڈھب آتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ غیر ملازم صحافی ہے۔ اس سے پہلے وہ ایک سرکاری دفتر میں کام کرتا تھا لیکن کام اکتا دینے والا تھا، سو اس نے بددل ہو کر اسے خیرباد کہہ دیا حالاں کہ وہ ڈائرکٹر کے عہدے پر ترقی پانے والا تھا۔ "میں اکتاہٹ ہی کی ڈائرکٹری کرتا۔" اب وہ امریکا جانے کے خیال سے کھیل رہا تھا۔ بوسٹن میں اس کا ایک بھائی تھا جو چاہتا تھا کہ وہ چند ماہ آ کر وہاں رہے اور پھر فیصلہ کرے کہ آیا مستقل طور پر ترکِ وطن کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔ بھائی کا خیال تھا کہ سیزارے کے کناڈا کے راستے وہاں پہنچنے کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ اس نے اس بارے میں سوچا تھا مگر ایک طرح کی زندگی سے، دوسری طرح کی زندگی کی خاطر، ناتا توڑنے پر خود کو آمادہ نہ کر پایا تھا۔ اسے یہ بھی لگا تھا کہ وہ دل چاہنے پر اپنی بیوی کی قبر پر نہ جا سکنے کو بہت محسوس کرے گا۔ "آپ جانتی ہیں، جس سے محبت رہی ہو،" اس نے کہا، "اس کے بارے میں کیسا محسوس ہوتا ہے۔"

ایتا نے پرس میں سے اپنا رومال ٹٹول کر نکالا اور اس سے اپنی آنکھوں کو چھوا۔

"اور آپ؟" سیزارے نے ہمدردی سے پوچھا۔

ایتا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے خود کو اپنی کہانی سناتے ہوئے پایا۔ گو اس نے ادریوں کے سامنے اکثر اسے دُہرایا تھا مگر کسی اَور کو کبھی نہیں سنائی تھی، یہاں تک کہ کسی دوست کو بھی نہیں۔ اب وہ یہ کہانی ایک اجنبی کو سنا رہی تھی، کیوں کہ وہ ایسا آدمی نظر آتا تھا جو اسے سمجھ لے گا۔ اور اگر بعد میں اسے پچھتاوا بھی ہوا تو اس سے کیا فرق پڑے گا، وہ تو جا چکا ہو گا۔

ایتا نے اعتراف کیا کہ اس نے اپنے شوہر کو مرنے کی بددعا دی تھی۔ سیزارے نے اپنی کافی کی پیالی رکھ دی اور اس کے بولنے کے دوران ہونٹوں میں سگریٹ دبائے، کش لیے بغیر، بیٹھا رہا۔

ایتا نے بتایا کہ ارماندو کو اپنی ایک عم زاد سے محبت ہو گئی تھی جو نوکری کے لیے گرمیوں میں پیروگیا سے روم آئی ہوئی تھی۔ اُس کے باپ نے تجویز کیا تھا کہ وہ ان کے گھر ٹھہرے، اور ارماندو اور ایتا نے آپس میں مشورہ کرنے کے بعد طے کیا تھا کہ اسے کچھ عرصے کے لیے اپنے ہاں رکھ لیں۔ اس سے ملنے والا کرایہ جمع کر کے وہ ایک پرانا ٹی وی خرید لیں گے تاکہ "لاشیا اور رادوپیا" نامی کو ئز پروگرام دیکھ سکیں جو

ہر جمعرات کی شب روم کا ہر شخص دیکھتا ہے، اور یوں ناپسندیدہ پڑوسیوں کی دعوت کے انتظار اور اسے قبول کرنے کی خفت سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔ سو عم زاد، جس کا نام لورا آنسالدو تھا، آ گئی۔ وہ گھنے بھورے بالوں اور بڑی بڑی آنکھوں والی چوڑے باڑ کی اٹھارہ سالہ خوب صورت لڑکی تھی۔ وہ بیٹھک میں سوفے پر سوتی تھی، عادات و اطوار کی اچھی تھی اور کھانے سے پہلے اور بعد میں باورچی خانے کے کام میں ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ ایتا اُسے پسند کرتی تھی تاوقتے کہ اس نے دیکھا کہ ارماندو لڑکی پر لٹو ہو گیا ہے۔ پھر اس نے لورا سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی مگر ارماندو نے دھمکی دی کہ اگر اس نے لورا کو پریشان کیا تو وہ گھر سے چلا جائے گا۔ ایک دن ایتا کام سے گھر لوٹی تو اس نے ان دونوں کو اپنی شادی کی مسہری پر برہنہ پایا۔ وہ چیخی چلائی اور روئی۔ اس نے لورا کو عفونت زدہ رنڈی کہا اور قسم کھائی کہ اگر وہ اسی لمحے گھر سے نہ نکلی تو وہ اسے ہلاک کر دے گی۔ ارماندو پشیمان تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ لڑکی کو واپس پیروگیا بھیج دے گا اور اس نے اگلے روز قریبی اسٹیشن جا کر لڑکی کو ٹرین میں سوار بھی کرا دیا۔ لیکن لڑکی کی جدائی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ اسے اختلاج ہونے لگا اور اس کی حالت قابلِ رحم ہو گئی۔ ایک سنیچر کی رات ارماندو خود اعتراف کرنے گیا اور دس سال میں پہلی بار عشائے ربانی لیا، لیکن پُرسکون ہونے کے بجائے وہ لڑکی کو پہلے سے بھی زیادہ شدت سے چاہنے لگا۔ ایک ہفتے بعد اس نے ایتا کو بتایا کہ وہ اپنی عم زاد سے ملنے اور اسے واپس روم لانے جا رہا ہے۔

"اگر تم اس رنڈی کو یہاں لائے،" ایتا چلائی، "تو میں مسیح سے دعا کروں گی کہ تم یہاں پہنچنے سے پہلے ہی مر جاؤ۔"

"یہ بات ہے،" ارماندو نے کہا، "تو دعا کرنا شروع کر دو۔"

وہ گھر سے نکلا تو ایتا گھٹنوں کے بل کھڑی ہو کر اس کی موت کی دعا کرنے لگی۔

اس رات ارماندو ایک دوست کے ساتھ لورا کو لینے گیا۔ دوست کے پاس ایک ٹرک تھا اور وہ اسیسی جا رہا تھا۔ واپسی پر اسے ان دونوں کو پیروگیا سے لیتے ہوئے روم آنا تھا۔ وہ روانہ ہوئے تو ابھی جھٹ پٹا تھا لیکن جلد ہی اندھیرا ہو گیا۔ کچھ دیر ارماندو نے ٹرک چلایا، پھر اسے نیند آنے لگی اور وہ رینگ کر ٹرک کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ ستمبر کے ایک گرم دن کے خاتمے پر پیروگیا کی پہاڑیاں کُہر آلود تھیں۔ ٹرک سڑک پر گری ایک چٹان سے زوردار دھچکے کے ساتھ ٹکرا گیا۔ ارماندو، جو گہری نیند میں تھا، ٹرک کے کھلے ہوئے عقبی دروازے سے لڑھکتا ہوا باہر جا گرا۔ وہ شانوں اور سر کے بل سڑک پر گرا اور پہاڑی پر سے لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ لڑھکتے لڑھکتے نیچے پہنچنے سے پہلے ہی وہ مر چکا تھا۔ ایتا نے جب یہ خبر سنی تو اسے غش آ گیا اور وہ پورے دو دن تک بول نہیں سکی۔ اس کے بعد اس نے خود اپنی موت کی دعا مانگی تھی اور اکثر مانگا کرتی تھی۔

ایتا نے اپنی پیٹھ دوسری میزوں کی طرف پھیر لی، حالاں کہ وہ خالی تھیں، اور کھلے بندوں، خاموشی سے رونے لگی۔

Scanned with CamScanner

تھوڑی دیر بعد سیزارے نے اپنے سگریٹ کا سِرا مسل دیا۔ "دھیرج، سنیورا۔ اگر خدا تمہارے شوہر کو زندہ رکھنا چاہتا تو وہ اب تک جی رہا ہوتا۔ دعاؤں کا صورتِ حال سے بہت کم تعلق ہوتا ہے۔ میری سوچ کے لحاظ سے یہ تمام واقعہ محض اتفاق سے زیادہ نہیں ہے۔ مذہب سے بہت زیادہ تعلق نہ رکھنا ہی بہتر ہوتا ہے، ورنہ مذہب خاصا تکلیف دہ بن جاتا ہے۔"

"دعا تو دعا ہوتی ہے،" وہ بولی۔ "میں اپنی دعا کی وجہ سے مصیبت جھیل رہی ہوں۔"

سیزارے نے اپنے ہونٹ دبائے۔ "لیکن ان معاملات پر کون حکم لگا سکتا ہے؟ یہ ہم میں سے اکثر کی سمجھ کی نسبت زیادہ پیچیدہ ہیں۔ میں نے اپنی بیوی کے سلسلے میں اس کے مرنے کی دعا نہیں مانگی تھی، لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں ایسا کر سکتا تھا۔ کیا میں تم سے بہتر صورتِ حال میں ہوں؟"

"میری دعا گناہ تھی۔ تمہارے ذہن پر ایسا کوئی بوجھ نہیں ہے۔ یہ اس سے کہیں بدتر ہے جو تم نے تصوّر کیا ہوگا۔"

"یہ صرف ایک تکنیکی معاملہ ہے، سنیورا۔"

"اگر ارماندو زندہ رہتا،" وہ ایک لمحے بعد بولی، "تو اگلے ماہ انتیس سال کا ہو جاتا۔ میں ایک سال بڑی ہوں۔ لیکن اب میری زندگی لاحاصل ہے۔ میں اس سے جا ملنے کا انتظار کر رہی ہوں۔"

وہ اپنا سر ہلاتے ہوئے متاثر نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایتا کے لیے ایسپریسو کافی منگوائی۔

اگرچہ ایتا اب رونا دھونا بند کر چکی تھی، وہ مہینوں میں پہلی بار اپنا بوجھ بڑی حد تک کم محسوس کر رہی تھی۔

سیزارے اسے بس میں سوار کرانے چلا تو سڑک پار کرتے ہوئے کبھی کبھار ملنے کی تجویز پیش کی، کیوں کہ دونوں میں بہت کچھ مشترک تھا۔

"میں تو راہباؤں کی طرح رہتی ہوں،" وہ بولی۔

اس نے اپنا ہیٹ اوپر اٹھایا۔ "خدا حافظ۔" اور ایتا اس مہربانی کے لیے اس پر مسکرا دی۔

اس رات جب وہ گھر لوٹی تو ارماندو کے بغیر جینے کی اذیّت پھر سے لوٹ آئی۔ اسے اُن دنوں کا ارماندو یاد آنے لگا جب ان دونوں کی شادی نہیں ہوئی تھی، اور اُس کے بارے میں سیزارے سے باتیں کرنے پر وہ بے چینی محسوس کرنے لگی۔ اس نے اپنے آپ سے دعائیں، تسبیحیں اور اپنی ندامت جاری رکھنے کا عہد کیا تاکہ برزخ میں ارماندو پر رحم کیا جائے۔

ایتا نے ہفتے بھر بعد ایک اتوار کی سہ پہر سیزارے کو دوبارہ دیکھا۔ اُس نے ایتا کا نام اپنی چھوٹی سی نوٹ بک میں لکھ لیا تھا اور بجلی کی کمپنی میں کام کرنے والے ایک دوست کی مدد سے ویا نومینتانا پر واقع ایک عمارت میں اس کا گھر ڈھونڈ لیا تھا۔

جب اس نے ایتا کے دروازے پر دستک دی تو وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی بلکہ اس کا رنگ اُڑ گیا، حالاں کہ وہ شک میں پڑ کر جھجک سا گیا تھا۔ اس نے کہا کہ اسے ایتا کا گھر محض اتفاق سے معلوم ہو گیا

Scanned with CamScanner

ہے، اور ایتا نے کوئی تفصیل نہیں پوچھی۔ سیزارے ایک چھوٹا سا گلدستہ لایا تھا جو اس نے گھبراتے ہوئے قبول کر لیا اور پانی میں رکھ دیا۔

"آپ بہتر لگ رہی ہیں، سنیورا،" اس نے کہا۔

"ارماندو کے لیے میرا سوگ ابھی جاری ہے،" وہ اداسی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"خاتون،" اس نے انگلی سے اپنا موٹا کان جھاڑتے ہوئے مشورہ دیا، "آپ ابھی جوان ہیں اور پھر بدشکل بھی نہیں۔ آپ کو اس بات کا ادراک ہونا چاہیے۔ خود اعتمادی میں کئی فائدے ہیں۔"

ایتا نے کافی بنائی اور سیزارے مُصر ہو کر نصف درجن پیسٹریاں لے آیا۔

کافی کے دوران اس نے بتایا کہ اگر حالات جلد بہتر نہ ہوئے تو وہ باہر چلا جائے گا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کہا کہ اس نے طے کر لیا کہ وہ مرنے والی کو اس کے حصے سے زیادہ وقت دے چکا ہے۔ "میں نے اس کی یاد سے وفا کی ہے، مگر کبھی کبھی مجھے اپنا بھی خیال آتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے جب آدمی کو زندگی کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔ یہ فطری بات ہے۔ زندگی وہیں ہوتی ہے جہاں زندگی ہو۔"

ایتا نے نظریں جھکا لیں اور کافی کی چسکیاں لیتی رہی۔

سیزارے نے اپنی پیالی رکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کوٹ پہنا اور ایتا کا شکریہ ادا کیا۔ اوور کوٹ کے بٹن لگاتے ہوئے اس نے کہا کہ اس نواح میں آنا ہوا تو وہ اس کے ہاں پھر آئے گا؛ اس کا ایک صحافی دوست پاس ہی رہتا ہے۔

"یہ مت بھولیے گا کہ میں ابھی سوگ میں ہوں،" ایتا نے کہا۔

اس نے ایتا کو مودّبانہ انداز سے دیکھا۔ "یہ کون بھول سکتا ہے سنیورا؟ جب تک آپ سوگ میں ہیں، کون اسے بھولنا چاہے گا؟"

"آپ میری پتنا جانتے ہیں،" وہ اس طرح بولی گویا پھر سے وضاحت کر رہی ہو۔

"جانتا ہوں،" اس نے کہا۔ "ہم دونوں کے ساتھ دغا ہوئی ہے۔ وہ دونوں مر گئے اور مصیبت ہم اٹھا رہے ہیں۔ مرنے میری بیوی نے اٹھائے، دکھ میں جھیل رہا ہوں۔"

"عذاب وہ بھی جھیل رہے ہیں۔ اگر ارماندو کو عذاب جھیلنا ہی ہے تو میں نہیں چاہتی کہ وہ میرے سلسلے میں ہو۔ میں اسے یہ محسوس کرانا چاہتی ہوں کہ میں اب بھی اس کی منکوحہ ہوں۔" ایتا کی آنکھیں پھر بھر آئی تھیں۔

"وہ مر چکا ہے، سنیورا۔ آپ کی شادی ختم ہو چکی ہے،" سیزارے نے کہا۔ "اس کی موجودگی کے بغیر شادی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ ہاں، اگر آپ کو روح القدس کی آمد کی امید ہو تو اور بات ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بول رہا تھا، پھر اس نے دھیرے سے اضافہ کیا: "آپ کی ضرورتیں ایک مرے ہوئے آدمی کی ضرورتوں سے مختلف ہیں۔ آپ ایک صحت مند عورت ہیں۔ ہمیں حقائق کا سامنا کرنا چاہیے۔"

"روحانی طور پر نہیں،" ایتا جلدی سے بولی۔

"روحانی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی۔ مرنے کے بعد محبّت نہیں ہوتی۔"

وہ شرم سے سُرخ ہو گئی اور مضطرب ہو کر بولی: "گزرے ہوؤں کی محبّت ہوتی ہے۔ اُسے محسوس ہونا چاہیے کہ جس طرح وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہے بالکل اسی طرح میں بھی اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہی ہوں۔ میں نے دوسری دنیا میں اس کی مدد کرنے کے خیال سے اپنے آپ کو پاک رکھا ہے۔ اسے یہ بات محسوس ہونی چاہیے۔"

سیزارے نے سر کو جنبش دی اور رخصت ہو گیا، لیکن اس کے جانے کے بعد بھی ایتا مسلسل بے چینی محسوس کرتی رہی۔ وہ اضطراب کے عالم میں تھی اور اپنی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر۔ اگلے دن جب وہ ارماندو کی قبر پر گئی تو وہاں معمول سے زیادہ دیر ٹھہری۔ اس نے خود سے عہد کیا کہ سیزارے سے دوبارہ نہیں ملے گی۔ اگلے ہفتوں میں وہ قدرے بخیل ہو گئی۔

کوئی مہینے بھر بعد ایک شام صحافی پھر آیا۔ ایتا اس انداز سے دروازے میں جم گئی کہ لگتا تھا اُسے اندر نہیں بلائے گی۔ اس کے آنے کی صورت میں اس نے اپنے آپ کو تصوّر میں یہی کرتے دیکھا تھا۔ لیکن سیزارے نے، جس کا ہیٹ اس کے ہاتھ میں تھا، تھوڑی سی چہل قدمی کی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز اتنی شائستہ لگ رہی تھی کہ وہ مان گئی۔ وہ ویا نومینتانا پر ٹہلنے لگے۔ ایتا اپنے سب سے اونچی ایڑی کے جوتے پہنے تھی اور سیزارے بے جھجک باتیں کر رہا تھا۔ اس نے پیٹنٹ لیدر کے چھوٹے جوتے پہن رکھے تھے اور چہل قدمی کے دوران سگریٹ پی رہا تھا۔

دسمبر کے ابتدائی دن تھے اور ابھی سردیوں سے زیادہ آخرِ خزاں تھی۔ چند درختوں پر چند پتّے لگے ہوئے تھے اور ہوا ایک گرم سی دُھند سے بوجھل تھی۔ سیزارے نے تھوڑی دیر سیاسی صورتِ حال پر بات کی لیکن ویا وینتی سیتا مبرے کے ایک شراب خانے میں ایک ایسپریسو کافی کے بعد، واپس آتے ہوئے اس نے وہی موضوع چھیڑ دیا جس سے ایتا بچنا چاہتی تھی۔ وہ اچانک بے چین ہو گیا اور جو کچھ کہنے کی منصوبہ بندی کرتا رہا تھا اسے ضبط کرنے سے قاصر نظر آنے لگا۔ اس کی آواز میں شدّت، اشاروں میں بے چینی اور سیاہ آنکھوں میں اضطراب تھا۔ اگرچہ اس کے یوں پھٹ پڑنے سے ایتا ڈر گئی لیکن اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ تھی۔

"سنیورا،" وہ بولا۔ "تمھارا شوہر جہاں کہیں بھی ہے تم یہ کفارہ اپنے اوپر لے کر اس کی مدد نہیں کر رہی ہو۔ اس کی مدد کے لیے سب سے بہتر کام جو تم کر سکتی ہو وہ اپنی معمول کی زندگی کی طرف لوٹنا ہے۔ ورنہ وہ دُہرا عذاب جھیلتا رہے گا، ایک اپنے گناہ کا اور دوسرا اس ناروا بوجھ کا جو زندگی سے تمھارے انکار نے اس پر لاد دیا ہے۔"

"میں اُسے سزا نہیں دے رہی، اپنے گناہوں پر پچھتا رہی ہوں۔" وہ اس قدر پریشان تھی کہ مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ اس نے گھر تک کا راستا خموشی سے طے کرنے اور سیزارے پر زور سے دروازہ بند کر دینے کے بارے میں سوچا، مگر پھر خود کو جلدی سے کہتے سنا: "اگر ہم آشنا بن گئے تو یہ بے وفائی ہو گی۔ ہم گزرے

Scanned with CamScanner

ہوؤں سے دغا کر رہے ہوں گے۔"

"تم ہر بات کو اُلٹا کیوں لیتی ہو؟"

سیزارے ایک درخت کے نیچے ٹھہر گیا اور بولتے ہوئے تقریباً اُچھل رہا تھا۔ "دغا تو انھوں نے کی ہے، ہم سے۔ میں معافی چاہتا ہوں، سنیورا، حقیقت یہ ہے کہ میری بیوی کمینی تھی۔ تمھارا شوہر کمینہ تھا۔ ہم سوگوار اس لیے ہیں کہ ہمیں ان سے نفرت ہے۔ ہمیں باوقار ہو کر حقیقت کا سامنا کرنا چاہیے۔"

"بس کرو،" وہ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے کراہی۔ "اب کچھ اور مت کہنا۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

"ایتا،" سیزارے نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے والہانہ طور سے کہا، "یہ میری آخری بات ہے۔ اس کے بعد میں اپنی زبان تالو سے چپکا لوں گا۔ بس یہ یاد رکھنا۔ اگر اس لمحے خود ابنِ مریم ارماندو کو مُردوں میں سے اٹھا دے تو وہ آج رات اپنی عم زاد کے بستر میں ہو گا۔"

وہ رونے لگی۔ اس کی بات کی سچائی کو محسوس کرتے ہوئے وہ روتی اور آگے چلتی گئی۔ سیزارے جو کچھ کہنا چاہتا تھا، لگتا تھا کہہ چکا۔ اس نے آہستگی سے ایتا کا بازو تھاما اور گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اس کے گھر کی طرف لے چلا۔ باہری دروازے پر، جب کہ ایتا اس سے چھٹکارا پانے اور اس سلسلے کو ختم کرنے کا کوئی طریقہ سوچ رہی تھی، اس نے لمحہ بھر انتظار کیے بغیر اپنا ہیٹ چھُوا اور رخصت ہو گیا۔

ہفتے بھر سے زیادہ ایتا بہت سی اذیتوں سے گزرتی رہی۔ اس نے سیزارے کے ساتھ سونے کی شدید آرزو محسوس کی۔ رات کی رات اس کا بدن ایک مشعل بن گیا۔ اس کے خواب جنس آلودہ تھے۔ اس نے ارماندو کو لورا کے ساتھ بستر میں عریاں دیکھا، اور اسی بستر میں خود کو سیزارے کے ساتھ ہم آغوش پایا۔ لیکن اپنے انتہائی پُرہوس خیالوں کے اعتراف اور ذہنی سکون کے لیے ارماندو کی قبر پر گھنٹوں قیام کر کے اور عبادت کے ذریعے وہ مزاحمت کرتی رہی۔

ایک شب سیزارے نے اس کے دروازے پر دستک دی، اور چوں کہ اپنی شادی کے بستر کی تجویز سے ایتا کو نفرت محسوس ہوئی لہٰذا وہ اس کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی۔ بعد ازاں وہ خود کو قصوروار محسوس کرتی تھی، مگر اس نے ارماندو کی قبر پر جانا جاری رکھا، گو کم تواتر کے ساتھ، اور جب بعد میں وہ سیزارے کے ہاں گئی تو قبرستان جانے کے بارے میں اسے نہیں بتایا۔ اس نے بھی ایتا سے نہیں پوچھا، نہ اپنی بیوی یا ارماندو کے بارے میں کوئی بات کی۔

پہلے پہل اس کی بے چینی شدید تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے شوہر کی یاد سے دغا کی مرتکب ہوئی ہو، مگر جب اس نے بار بار خود کو بتایا کہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے، کہ وہ مر چکا ہے، اور اب وہ تنہا رہ گئی ہے، تو اسے رفتہ رفتہ یقین آنے لگا۔ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے، صرف اس کی یاد ہے۔ وہ بے وفائی کا ارتکاب نہیں کر رہی۔ وہ ایک تنہا عورت ہے اور اس کا ایک عاشق ہے جو شریف اور مخلص ہے اور جس کی بیوی مر چکی ہے۔

Scanned with CamScanner

ایک رات جب وہ بستر میں تھے، اس نے شادی کے امکان پر سیزارے سے بات کی۔ اس نے جواب دیا کہ محبت زیادہ اہم ہے۔ وہ دونوں خوب جانتے تھے کہ شادی محبت کو کس طرح برباد کردیتی ہے۔

اور پھر دو ماہ بعد جب اسے معلوم ہوا کہ وہ حاملہ ہے تو سیزارے کو اطلاع دینے اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑی۔ صحافی نے، جو شب خوابی کا لباس پہنے تھا، اسے تسلّی دی۔ "ہمیں انسانی زندگی پر افسوس نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہ تمہارا بچہ ہے،" ایتا نے کہا۔

"میں اسے اپنا تسلیم کرلوں گا،" سیزارے نے کہا، اور ایتا پریشان مگر خوش خوش اپنے گھر چلی گئی۔

اگلے روز ارماندو کی قبر پر جا کر اور اسے یہ اطلاع دے کر کہ وہ آخر کار ماں بننے والی ہے، جب وہ اپنے معمول کے وقت سیزارے کے گھر پہنچی تو وہ جا چکا تھا۔

"چلا گیا،" مکان مالکن نے اپنے ہاتھ کو جنبش دیتے ہوئے کہا، اسے نہیں معلوم تھا کہاں۔

**

(انگریزی عنوان : Life is Better then Death)

برنارڈ مالامڈ

انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی

پہلے سات برس

جُفت ساز فیلڈ برہم تھا کہ اُس کا مددگار سوبل، جو دوسری بنچ پر مصروفِ کار تھا، اس کی موجودگی کے بارے میں اس قدر بے حِس ہے کہ لمحہ بھر کو اپنی مجنونانہ ٹھک ٹھک بند نہیں کر سکتا۔ اس نے سوبل کی طرف دیکھا، لیکن اس کا گنجا سر اپنے کام پر جھکا ہوا تھا سو وہ محسوس نہیں کر سکا۔ جفت ساز نے جھرجھری لی اور جزوی طور پر کُہر زدہ کھڑکی سے فروری کی برفباری کی پیدا کی ہوئی دھند دیکھتا رہا۔ لیکن نہ تو باہر جگہ بدلتی ہوئی دھند اور نہ ہی پولینڈ کے اُس برفانی گاؤں کی اچانک یاد جہاں اس نے اپنی جوانی گنوائی تھی، اُس کی توجہ کالج کے طالبِ علم میکس سے ہٹا سکی جسے اس نے پہلے پہل ایک برفانی صبح اسکول جاتے دیکھا تھا اور جو اُسی دن سے اس کے ذہن پر طاری تھا؛ جس کی وہ اس لیے عزت کرتا تھا کہ اس نے سالہا سال، گرمی سردی کی پروا کیے بغیر، اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے دکھ اٹھائے تھے۔ جفت ساز کو ایک پرانی خواہش نے آگھیرا۔۔ کاش وہ بیٹی کے بجائے ایک بیٹے کا باپ ہوتا۔۔ لیکن یہ خواہش برف میں گُھل گئی، کہ وہ بہر حال ایک عملی آدمی تھا۔ تاہم وہ تعلیم کے معاملے میں میکس کی لگن کا، جو ایک پھیری والے کا بیٹا تھا، اپنی بیٹی کی لاتعلقی سے تقابل کیے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ سچ ہے کہ اس کی بیٹی کے ہاتھ میں ہمیشہ کتاب رہتی تھی تاہم جب کالج کی تعلیم کا موقع آیا تو اس نے کہا کہ وہ کالج میں پڑھنے پر ملازمت کرنے کو ترجیح دے گی۔ اس نے بیٹی کی منتیں کی تھیں، اُسے سمجھایا تھا کہ کتنے ہی باپ محض اپنی غربت کی وجہ سے اپنے بچوں کو کالج نہیں بھیج سکتے۔ لڑکی نے کہا کہ وہ خود مختار ہونا چاہتی ہے۔ جہاں تک تعلیم کی بات ہے، اس نے پوچھا تھا، تو تعلیم کتابوں کے علاوہ کیا ہے؟ سوبل، جو دل جمعی سے کلاسکس پڑھتا رہتا ہے،

Scanned with CamScanner

اسے حسبِ معمول کتابوں کے بارے میں مشورے دیتا رہے گا۔ اس کے جواب نے باپ کو بہت رنجیدہ کیا۔

برف سے ایک شکل نمودار ہوئی اور دکان کا دروازہ کھلا۔ اس شخص نے کاؤنٹر پر پہنچ کر گیلے کاغذی تھیلے میں سے گھسے ہوئے جوتوں کا جوڑا نکالا جو وہ مرمّت کرانے کے لیے لایا تھا۔ یہ شخص کون ہے، لمحہ بھر کو جفت ساز بالکل نہ سمجھ سکا، لیکن ابھی اس نے نووارد کا چہرہ مکمل طور سے شناخت بھی نہیں کیا تھا کہ اس کے دل نے اپنے مقابل میکس کی موجودگی محسوس کر کے دھڑکنا شروع کر دیا جو اُسے گھبراہٹ میں بتا رہا تھا کہ اس کے پرانے جوتوں میں کیا مرمّت ہونی ہے۔ گو فیلڈ ہمہ تن گوش تھا لیکن ایک لفظ بھی نہ سن سکا کیوں کہ اس اچانک موقعے نے اس کے حواس گم کر دیے تھے۔

اُسے ٹھیک طرح سے یاد نہیں تھا کہ یہ خیال اسے پہلے پہل کب آیا کیوں کہ وہ اس لڑکے کے سامنے مریم کے ساتھ کہیں باہر جانے کی تجویز رکھنے کے بارے میں ایک سے زائد بار سوچ چکا تھا، لیکن اس خوف سے میکس سے بات نہ کر سکا تھا کہ اگر اس نے انکار کر دیا تو وہ دوبارہ اس کا سامنا کیسے کر سکے گا۔ یا بالفرض مریم ہی، جو ہر وقت آزادی کا راگ الاپتی رہتی تھی، اس کی دخل اندازی پر مشتعل ہو گئی تو؟ تاہم یہ موقع ایسا تھا کہ اسے ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسے تو صرف تعارف کرانا تھا: اگر انھیں کہیں ملنے کا اتفاق ہو گیا ہوتا تو یہ دونوں بہت پہلے دوست بن چکے ہوتے۔ لہٰذا ان دونوں کو یکجا کرنا کیا اس کا فرض بلکہ ذمے داری نہیں تھی؟ ایک بے ضرر ساز باز جو سب وے میں اچانک ملاقات، یا یوں کہو کسی مشترکہ دوست کے کرائے ہوئے تعارف، کا متبادل ہو۔ میکس کو صرف ایک بار مریم سے ملنے اور بات کرنے کا موقع ملنا چاہیے، وہ یقیناً اس میں دل چسپی لینے لگے گا۔ جہاں تک مریم کا تعلّق ہے، تو ایک دفتری لڑکی کے، جس کا ملنا صرف بلند آواز سیلزمینوں اور جاہل شپنگ کلرکوں سے ہوتا ہے، ایک نفیس پڑھا کو لڑکے سے متعارف ہونے میں کیا حرج ہے؟ ہو سکتا ہے میکس اس کے دل میں کالج جانے کی خواہش بیدار کر دے، بھلے ہی اسے (یہاں جفت ساز کے دل کا چور آخر سامنے آ گیا) ایک تعلیم یافتہ شخص سے شادی کر کے بہتر زندگی گزارنے کا موقع نہ دے۔

جب میکس اپنے جوتوں کی مرمّت کے بارے میں بتا چکا تو جفت ساز نے ان کے تلوں پر، جن میں بڑے بڑے سوراخ تھے، سفید چاک سے "ایکس" کی شکل کے نشان لگا دیے اور ربر کی ایڑیوں پر، جو بالکل گھِس چکی تھیں، "او" کی شکل کے، گو وہ اس بات کی طرف سے فکرمند تھا کہ کہیں اس نے نشان ادل بدل نہ کر دیے ہوں۔ میکس نے اُجرت پوچھی تو جفت ساز نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے اسے بغلی دروازے سے اندر ہال میں چلنے کی دعوت دی۔ سوبل کی ٹھک ٹھک بدستور جاری تھی۔ میکس حیران تھا، تاہم اس نے دعوت قبول کر لی۔ فیلڈ بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گیا۔ دونوں ایک منٹ تک خاموش رہے کیوں کہ سوبل نے اپنی ٹھک ٹھک بند کر دی تھی: ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ بات سمجھتے ہیں کہ جب تک شور دوبارہ شروع نہ ہو جائے انھیں ایک لفظ بھی نہیں بولنا ہے۔ ٹھک ٹھک زوردار آواز سے دوبارہ

Scanned with CamScanner

شروع ہوئی تو جفت ساز نے جلدی جلدی میکس کو بتایا کہ وہ اس سے کیوں بات کرنا چاہتا تھا۔

"جب سے تم نے ہائی اسکول جانا شروع کیا،" اس نے نیم روشن راہداری میں کہا، "میں ہر صبح تمہیں اسکول کے لیے سب وے کی طرف جاتے دیکھتا رہا ہوں، اور ہمیشہ خود سے کہتا رہا ہوں کہ یہ کتنا اچھا لڑکا ہے جسے تعلیم کی اتنی فکر ہے۔"

"شکریہ،" میکس نے کہا۔ وہ بوکھلا کر چوکنا ہو گیا تھا۔ وہ طویل قامت اور بھدے پن کی حد تک دُبلا تھا۔ اس کے خدوخال تیکھے تھے، خاص طور پر اس کی ناک چونچ جیسی تھی۔ وہ ایک نم آلود ڈھیلا ڈھالا لمبا اوور کوٹ پہنے تھا جو اس کے ٹخنوں تک پہنچ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے دُبلے پتلے شانوں پر قالین لٹکا دیا ہو۔ اس نے بھورے رنگ کا ایک پرانا ہیٹ پہن رکھا تھا جو نمی سے سیلا ہوا تھا اور اُتنا ہی خستہ تھا جتنے اس کے مرمّت طلب جوتے۔

"میں ایک کاروباری آدمی ہوں،" جفت ساز اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے اچانک بولا، "لہٰذا تم سے صاف صاف بات کروں گا۔ میری ایک بیٹی ہے مریم، جو اُنیس سال کی ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے، اور خوب صورت بھی۔ ایسی خوب صورت کہ جب گلی سے گزرتی ہے تو ہر کوئی اسے دیکھنے لگتا ہے۔ ذہین ہے، ہر وقت کتابیں پڑھتی رہتی ہے۔ میں نے سوچا تم جیسا پڑھا لکھا لڑکا۔۔۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے تم اس جیسی لڑکی سے ملنے میں دل چسپی لو۔" اپنی بات ختم کر کے وہ تھوڑا سا ہنسا۔ اسے کچھ اَور کہنے کی خواہش ہوئی لیکن ہوش مندی نے اسے روک دیا۔

میکس عقاب کی طرح نظریں نیچے گاڑے رہا۔ وہ ایک غیر آرام دہ لمحے تک چپ رہا، پھر اس نے پوچھا:

"آپ نے کیا عمر بتائی، اُنیس سال؟"

"ہاں۔"

"کیا یہ پوچھنا مناسب ہو گا کہ آپ کے پاس اس کی کوئی فوٹو ہے؟"

"ایک منٹ،" جفت ساز اندر دکان میں گیا اور ایک فوٹو لے آیا۔ میکس نے فوٹو کو روشنی کی طرف کر کے دیکھا۔

"بہت خوب،" اس نے کہا۔

جفت ساز منتظر رہا۔

"کیا وہ سمجھ دار بھی ہے۔ ڈھلمل قسم کی تو نہیں؟"

"مریم بہت سمجھ دار ہے۔"

ایک اَور مختصر سے وقفے کے بعد میکس نے کہا کہ اسے مریم سے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں۔

"یہ میرا فون نمبر ہے،" جفت ساز نے اسے جلدی سے کاغذ کا پُرزہ تھماتے ہوئے کہا۔ "اسے فون کر لینا۔ وہ چھ بجے دفتر سے لوٹ آتی ہے۔"

میکس نے کاغذ کا پرزہ تہہ کر کے اپنے گھسے ہوئے چمڑے کے بٹوے میں رکھ لیا۔
''جوتوں کے بارے میں،'' اس نے پوچھا، ''آپ نے کیا کہا تھا، کتنے پیسے لگیں گے؟''
''پیسوں کی فکر مت کرو۔''
''پھر بھی، میں اندازہ کرنا چاہتا ہوں۔''
''ایک ڈالر۔۔۔ ایک ڈالر پچاس سینٹ،'' جفت ساز نے جواب دیا۔

اس نے اچانک بدمزگی محسوس کی، کیوں کہ عام طور پر وہ اس قسم کے کام کے دو ڈالر پچیس سینٹ لیتا تھا: اسے یا تو پوری اُجرت لینی چاہیے تھی یا پھر کام مفت میں کر دینا چاہیے تھا۔

بعد میں جب وہ دکان میں داخل ہوا تو ایک شدید آواز سن کر بھونچکا رہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ سوبل خالی فرمے کو کوٹ رہا ہے۔ فرما ٹوٹ کر فرش پر گرا اور پھر اُچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ لیکن اس سے پہلے کہ مشتعل جفت ساز چیختا چلاتا، اس کا مددگار کھونٹی پر سے اپنا ہیٹ اور کوٹ اتار کر تیزی سے باہر برف میں نکل گیا۔

اس طرح فیلڈ اپنی بیٹی اور میکس کے روابط کے بارے میں اندازے لگانے کے بجائے، جس کی وہ توقع کر رہا تھا، سخت پریشانی میں گرفتار ہو گیا۔ اپنے زود حس مددگار کے بغیر وہ ایک بے مصرف شخص تھا، خاص طور پر اس لیے کہ اسے اکیلے دکان چلاتے ہوئے زمانہ ہو چکا تھا۔ اسے برسوں سے دل کا عارضہ تھا۔ بیماری اب اس منزل میں تھی جہاں مشقت مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ پانچ سال پہلے جب اسے دل کا دورہ پڑا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ اسے اپنا کاروبار نیلام کر کے ایک حقیر آمدنی پر جینا پڑے گا یا پھر اپنے آپ کو کسی بددیانت ملازم کے رحم و کرم پر چھوڑنا ہو گا جو انجام کار اسے تباہ کر ڈالے گا، لیکن اس کی زندگی کے عین مایوس ترین لمحے میں یہ پولینڈ کا پناہ گزیں، سوبل، ایک رات اچانک نمودار ہوا تھا اور اس سے ملازمت کی درخواست کی تھی۔ وہ ناکافی کپڑوں میں ملبوس ایک بھاری بھرکم شخص تھا۔ اس کا سر، جس پر کبھی سنہری بال تھے، بالکل گنجا ہو چکا تھا اور چہرہ یکسر سپاٹ تھا۔ اس کی ہلکی نیلی آنکھیں، ان اداس کتابوں کے سبب جو وہ پڑھا کرتا تھا، مائل بہ گریہ تھیں۔ وہ جوان ہوتے ہوئے بھی اتنا عمر رسیدہ لگتا تھا کہ اسے کوئی بھی تیس برس کا نہیں کہہ سکتا تھا۔ گو اسے اعتراف تھا کہ وہ جفت سازی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، لیکن اس نے کہا کہ وہ مستعد ہے اور اگر فیلڈ نے اسے یہ ہنر سکھا دیا تو وہ بہت کم معاوضے پر کام کرے گا۔ فیلڈ نے یہ سوچتے ہوئے کہ ایک ہم وطن سے کسی مکمل اجنبی کی نسبت بہرحال کم خطرہ ہو گا، اسے رکھ لیا اور چھ ہفتے کے اندر اندر وہ پناہ گزیں جوتوں کی اُتنی ہی اچھی مرمّت کرنے لگا جتنی خود فیلڈ، اور اس کے بعد جلد ہی اس نے مطمئن جفت ساز کا سارا کاروبار سنبھال لیا۔

فیلڈ اس پر ہر معاملے میں بھروسا کر سکتا تھا اور کرتا تھا۔ وہ دکان میں گھنٹا دو گھنٹے گزار کر اکثر گھر چلا جاتا۔ وہ ساری رقم غلّک میں چھوڑ جاتا تھا کیوں کہ اسے یقین تھا کہ سوبل ایک ایک سینٹ کی حفاظت

کرے گا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ وہ بہت کم رقم طلب کرتا تھا۔ اس کی ضروریات چند ایک ہی تھیں۔ پیسے سے تو اسے دل چسپی تھی ہی نہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کتابوں کے سوا، جو وہ ایک ایک کر کے مریم کو پڑھنے کے لیے دیا کرتا تھا، اسے کسی بھی چیز سے دل چسپی نہیں ہے۔ کتابوں کے ساتھ اس کے عجیب و غریب تحریری تبصرے بھی ہوتے جو بہت مفصل ہوتے تھے اور جنھیں وہ اپنے کمرے کی تنہا شاموں میں لکھا کرتا تھا۔ یہ تبصرے جو موٹے موٹے پلندوں پر مشتمل ہوتے، جفت ساز کی بیٹی چودہ سال کی عمر سے اس تقدیس کے ساتھ پڑھ رہی تھی گویا وہ الہامی تحریریں ہوں۔ وہ ان تبصروں کو اُچک کر دیکھنے کی کوشش کرتا اور اپنی بیٹی پر کندھے اُچکا کر رہ جاتا۔

وہ سوبل کا بہت خیال رکھتا تھا اور وہ جو کچھ طلب کرتا اس سے زیادہ ہی دیتا تھا۔ تاہم اس کا ضمیر اسے اس بات پر ملامت کرتا تھا کہ وہ سوبل سے زیادہ تنخواہ وصول کرنے پر اصرار نہیں کرتا۔ ہر چند کہ اس نے سوبل کو دیانت داری کے ساتھ بتا دیا تھا کہ وہ کہیں اَور کام کر کے یا خود اپنی دکان کھول کر موجودہ آمدنی سے کہیں زیادہ کما سکتا ہے، لیکن سوبل نے کسی حد تک اکھڑ لہجے میں جواب دیا کہ وہ کہیں اَور جانے میں دل چسپی نہیں رکھتا۔ فیلڈ اپنے آپ سے اکثر سوال کرتا: یہ یہاں کیوں لگا ہوا ہے؟ آخر اسے کیا چیز روکے ہوئے ہے؟ اور آخرکار اس نے یہ جواب ڈھونڈ لیا کہ یہ شخص پناہ گزینی کے ہولناک تجربوں سے گزرنے کے باعث دنیا سے خائف ہے۔

فرما ٹوٹنے کے واقعے کے بعد جفت ساز نے، جو سوبل کے رویئے سے ناراض تھا، طے کیا کہ اسے ہفتے بھر کے لیے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے، حالاں کہ اس دوران اسے سخت مشقت کرنا پڑی جو اس کے لیے خطرناک تھی، اور کاروبار الگ متاثر ہوا۔ تاہم اپنی بیوی اور بیٹی دونوں کی سخت تنبیہوں کے بعد آخر وہ سوبل کو ڈھونڈنے نکلا۔ یہ تلاش بھی ابھی کچھ دن پہلے کی تلاش کے مماثل تھی جب سوبل ایک معمولی سی بات پر بگڑ کر چلا گیا تھا۔ فیلڈ نے اسے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ مریم کو اتنی کتابیں نہ دیا کرے کیوں کہ اس نے پڑھ پڑھ کر اپنی آنکھیں سُرخ کر لی ہیں۔ یہ واقعہ بھی حسبِ معمول بے نتیجہ رہا تھا، کیوں کہ اس کے کہنے سننے پر سوبل لوٹ آیا تھا اور بنچ پر اپنی خالی جگہ سنبھال لی تھی۔ لیکن اس بار جب وہ برف میں دھنستا ہوا سوبل کے گھر پہنچا تو باتونی مکان مالکن نے، جو ناک میں بولتی تھی، اسے دروازے پر بتایا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ فیلڈ سمجھ گیا کہ یہ جھوٹ ہے (آخر سوبل کہاں جا سکتا تھا؟)، پھر بھی کسی وجہ سے، جس کے بارے میں وہ یقین سے نہیں جانتا تھا۔۔ شاید ٹھنڈ اور تکان کے باعث۔۔ اس نے سوبل سے ملنے پر اصرار نہیں کیا بلکہ گھر چلا آیا اور ایک نیا مددگار رکھ لیا۔ اس نے مریم کو سوبل کے پاس بھیجنے کے بارے میں بھی سوچا لیکن یہ خیال اسے نفرت انگیز لگا۔

اس طرح اس نے یہ معاملہ نمٹا لیا، گو وہ پوری طرح مطمئن نہیں تھا کیوں کہ اب اسے پہلے سے زیادہ کام کرنا پڑتا تھا اور وہ صبح کو دیر تک بستر میں نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ نیا مددگار گہری رنگت والا ایک گھنا شخص تھا جو کام کرتے وقت بڑبڑاتا رہتا تھا۔ فیلڈ کو اس کی بڑبڑاہٹ پر غصہ آتا تھا۔ وہ سوبل کی طرح چابی اس

Scanned with CamScanner

کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ علاوہ ازیں، یہ شخص گو مرمت کا کام اچھا خاصا کر لیتا تھا، مگر چمڑے کے درجوں یا قیمتوں کے بارے میں نابلد تھا۔ سو فیلڈ کو خریداری خود کرنا پڑتی اور ہر رات دکان بند کرنے سے پہلے غلک میں موجود رقم گننا بھی ضروری تھا، تاہم وہ غیر مطمئن نہیں تھا کیوں کہ بیشتر وقت وہ میکس اور مریم کی بابت اپنے خیالوں میں کھویا رہتا تھا۔ لڑکا مریم سے ملا تھا اور ان دونوں نے اس آنے والی جمعے کی شب کو ملاقات طے کی تھی۔ وہ ذاتی طور پر سنیچر کو ترجیح دیتا، جس سے اس کے خیال میں اس ملاقات کی اہمیت بڑھ جاتی، لیکن اسے معلوم تھا کہ جمعہ خود مریم کا انتخاب ہے، سو وہ چپ رہا۔ دن کی کوئی اہمیت نہیں تھی، اہمیت تو بعد کے واقعات کی تھی۔ کیا وہ ایک دوسرے کو پسند کریں گے اور دوست رہنا چاہیں گے؟ اس سوال کا حتمی جواب ملنے تک جو وقت گزرنا ضروری تھا وہ اس پر بہت بھاری تھا۔ مریم سے اس لڑکے کے بارے میں بات کرنے کی اسے اکثر خواہش ہوتی۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آیا میکس کی "قسم" اسے پسند آئے گی۔ خود اُس نے مریم کو صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ میکس کو اچھا لڑکا سمجھتا ہے اور اسی نے تجویز کیا تھا کہ وہ مریم سے ملے۔ لیکن جب ایک بار اس نے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو مریم نے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ حق بجانب تھی۔ آخر وہ ابھی سے کیا بتا سکتی تھی؟

آخر کار جمعہ آ گیا۔ فیلڈ خود کو بہت زیادہ بشاش محسوس نہیں کر رہا تھا سو وہ بستر ہی میں رہا، اور میکس کے آنے کے وقت فیلڈ کی بیوی نے بھی اس کے ساتھ خواب گاہ ہی میں رہنا بہتر سمجھا۔ مریم نے لڑکے کا سواگت کیا۔ اس کے ماں باپ ان دونوں کو باتیں کرتے سن سکتے تھے۔ لڑکے کی آواز بھاری ہونے کے سبب نمایاں تھی۔ رخصت ہونے سے قبل مریم اسے خواب گاہ کے دروازے پر لائی۔ اس کا طویل قامت اور قدرے خمیدہ جثہ، جو موٹے کپڑے کے ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں ملبوس تھا، پل بھر کو دروازے میں رکا۔ وہ دیکھنے میں مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ اس نے جفت ساز اور اس کی بیوی کی مزاج پُرسی کی جو بلاشبہ ایک اچھی علامت تھی۔ گو مریم دن بھر کی تھکی ہوئی تھی مگر پھر بھی تازہ دم اور خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ وہ بڑے جثے اور متناسب بدن کی لڑکی تھی۔ اس کا چہرہ دلکش اور بال نرم تھے۔ فیلڈ کی نگاہ میں وہ دونوں ایک مثالی جوڑا تھے۔

مریم ساڑھے گیارہ بجے کے بعد لوٹی۔ اس کی ماں سو چکی تھی لیکن جفت ساز بستر سے اٹھا اور اپنی باتھ روب پہننے کے بعد کچن میں گیا جہاں مریم میز پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

"تم لوگ کہاں گئے تھے؟" اس نے خوش گوار لہجے میں پوچھا۔

"چہل قدمی کرنے،" مریم نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"میں نے اسے مشورہ دیا تھا،" وہ گلا صاف کرتے ہوئے بولا، "کہ وہ زیادہ پیسے خرچ نہ کرے۔"

"میں نے غور نہیں کیا۔"

جفت ساز نے چائے کے لیے پانی اُبالا اور پیالی اور لیموں کی ایک موٹی قاش لے کر میز پر بیٹھ گیا۔

"سو، تمھاری تفریح،" اس نے ایک چسکی لے کر آہ بھری، "کیسی رہی؟"

Scanned with CamScanner

"ٹھیک تھی۔"

جفت ساز خاموش ہو گیا۔ مریم نے یقیناً اس کی مایوسی کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔ وہ بولی:

"پہلی ملاقات میں کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"اس سے پھر ملو گی؟"

مریم نے ورق اُلٹتے ہوئے بتایا کہ میکس نے ایک اور ملاقات کے لیے کہا ہے۔

"کس دن؟"

"سنیچر کو۔"

"تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کیا کہا؟" مریم نے سوال دُہرایا اور لمحہ بھر توقف کے بعد بولی: "میں نے ہامی بھر لی۔"

بعد ازاں مریم نے سوبل کے بارے میں پوچھا اور فیلڈ نے یہ جانے بغیر کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے، اسے بتایا کہ سوبل نے کہیں اور نوکری کر لی ہے۔ مریم نے مزید کچھ نہیں کہا اور چپ چاپ پڑھتی رہی۔ جفت ساز کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ وہ سنیچر کو ہونے والی ملاقات کے خیال سے مطمئن تھا۔

ہفتے کے دوران اس نے مریم سے ایک آدھ مشاق سوال کے ذریعے میکس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کر لیں۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میکس ڈاکٹر یا وکیل بننے کے لیے نہیں پڑھ رہا بلکہ اس نے اکاؤنٹنسی میں ڈگری لینے کے لیے ایک تجارتی مضمون لے رکھا ہے۔ فیلڈ کو قدرے مایوسی ہوئی کیوں کہ وہ اکاؤنٹنٹوں کو منشی سمجھتا تھا۔ وہ کسی "اعلیٰ پیشے" کو ترجیح دیتا تھا، تاہم اس نے جلد ہی اس سلسلے میں تفتیش کر کے معلوم کر لیا کہ سرٹیفائیڈ پبلک اکاؤنٹنٹ بہت باعزت لوگ ہوتے ہیں۔ اور یوں سنیچر کے آتے آتے وہ پوری طرح مطمئن تھا۔ لیکن سنیچر کا دن مصروف دن تھا اور اسے زیادہ وقت دکان میں رہنا پڑا، اس لیے جب میکس مریم سے ملنے آیا تو وہ اسے نہیں دیکھ سکا۔ اسے اپنی بیوی سے معلوم ہوا کہ ان کے خیر مقدمی کلمات سے کوئی خاص بات ظاہر نہیں تھی۔ میکس نے گھنٹی بجائی تھی اور مریم اپنا کوٹ اٹھا کر اس کے ساتھ باہر نکل گئی تھی۔ بس، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ فیلڈ گھبرائی میں نہیں گیا کیوں کہ اس کی بیوی کچھ خاص تیز بیں نہیں تھی۔ اس کے بجائے وہ اخبار لے کر مریم کی واپسی کا انتظار کرتا رہا، لیکن وہ مستقبل کے خیالات میں اس قدر محو تھا کہ اخبار پر اس کی نظر بمشکل پڑتی تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو مریم کمرے میں اس کے ساتھ موجود تھی۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں اپنا ہیٹ اتار رہی تھی۔ مریم کا خیر مقدم کرتے ہوئے ایک ناقابلِ توجیہ خوف نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ گزری ہوئی شام کے بارے میں اس سے کچھ نہ پوچھ سکا۔ مریم نے ازخود بھی کچھ نہیں بتایا، سو آخر وہ پوچھنے پر مجبور ہو گیا کہ شام کیسی گزری۔ مریم نے پہلے تو گول مول جواب دینا چاہا لیکن پھر اپنا خیال بدل لیا اور لمحہ بھر بعد بولی: "میں بور ہوئی۔"

جب فیلڈ اپنی مایوسی سے بحال ہو چکا اور اس نے مریم سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بلا تردّد

Scanned with CamScanner

جواب دیا: "وہ مادّہ پرست سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔"

"اس لفظ کے کیا معنی ہیں؟"

"وہ بے روح شخص ہے۔ صرف چیزوں میں دل چسپی رکھتا ہے۔"

اس نے مریم کے بیان پر تا دیر غور کیا۔ پھر پوچھا: "پھر ملو گی اس سے؟"

"اس نے کہا تو نہیں۔"

"فرض کرو اگر وہ کہے؟"

"میں اس سے نہیں ملوں گی۔"

جفت ساز نے حجت نہیں کی، تاہم ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی امید بڑھتی رہی کہ مریم اپنا ارادہ بدل دے گی۔ وہ سوچتا کاش میکس ہی ملنے آ جائے، کیوں کہ اسے یقین تھا کہ میکس میں جو کچھ ہے اُسے مریم کی ناتجربہ کار آنکھ نہیں دیکھ سکتی، لیکن میکس نہیں آیا بلکہ اس نے کالج جانے کے لیے ایک اَور راستا اختیار کر لیا۔ اب وہ جفت ساز کی دکان کے سامنے سے نہیں گزرتا تھا۔ فیلڈ کو اس بات سے سخت صدمہ پہنچا۔

ایک سہ پہر میکس دکان میں داخل ہوا اور اپنے جوتے مانگے۔ جفت ساز نے اس کے جوتے شیلف سے اتارے جہاں اس نے انھیں دوسرے جوتوں سے الگ رکھا تھا۔ اس نے ان جوتوں کی خود مرمّت کی تھی اور ان کے تلے اور ایڑیاں بہت مضبوط اور عمدہ بنی تھیں؛ انھیں بہت اچھی طرح پالش کیا گیا تھا اور وہ، کسی نہ کسی طرح، نئے جوتوں سے بہتر لگ رہے تھے۔ میکس نے جب انھیں دیکھا تو اس کا ٹینٹوا اُچھل کر اوپر آ گیا اور آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

"کتنے پیسے؟" اس نے جفت ساز کی طرف براہِ راست دیکھے بغیر پوچھا۔

"جتنے تمھیں بتائے تھے،" فیلڈ نے افسردگی سے جواب دیا۔ "ایک ڈالر پچاس سینٹ۔"

میکس نے دو مُڑے تڑے نوٹ اس کے حوالے کیے اور بدلے میں چاندی کا نصف ڈالر کا سکّہ وصول کیا۔ پھر وہ چلا گیا۔ مریم کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ اسی رات جفت ساز پر انکشاف ہوا کہ اس کا نیا مددگار شروع سے غلک سے پیسے چُرا تا رہا ہے، اور اس پر دل کا دورہ پڑ گیا۔

دورہ گو بالکل معمولی تھا لیکن اسے تین ہفتے بستر میں رہنا پڑا۔ مریم نے سوبل کو بلانے کی بات کی تو جفت ساز جو پہلے ہی بیمار تھا، اس بات پر اَور چیخنے چلانے لگا، تاہم وہ اپنے دل میں جانتا تھا کہ اس کے سوا کوئی اَور راستا نہیں ہے۔ اور دکان میں تھکا دینے والے پہلے ہی دن نے اسے مکمل طور پر قائل کر لیا، سو اس رات کھانے کے بعد وہ گرتا پڑتا سوبل کی طرف گیا۔ وہ آخری منزل تک سیڑھیاں چڑھتا رہا حالاں کہ جانتا تھا کہ یہ اس کے لیے مضر ہے۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ سوبل نے دروازہ کھولا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ کمرہ چھوٹا اور سستا قسم کا تھا۔ اس میں ایک ہی کھڑکی تھی جو سڑک پر کھلتی تھی۔ کمرے میں ایک تنگ

Scanned with CamScanner

چارپائی، ایک نیچی میز اور کتابوں کے کئی ڈھیر تھے جو دیواروں کے ساتھ ساتھ بے ترتیبی سے فرش پر پڑے تھے۔ کتابوں کے ڈھیر دیکھ کر اسے خیال آیا کہ سوبل کس قدر عجیب شخص ہے: غیر تعلیم یافتہ ہو کر بھی اتنا پڑھتا ہے۔ اس نے ایک بار پوچھا تھا: "سوبل، تم اتنا کیوں پڑھتے ہو؟" اور وہ کوئی جواب نہ دے سکا تھا۔ "تم نے کبھی کالج میں پڑھا ہے؟" اس نے پوچھا تھا، اور سوبل نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ جاننے کے لیے پڑھتا ہے۔ "لیکن کیا جاننے کے لیے؟" جفت ساز نے سوال کیا تھا، "اور کیوں جاننے کے لیے؟" سوبل کبھی وضاحت نہ کر سکا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اتنا زیادہ اس لیے پڑھتا تھا کہ وہ عجیب تھا۔

فیلڈ بیٹھ کر سانس درست کرنے لگا۔ سوبل بستر پر نیم دراز تھا اور اس کی پشت دیوار سے ٹکی ہوئی تھی۔ اس کی قمیص اور پتلون صاف ستھری تھی اور انگلیاں جفت سازی کے کام سے دور ہونے کے سبب عجیب طرح سے زرد تھیں۔ اس کا چہرہ پیلا اور اُترا ہوا تھا جیسے وہ دکان سے بھاگ آنے کے بعد سے مسلسل اسی کمرے میں بند ہو۔

"کام پر کب واپس آؤ گے؟" فیلڈ نے اس سے پوچھا۔

اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب سوبل نے چلّا کر کہا: "کبھی نہیں۔"

وہ بستر سے کود کر کھڑکی کی طرف چلا گیا اور ویران سڑک پر جھانکنے لگا۔

"کیوں واپس آؤں مَیں؟" وہ چلّایا۔

"میں تمھاری تنخواہ بڑھا دوں گا۔"

"کسے پروا ہے تمھاری تنخواہ کی!"

جفت ساز، جسے معلوم تھا کہ سوبل کو پروا نہیں، حیران تھا کہ اب کیا کہے۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو سوبل؟"

"کچھ نہیں۔"

"میں نے ہمیشہ تمھیں اپنے بیٹے کی طرح سمجھا ہے۔"

سوبل نے سختی سے اس کی تردید کی۔ "تو پھر تم مریم کے ساتھ باہر جانے کے لیے اجنبی لڑکوں کو کیوں ڈھونڈتے ہو، میرے بارے میں کیوں نہیں سوچتے؟"

جفت ساز کے ہاتھ پاؤں یخ ہو گئے۔ اس کی آواز اتنی بیٹھ گئی کہ وہ بول نہ سکا۔ آخر کار اس نے گلا صاف کیا اور پھٹی ہوئی آواز میں بولا: "میری بیٹی کو ایک پینتیس سالہ جفت ساز سے جو میرا ملازم ہے، کیا لینا ہے؟"

"تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ میں نے اتنا عرصہ تمھارے لیے کام کیا ہے؟" سوبل چلّایا۔ "اس حقیر تنخواہ پر میں نے اپنی زندگی کے پانچ سال اس لیے قربان کیے ہیں کہ تمھیں کھانا پینا اور سونے کی جگہ مل سکے؟"

Scanned with CamScanner

"پھر کس لیے؟" جفت ساز چیخا۔

"مریم کے لیے،" وہ بول اٹھا، "اس کی خاطر۔"

جفت ساز کی گویائی بحال ہوئی تو اس نے کہا: "سوبل، میں تنخواہ کی ادائیگی نقد کرتا ہوں"، اور خاموش ہو گیا۔ وہ اشتعال سے کھول رہا تھا لیکن اس کا ذہن بالکل صاف تھا اور اپنے آپ سے تسلیم کرنا پڑا کہ سوبل کے اس انداز میں سوچنے کا اسے شروع ہی سے علم تھا۔ اس نے یہ بات کبھی شعوری طور پر نہیں سوچی تھی لیکن محسوس ضرور کی تھی اور وہ اس سے خوف زدہ تھا۔

"مریم کو معلوم ہے؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"معلوم ہے۔"

"تم نے بتایا ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر اسے کیسے معلوم ہے؟"

"اسے کیسے معلوم ہے؟" سوبل نے کہا۔ "کیوں کہ وہ جانتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میں کون ہوں اور میرے دل میں کیا ہے۔"

فیلڈ کو جیسے یکایک بصیرت مل گئی۔ اپنی کتابوں اور تبصروں کی مدد سے سوبل نے کسی پیچیدہ طریقے سے مریم کو باور کرا دیا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اسے اس فریب پر بہت غصہ آیا۔

"سوبل، تم پاگل ہو،" اس نے تلخی سے کہا۔ "وہ کبھی تم جیسے بوڑھے اور بدصورت شخص سے شادی نہیں کرے گی۔"

غصے سے سوبل کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ جفت ساز پر برس پڑا لیکن پھر، اگرچہ اس نے اپنے طیش کو دبانے کی کوشش کی، اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ کتنی عجیب اور دردناک بات تھی کہ ایک پناہ گزیں، ایک پختہ عمر آدمی جسے اس کے مصائب نے گنجا اور بوڑھا کر دیا تھا، جو ہٹلر کی عقوبت سے بال بال بچا تھا، امریکا پہنچ کر اپنے سے نصف عمر کی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو جائے۔ اپنے دل کو تکلم سے آسودہ کرنے میں ناکام، کسی احتجاج کے بغیر، اس لڑکی کے عورت بننے کے انتظار میں پانچ سال تک روز و شب چمڑا کوٹتا رہے۔

"بدصورت میں نے تمھیں نہیں کہا،" اس نے نیم بلند آواز میں کہا۔

تب اسے احساس ہوا کہ اس نے جسے بدصورت کہا تھا وہ سوبل نہیں بلکہ سوبل سے شادی کے بعد مریم کی زندگی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کے لیے ایک عجیب اور دل کو جکڑ لینے والا دُکھ محسوس کیا، جیسے وہ سوبل کی، جو آخر ایک جفت ساز ہی تھا، دلھن بن چکی ہو اور اس کی زندگی میں، اپنی ماں کی زندگی سے زیادہ کچھ نہ ہو، اور اس کے بارے میں اس کے باپ کے سارے خواب، جن کے لیے اس نے دن رات مشقت کر کے اپنے دل کو تفکرات اور تکان سے تباہ کر تھا، بکھر کر رہ گئے ہوں۔ سوبل کھڑکی کے پاس کھڑا پڑھ رہا

تھا اور عجیب بات یہ تھی کہ پڑھتے وقت وہ جوان نظر آتا تھا۔

"وہ انیس سال کی ہے،" فیلڈ نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "شادی کے لیے یہ عمر ابھی کم ہے۔ ابھی دو سال اور اس سے شادی کی بات مت کرو۔ جب وہ اکیس سال کی ہو جائے تو بے شک اس سے بات کر لینا۔"

سوبل نے جواب نہیں دیا۔ فیلڈ رخصت ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترا لیکن جب وہ ایک بار باہر آگیا تو یخ رات اور سڑک کو سفید کرتی ہوئی برف کے باوجود اس کی چال میں استقامت تھی۔

لیکن اگلی صبح جب بوجھل دل کے ساتھ جفت ساز دکان کھولنے آیا تو اس نے جانا کہ اسے آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کا مددگار پہلے ہی سے فرمے پر بیٹھا اپنی محبت کی خاطر چمڑا کوٹ رہا تھا۔

**

(The First Seven Years : انگریزی عنوان)

برنارڈ مالامڈ

انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی

رشتہ ساز

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ نیویارک شہر کے ایک نواحی علاقے میں واقع، کتابوں سے بھرے ایک کمرے میں لیو فنکل رہتا تھا۔ وہ یشیوا یونیورسٹی میں یہودی فقہ کا طالب علم تھا۔ چھ برس کی تعلیم کے بعد اسے اس جون میں سند ملنے والی تھی۔ ایک ملاقاتی نے اسے بتایا تھا کہ اگر وہ شادی کر لے تو یہ مرحلہ نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ چوں کہ شادی کے امکانات موجود نہ تھے، لہٰذا دو دن کی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک رشتہ ساز پائنی سالزمان کو خط لکھا جس کا دوسطری اشتہار اس نے "فارورڈ" میں پڑھا تھا۔

سو ایک شب رشتہ ساز نے اس کے فلیٹ پر دستک دی جو ایک سنگی عمارت کی چوتھی منزل پر تھا۔ سالزمان کی بغل میں چمڑے کا سیاہ بستہ تھا جو کثرتِ استعمال سے گِھس چکا تھا۔ وہ اس پیشے میں ایک مدّت سے تھا۔ اس کا جسم منحنی لیکن ساخت باوقار تھی۔ اُس کے سر پر ایک پرانا ہیٹ اور بدن پر ایک بہت چھوٹا اور تنگ اوور کوٹ تھا۔ اس کے پاس سے مچھلی کی، جو اس کی پسندیدہ خوراک تھی، تیز بُو آ رہی تھی۔ گو اس کے چند دانت غائب تھے، تاہم اس کی قربت ناخوشگوار نہیں تھی۔ اس کی وجہ وہ خوش خلقی تھی جو اس کی غمناک آنکھوں سے عجیب عدم مطابقت رکھتی تھی۔ اس کی آواز، ہونٹ، داڑھی کی چونچ، استخوانی انگلیاں۔۔ سب خوش خلقی سے معمور تھیں لیکن لمحہ بھر غور سے دیکھنے پر اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں اداسی موج زن نظر آتی تھی۔ رشتہ ساز کی اِن خصوصیات سے لیو نے اطمینان محسوس کیا، حالاں کہ اس کے لیے صورتِ حال بڑی گمبھیر تھی۔

لیو نے اپنا مقصد فوراً ہی بیان کر دیا۔ اس نے رشتہ ساز کو بتایا کہ اس کا گھر کلیولینڈ میں ہے اور ماں

Scanned with CamScanner

باپ کے سوا دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ اس کے والدین نے نسبتاً دیر سے شادی کی تھی۔ وہ چھ برس سے اپنی پڑھائی میں منہمک رہا تھا جس کے نتیجے میں سماجی زندگی ۔۔ خاص کر لڑکیوں کی صحبت ۔۔ کے لیے وقت نہیں نکال پایا تھا۔ لہٰذا اس نے بہتر سمجھا کہ ایسے معاملات میں غلطی سے بچنے کے لیے کسی تجربہ کار شخص سے مشورہ کر لیا جائے۔ اس نے باتوں باتوں میں یہ بھی کہا کہ رشتہ سازی کا پیشہ قدیم اور باعزت ہے؛ یہودی برادری میں اس کی بڑی قدر ہے کیوں کہ اس کی بدولت ضروری کام قابلِ عمل ہو جاتا ہے اور مسرت میں رکاوٹ بھی نہیں پڑتی۔ علاوہ ازیں، اس کے اپنے والدین کی شادی بھی ایک رشتہ ساز ہی نے کرائی تھی۔ ان کی شادی مالی اعتبار سے فائدہ مند نہ سہی، کامیاب ضرور تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ مالی طور پر ان کی شادی اس لیے فائدہ مند نہ تھی کہ شادی کے وقت دونوں میں سے کسی کے پاس دولت یا جائیداد تھی ہی نہیں۔ سالزمان حیرانی سے اس کی باتیں سنتا گیا۔ اسے لیو کا انداز عذر خواہانہ لگا۔ تاہم بعد میں اسے اپنے پیشے پر فر محسوس ہونے لگا۔ یہ کیفیت اس نے برسوں سے محسوس نہیں کی تھی۔ وہ دل سے لیو کا مداح ہو گیا۔

دونوں نے مطلب کی بات شروع کی۔ کمرے میں ایک ہی خالی جگہ تھی، کھڑکی کے نزدیک، جہاں ایک میز پڑی تھی۔ کھڑکی سے شہر کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ لیو نے سالزمان کو یہاں بٹھا دیا۔ وہ خود اس کے پہلو میں اس طرح بیٹھا کہ دونوں کے چہرے مقابل تھے۔ اسے اپنے گلے میں ایک ناخوشگوار گدگدی سی محسوس ہو رہی تھی جسے وہ بمشکل روک پا رہا تھا۔ سالزمان نے جلدی جلدی اپنا بستہ کھول کر پرانے کارڈوں کا ایک پیکٹ نکالا اور انھیں اُلٹنے لگا۔ اس عمل کے دوران اس کے چہرے پر ایسا عجیب تاثر تھا کہ لیو کو جسمانی اذیت محسوس ہونے لگی۔ سو اس نے منھ پھیر کے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ گو ابھی فروری کا مہینا تھا لیکن جاڑے اختتام پر تھے۔ بہار آنے کی علامات اسے برسوں میں پہلی بار محسوس ہونے لگی تھیں۔ اس نے گول سفید چاند کو بادلوں میں سے گزرتے دیکھا جو آسمان پر جانوروں کی سی ہیئت میں تیر رہے تھے۔ وہ اَدھ کھلے منھ کے ساتھ دیکھتا گیا کہ چاند ایک بڑی مرغی میں سے گزر کر انڈے کی طرح برآمد ہوا۔ چشمے کے پیچھے سالزمان کی آنکھیں کارڈوں کی عبارت سے الجھی ہوئی تھیں لیکن وہ کن انکھیوں سے اس نوجوان کے باوقار چہرے کو بھی دیکھتا جاتا تھا۔ اس کی لمبی عالمانہ ناک، آگہی سے بوجھل بھوری آنکھیں، حساس لیکن تارکِ لذت ہونٹ اور رخساروں کی خاص بناوٹ دیکھ کر رشتہ ساز ایک طرح سے مطمئن تھا۔ اس نے کتابوں بھرے شیلفوں پر نظر دوڑاتے ہوئے ایک نرم اور آسودہ آہ بھری۔

لیو کی نظر کارڈوں پر پڑی تو اس نے گنا کہ وہ تعداد میں صرف چھ ہیں۔

"اتنے کم؟" اس نے مایوسی سے پوچھا۔

"تم یقین نہیں کرو گے کہ میرے دفتر میں کتنے کارڈ ہیں،" سالزمان نے جواب دیا۔ "دراز یں پہلے ہی اوپر تک بھر چکی ہیں۔ لہٰذا اب میں انھیں ایک پیپے میں رکھتا ہوں۔ لیکن کیا ایک ہونے والے ربی کے لیے ہر لڑکی مناسب ہے؟"

لیو اس بات پر شرما گیا۔ وہ پچھتا رہا تھا کہ خط کے ذریعے اپنے بارے میں سب کچھ ظاہر کر چکا ہے۔ اس نے رشتہ ساز کو اپنے معیار اور طلب سے آگاہ کر دینا مناسب جانا تھا، لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایسا کرنے میں وہ خود کو ضرورت سے زیادہ آشکار کر بیٹھا ہے۔

اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا: "آپ فائل میں ان کی تصویریں نہیں رکھتے؟"

"پہلا مرحلہ خاندان، جہیز کی رقم اور اس طرح کی دوسری معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔" سالزمان نے اپنے تنگ کوٹ کے بٹن کھول کر، کمر کرسی کی پشت سے ٹکا دی۔ "تصویروں کی باری اس کے بعد آتی ہے، ربی۔"

"مجھے لیو کہیے۔ میں ابھی ربی نہیں ہوں۔"

سالزمان نے کہا کہ وہ ایسا ہی کرے گا لیکن اس کے بجائے لیو کو ڈاکٹر کہہ کر مخاطب کرنے لگا، اور جب لیو کا دھیان اس کی طرف نہیں ہوتا تھا تو اسے پھر سے ربی کہہ کر پکارنے لگتا۔

اس نے اپنی سینگ کی کمانیوں والی عینک درست کی، آہستگی سے گلا صاف کیا اور ایک مشتاق آواز میں سب سے اوپر والا کارڈ پڑھنے لگا۔

"سوفی پی۔ عمر چوبیس سال۔ ایک سال کی بیوہ۔ بچے نہیں ہیں۔ ہائی اسکول کی تعلیم یافتہ۔ دو برس کالج میں بھی گزارے ہیں۔ باپ، جس کا تھوک کا عمدہ کاروبار ہے، آٹھ ہزار ڈالر دینے کا وعدہ کر رہا ہے۔ جائیداد بھی ہے۔ ماں کے رشتہ داروں میں ٹیچر اور ایک ایکٹر بھی ہے۔ خاندان سیکنڈ ایونیو میں اچھی طرح جانا پہچانا جاتا ہے۔"

لیو نے حیرت سے اس کی سمت دیکھا۔ "آپ نے کیا کہا، بیوہ؟"

"بیوہ ہونے کا مطلب برباد ہونا تو نہیں، ربی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ مشکل سے چار مہینے رہی ہے۔ وہ بیمار تھا۔ اس نے شادی کر کے غلطی کی۔"

"میں نے کسی بیوہ سے شادی کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔"

"اس کی وجہ تمھاری ناتجربہ کاری ہے۔ بیوہ اگر اس لڑکی کی طرح نوجوان اور صحت مند ہو تو شادی کے لیے موزوں ترین عورت ہوتی ہے۔ وہ ساری عمر تمھاری ممنون رہے گی۔ یقین کرو، اگر مجھے خود شادی کرنا پڑے تو کسی بیوہ ہی سے کروں گا۔"

لیو نے کچھ تامّل کے بعد نفی میں سر ہلا دیا۔

سالزمان نے تقریباً نامحسوس طور پر اپنے شانے مایوسی میں اچکائے اور کارڈ میز پر رکھ کر اگلی لڑکی کے کوائف پڑھنے لگا۔

"للی ایچ۔ ہائی اسکول کی ٹیچر۔ نوکری مستقل ہے، عارضی نہیں۔ اپنا ذاتی اکاؤنٹ اور نئی ڈاج گاڑی ہے۔ پیرس میں ایک سال رہ چکی ہے۔ باپ پینتیس برس سے ایک کامیاب دنداں ساز ہے۔ پیشہ ور مردوں میں دل چسپی رکھتی ہے۔ خاندان مکمل طور پر امریکی ہے۔ حیرت انگیز موقع۔

"میں اسے ذاتی طور سے جانتا ہوں،" سالزمان نے کہا۔ "کاش تم نے اس لڑکی کو دیکھا ہوتا۔ بالکل گڑیا ہے۔ حد درجہ ذہین بھی ہے۔ دن بھر کتابوں، تھیٹر، غرض ہر موضوع پر باتیں کر سکتی ہے۔ حالاتِ حاضرہ سے بھی باخبر ہے۔"

"آپ نے اس کی عمر نہیں بتائی۔"

"عمر؟" سالزمان نے بھنویں چڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس کی عمر بتیس برس ہے۔"

لیو نے کچھ تامل کے بعد کہا: "لڑکی کی عمر کچھ زیادہ نہیں؟"

سالزمان نے قہقہہ لگایا۔ "تمھاری عمر کتنی ہے، ربی؟"

"ستائیس برس۔"

"مجھے بتاؤ، آخر ستائیس اور بتیس میں کیا فرق ہے؟ میری اپنی بیوی مجھ سے سات برس بڑی ہے۔ مجھے اس سے کیا نقصان ہوا؟ اگر روتھ چائلڈ کی لڑکی تم سے شادی کرنا چاہے تو کیا تم اس کی عمر کی وجہ سے انکار کر دو گے؟"

"ہاں،" لیو نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

سالزمان اس کی نفی کو اثبات میں بدلنے لگا۔ "پانچ سال سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ہفتہ بھر اکٹھے رہنے کے بعد تم اس کی عمر بھول جاؤ گے۔ پانچ سال بڑے ہونے کا کیا مطلب ہے؟ یہی نا کہ وہ دنیا میں زیادہ دن سے ہے اور اپنے سے کم عمروں کی نسبت زیادہ جانتی ہے؟ اس لڑکی پر، خدا اسے امان میں رکھے، ماہ و سال رائیگاں نہیں ہوئے۔ ہر آنے والا سال اسے بہتر بنا رہا ہے۔"

"اسکول میں وہ کیا پڑھاتی ہے؟"

"لسانیات۔ تم اسے فرانسیسی بولتے سنو گے تو سمجھو گے موسیقی بج رہی ہے۔ میں اس پیشے میں پچیس برس سے ہوں۔ میری نظر میں یہ لڑکی تمھارے لیے بالکل موزوں ہے۔ یقین کرو، ربی، میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"اگلے کارڈ پر کون ہے؟" لیو نے ایک دم کہا۔

سالزمان نے ہچکچاتے ہوئے تیسرا کارڈ اٹھایا:

"رُوتھ کے۔ عمر انیس برس۔ آنرز کی طالبہ۔ باپ ڈاکٹر ہے، ماہر امراضِ شکم۔ شادی پر تیرہ ہزار نقد ملیں گے۔ باپ کی پریکٹس بہت عمدہ ہے۔ بہنوئی ملبوسات کا کاروبار کرتا ہے۔ خاص لوگ ہیں۔"

سالزمان کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنا ٹُرپ کا پتا ظاہر کر چکا ہو۔

"آپ نے کیا کہا، انیس سال؟" لیو نے دل چسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"پورے انیس سال۔"

"کیا وہ خوب صورت ہے؟" لیو نے شرماتے ہوئے سوال کیا۔ "میرا مطلب ہے دلکش؟"

سالزمان نے اپنی انگلیوں کے سروں کو بوسہ دیا۔ "بالکل گڑیا کی طرح۔ میں اس بات کی ضمانت

Scanned with CamScanner

دیتا ہوں۔ مجھے آج رات اس کے باپ کو بلانے دو، تمھیں پتا لگ جائے گا کہ خوب صورتی کیا ہوتی ہے۔"

لیکن لیو شک میں تھا۔ "آپ کو یقین ہے اس کی عمر یہی ہے؟"

"مکمل یقین ہے۔ اس کا باپ پیدائش کا سرٹیفکیٹ دکھا سکتا ہے۔"

"آپ کو یقین ہے اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ نہیں ہے؟" لیو مصر رہا۔

"کون کہتا ہے گڑبڑ ہے؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عمر کی امریکی لڑکی رشتہ ساز سے کیوں ملنے لگی؟"

سالزمان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اسی مقصد سے جس کے لیے تم ملے ہو۔"

لیو شرما گیا۔ "میرے پاس تو وقت کی کمی ہے۔"

تاہم سالزمان کو جلد ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ وہ تیزی سے وضاحت کرنے لگا۔ "لڑکی نہیں اس کا باپ آیا تھا۔ اسے اپنی بیٹی کے لیے بہترین شوہر درکار ہے، لہٰذا وہ خود تلاش کر رہا ہے۔ جب صحیح لڑکا مل جائے گا تو وہ لڑکی سے اس کا تعارف کرا دے گا۔ نوجوان اور ناتجربہ کار لڑکی پر بھروسا کرنے کی نسبت یہ طریقِ کار بہتر ہے۔ غالباً مجھے یہ سب کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آپ کے خیال میں یہ نوجوان خاتون محبت میں یقین نہیں رکھتی؟" لیو نے بے چینی سے پوچھا۔

سالزمان ہنسی پر قابو پاتے ہوئے سنجیدگی سے بولا: "محبت مناسب فریق کے ملنے پر ظاہر ہوتی ہے، اس سے پہلے نہیں۔"

لیو نے اپنے خشک ہونٹ وا کیے، لیکن کچھ بولا نہیں۔ سالزمان کو اگلے کارڈ پر نظر ڈالتے دیکھ کر اس نے چالاکی سے پوچھا: "اس کی صحت کیسی ہے؟"

"بہت عمدہ،" سالزمان کا سانس اکھڑنے لگا۔ "صرف داہنی ٹانگ میں ذرا سا لنگ ہے جو بارہ برس کی عمر میں کار کے ایک حادثے کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس کی خوب صورتی کے آگے یہ عیب کیا ہے۔"

لیو دل گرفتہ سا اٹھا اور کھڑکی کی سمت بڑھ گیا۔ وہ اس درجہ تلخی محسوس کر رہا تھا کہ رشتہ ساز کو بلانے پر دل ہی دل میں خود کو لعن طعن کرنے لگا۔ آخر اس نے انکار کر دیا۔

"کیوں؟" سالزمان نے آواز اونچی کرتے ہوئے اصرار کیا۔

"میں ماہرینِ شکم کو پسند نہیں کرتا۔"

"اس کے باپ کے پیشے سے تمھیں کیا لینا ہے؟ شادی کے بعد تمھیں اس کی کیا ضرورت رہے گی؟ کوئی ضروری نہیں کہ ہر جمعے کی شب تم اس کی مہمان داری کرو۔"

گفتگو کے اس رخ سے لیو کو شرم آنے لگی، سو اس نے سالزمان کو رخصت کر دیا، جو بوجھل، غم زدہ آنکھوں کے ساتھ گھر لوٹ گیا۔

گو رشتہ ساز کے جانے سے اسے خوشی ہوئی تھی لیکن اگلے دن وہ پھر اداس ہو گیا۔ اس نے اپنی اس

Scanned with CamScanner

کیفیت کو سالزمان کی ناکامی پر محمول کیا۔ لیو کو سالزمان جیسے لوگوں کی پروا نہیں تھی، لیکن جب اس نے کسی اَور بہتر رشتہ ساز سے ملنے میں جھجک محسوس کی تو یہ سوچنے لگا کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اسے شادی سازادارے کی سرے سے پرواہی نہیں۔ گو اس کے بلند بانگ دعوے اس کے برعکس تھے اور اسے اپنے ماں باپ کا احترام بھی تھا۔ اس خیال کو اس نے فوراً ہی ذہن سے نکال دیا، مگر پھر بھی بے چین رہا۔ وہ سارا دن ویرانوں میں گھومتا رہا؛ ایک بہت اہم ملاقات بھلا بیٹھا؛ اسے لانڈری میں کپڑے دینے یاد نہیں رہے؛ پھر براڈوے کے ایک کیفے سے بل چکائے بغیر ہی نکل پڑا جس کے لیے اسے دوبارہ لوٹنا پڑا۔ حد یہ ہے کہ اس نے اپنی لینڈلیڈی کو بھی نہ پہچانا جس نے ایک دوست کے ساتھ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے بڑے خلوص سے شام بخیر کہا تھا۔ تاہم، رات ہوتے ہوتے وہ کافی سنبھل گیا تھا۔ ایک کتاب نے اسے خیالوں سے پناہ دے دی۔

عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ لیو ابھی جواب نہ دے پایا تھا کہ پیشہ ور کیوپڈ، سالزمان، کمرے کے اندر تھا۔ اس کا چہرہ پژمردہ اور تاثرات گرسنہ تھے۔ ایسا لگ رہا تھا وہ لیو کے قدموں میں جان دے دے گا۔ پھر بھی اپنے عضلات کے کسی شعبدے سے وہ چہرے پر مسکراہٹ سجانے میں کامیاب رہا۔

"شام بخیر۔ میں ناخواندہ مہمان تو نہیں؟"

لیو نے نفی میں سر ہلایا۔ حالاں کہ وہ اسے دیکھ کر پریشان تھا لیکن چلے جانے کو نہ کہہ سکا۔

سالزمان نے خوش ہو کر اپنا بستہ میز پر رکھ دیا۔

"ربی، تمہارے لیے بڑی عمدہ خبر ہے۔"

"میں تم سے کہہ چکا ہوں مجھے ربی مت کہو، میں ابھی صرف طالب علم ہوں۔"

"تمہارے تفکرات ختم ہو چکے ہیں۔ میں نے فرسٹ کلاس لڑکی ڈھونڈلی ہے۔"

"اس موضوع کو چھوڑو۔" لیو نے عدم دل چسپی کا بہانہ کیا۔

"ساری دنیا ناچے گی تمہاری شادی پر۔"

"سالزمان، خدا کے لیے، بس کرو۔"

"لیکن سب سے پہلے میں اپنی توانائی بحال کروں گا،" سالزمان زیر لب بولا۔

اس نے اپنا بستہ کھول کر کاغذ کا ایک چکنا تھیلا نکالا جس میں ایک رول اور ایک چھوٹی سی تلی ہوئی مچھلی تھی۔ ایک تیز جھٹکے سے مچھلی کی کھال اتار کر وہ بڑے انہماک سے کھانے لگا۔ "سارا دن بھاگ دوڑ میں گزرتا ہے،" وہ بڑبڑایا۔

لیو اسے کھاتے ہوئے دیکھا کیا۔

"ایک ٹماٹر ہو گا؟" سالزمان نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔"

رشتہ ساز نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کھاتا رہا۔ جب وہ کھا چکا تو اس نے احتیاط سے میز صاف کی

Scanned with CamScanner

اور بچی کھچی مچھلی دوبارہ تھیلے میں رکھ لی۔ اس کی عینک پوش آنکھیں کمرے میں بھٹکتی رہیں اور آخر کتابوں کے ڈھیر کے درمیان رکھے گیس اسٹوو پر جم گئیں۔ وہ اپنا ہیٹ اٹھاتے ہوئے عاجزی سے بولا: "ایک پیالی چائے ملے گی، ربی؟"

ضمیر کا مارا لیو اٹھا اور چائے بنانے لگا۔ چائے کے ساتھ اس نے کچھ لوازمات بھی پیش کیے جس سے سالزمان بہت خوش ہوا۔

چائے کے بعد سالزمان کی توانائی اور خوش دلی لوٹ آئی۔

"اچھا، ربی، تم نے کل والی لڑکیوں پر مزید غور کیا؟"

"ضرورت نہیں پڑی۔"

"کیوں؟"

"ان میں سے کوئی بھی موزوں نہیں ہے۔"

"کون موزوں ہے پھر تمہارے لیے؟"

لیو نے اَن سنی کر دی، کیوں کہ وہ صرف ایک اُلجھا ہوا جواب ہی دے سکتا تھا۔

لیکن سالزمان نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ "تمھیں وہ ہائی اسکول کی ٹیچر یاد ہے جس کی میں نے بات کی تھی؟"

"بتّیس سال والی؟"

سالزمان کا چہرہ حیرت انگیز طور پر مسکراہٹ سے روشن ہو گیا۔

"اس کی عمر انتیس سال ہے۔"

لیو نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تین سال کم ہو گئے؟"

سالزمان عذر خواہی کرنے لگا۔ "میں نے آج ہی دنداں ساز سے بات کی ہے۔ اس نے تجوری میں رکھا ہوا سرٹیفکیٹ دکھایا ہے۔ پچھلے اگست میں وہ انتیس برس کی تھی۔ اس سلسلے میں ایک پہاڑی مقام پر، جہاں وہ تعطیلات گزارنے گئی تھی، ایک پارٹی بھی ہوئی تھی۔ اس کے باپ نے پہلی بار بات کی تو میں عمر لکھنا بھول گیا اور اسے بتّیس سال بنا بیٹھا۔ اب مجھے یاد آ گیا، بتّیس سال کی ایک، اور لڑکی تھی جو بیوہ ہے۔"

"وہی جس کی تم نے بات کی تھی؟ میرے خیال میں اس کی عمر تو چوبیس سال تھی۔"

"وہ اور ہے۔ دنیا میں بیواؤں کی کثرت کا ذمے دار میں تو نہیں ہوں۔"

"نہیں۔ بات یہ ہے کہ مجھے بیواؤں یا ٹیچروں سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔"

سالزمان نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ سینے پر رکھ لیے اور چھت کو تکتے ہوئے بڑے عجز سے بولا: "خدایا! ایسے آدمی سے میں کیا کہوں جسے اسکول ٹیچروں سے دل چسپی نہیں ہے۔ تو پھر کس قسم کی لڑکی چاہیے تمھیں؟"

Scanned with CamScanner

لیو شرما گیا، لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"پھر کیسی لڑکی چاہیے تمھیں؟" سالزمان کہتا رہا۔ "چار زبانیں بولنے والی ایک حسین لڑکی، جس کے ذاتی اکاؤنٹ میں دس ہزار ڈالر بھی ہیں، تمھیں ناپسند ہے۔ پھر اس کا باپ بھی بارہ ہزار دینے کا وعدہ کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ لڑکی کے پاس ایک نئی کار ہے، عمدہ قسم کے ملبوسات ہیں اور وہ ہر موضوع پر بات کر سکتی ہے۔ تمھارے عمدہ گھر اور بچوں کی ضامن ہے۔ تم زندگی ہی میں جنت سے کتنے قریب ہو جاؤ گے!"

"اگر اس میں یہ سب اوصاف ہیں تو اس کی شادی دس سال قبل کیوں نہ ہو گئی؟"

"اس لیے،" سالزمان بناوٹی ہنسی کے ساتھ بولا، "کہ اسے بہترین آدمی مطلوب ہے۔ وہ خاص قسم کا شوہر چاہتی ہے۔"

لیو چپ رہا۔ وہ اس طرح اپنے الجھنے پر حیران تھا۔ سالزمان کی باتوں نے للی ہرش میں اس کی دل چسپی بیدار کر دی تھی۔ اس نے اس سے ملاقات کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ جب رشتہ ساز نے محسوس کیا کہ اس کے مہیا کردہ حقائق پر وہ اتنی توجہ کر رہا ہے، اُسے یقین ہو گیا کہ وہ جلد ہی کسی سمجھوتے پر پہنچ جائیں گے۔

لیو سنیچر کی سہ پہر کو للی ہرشورن کے ساتھ ریور سائیڈ ڈرائیو پر گیا۔ اسے ہر قدم پر سالزمان کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی چال تیز اور باوقار تھی۔ اپنی الماری پر رکھے گرد آلود ہیٹ بکس سے اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد یہ ہیٹ نکالا تھا۔ کوٹ کو بڑی احتیاط سے برش کیا تھا۔ لیو کے پاس ایک چھڑی بھی تھی جو کسی دُور کے رشتے دار نے تحفتاً دی تھی، لیکن اس نے ترغیب پر قابو پاتے ہوئے اسے اٹھانے سے احتراز کیا۔ للی ایک پستہ قد، صاف ستھری عورت تھی۔ وہ بدصورت نہیں تھی۔ اُس کا لباس آتی ہوئی بہار سے مناسبت رکھتا تھا۔ وہ ہر قسم کے موضوع پر روانی سے بول سکتی تھی۔ لیو نے اس کے الفاظ کو تولا تو وہ حیرت انگیز طور پر پختہ کار نکلی۔ سالزمان کی یہ ایک اور جیت تھی جو اس کے خیال میں کہیں پاس ہی، شاید درختوں میں چھپا ہوا تھا اور جیبی آئینے سے اس خاتون کو ہدایات دے رہا تھا۔ یا شاید وہ جنگلوں اور چراگاہوں کا دیوتا پان تھا جو اپنے غیر مرئی راستے پر ان کے آگے رقص کرتا ہوا شادی کے نغمے گا رہا تھا، ان کی راہ میں جنگلی کلیاں بکھیر رہا تھا، ان کے قدموں میں رفاقت کا علامتی پھل، سُرخ انگور، بچھا رہا تھا، حالاں کہ رفاقت ابھی تک تو مفقود تھی۔

للی کے ایک جملے نے اُسے دنگ کر دیا۔ "میں مسٹر سالزمان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ عجیب شخص ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

لیو فیصلہ نہ کر پایا کہ کیا جواب دے، بس سر ہلا کر رہ گیا۔

للی نے شرماتے ہوئے سلسلہ کلام باہمت طور سے جاری رکھا۔ "میں بڑی ممنون ہوں کہ اس نے ہماری ملاقات کرا دی۔ آپ کیا کہتے ہیں؟"

اس نے خوش خلقی سے جواب دیا کہ وہ بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہے۔

"میرا مطلب ہے،" وہ تھوڑا سا ہنستے ہوئے بولی، اور اس کی یہ بات اچھے معنی میں تھی یا کم از کم بُری نہ ہونے کا تاثر دے رہی تھی، "آپ ہم دونوں کے اس طرح ملنے کو بُرا تو نہیں سمجھتے؟"

وہ لڑکی کی دیانت سے ناخوش نہیں تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اس تعلق کو درست بنیادوں پر استوار کرنا چاہتی ہے اور یہ بھی کہ ایسا کرنے کے لیے کافی تجربے اور ہمت کی ضرورت ہے۔ اس قسم کے آغاز کے لیے سابقہ تجربہ ناگزیر ہوتا ہے۔

لیو نے جواب دیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ سالزمان کا کام روایتی اور باعزّت ہے اور اکثر خاطر خواہ نتائج بر آمد نہ ہونے کے باوجود اس کی افادیت میں شبہ نہیں ہے۔

للی نے گہرا سانس لیتے ہوئے اتفاق کیا۔ وہ تھوڑی دیر چلتے رہے۔ آخر ایک طویل خاموشی کے بعد -- اور اس بار بوکھلائی ہوئی ہنسی کے ساتھ -- وہ بولی: "آپ ناراض تو نہ ہوں گے، میں ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔ سچ پوچھیے تو مجھے اس موضوع سے بڑی دل چسپی ہے۔" لیو کو یہ سن کر جھرجھری سی آ گئی لیکن للی بوکھلاہٹ کے ساتھ بولتی رہی۔ "آپ مذہب کی طرف کیسے آ گئے؟ میرا مطلب ہے یہ کسی اچانک تحریک کے تحت ہوا؟"

قدرے توقف کے بعد لیو نے آہستگی سے جواب دیا۔ "مذہبی قانون میں مجھے ہمیشہ سے دل چسپی رہی ہے۔"

"آپ نے اس میں خدا کو آشکار دیکھا؟"

لیو نے سر ہلا دیا اور موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ "مس للی، میں سمجھتا ہوں آپ نے پیرس میں کچھ وقت گزارا ہے؟"

"اوہ ربی لیو! سالزمان نے آپ کو بتایا ہو گا۔" لیو چونک اٹھا لیکن للی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "یہ تو برسوں پہلے کی بات ہے۔ اب تو میں بھول چکی ہوں۔ بس اتنا یاد ہے کہ بہن کی شادی پر مجھے لوٹنا پڑا تھا۔"

للی اس کی ذات سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا: "آپ نے خدا سے لو کب لگائی؟"

لیو اُسے دیکھتا رہ گیا۔ تب اس پر کھلا کہ وہ اس کے بارے میں نہیں بلکہ کسی اجنبی کی باتیں کر رہی ہے، کسی صوفی بلکہ پیغمبر کا ذکر کر رہی ہے جسے سالزمان نے اس کے خوابوں میں لا کھڑا کیا ہے جسے زندوں سے غرض ہے نہ مُردوں سے۔ لیو غصّے اور نقاہت سے کانپ اٹھا۔ ظاہر ہے کہ چال باز سالزمان نے للی کے ہاتھ سودا بیچا تھا، بالکل اسی طرح جیسے اُس کے ہاتھ۔ لیو کو ایک انتیس سالہ خاتون سے شناسائی کی توقع تھی لیکن للی کے سُتے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتے ہی اُسے پتا چل گیا تھا کہ مقابل عورت پینتیس سے اوپر کی ہے اور تیزی سے ڈھل رہی ہے۔ یہ صرف اپنے آپ پر قابو رکھنے کے باعث تھا کہ وہ اب

تک للی کے ساتھ تھا۔

وہ ملول آواز میں بولا: "میں کوئی باصلاحیت مذہبی شخص نہیں ہوں۔" ابھی وہ الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ شرم اور خوف نے اس پر غلبہ پا لیا۔ "میرے خیال میں،" وہ گمبھیر لہجے میں بولا، "میں خدا کی طرف محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ عدم محبت کے باعث آیا ہوں۔"

یہ اعتراف اس نے قدرے تلخی سے کیا کیوں کہ اُس کی بے ساختگی نے اسے دہلا دیا تھا۔

للی بڑبڑا گئی۔ لیو نے اپنے سر پر روٹیوں کے ڈھیر بطخوں کی طرح اُڑتے دیکھے جو اُن پَر لگی روٹیوں سے مختلف نہ تھے جنھیں نیند لانے کے لیے اس نے کل رات گِنا تھا۔ وہ تو خدا نے رحم کیا کہ برف باری ہونے لگی۔ لیو کو اس میں بھی سالزمان کا ہاتھ نظر آیا۔

وہ رشتہ ساز سے سخت برہم تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ جس لمحے کمرے میں آیا اسے باہر نکال دے گا۔ لیکن رشتہ ساز اس رات نہیں آیا۔ لیو کا غصہ اترا تو اس کی جگہ ایک ناقابلِ توجیہ ناامیدی نے لے لی۔ پہلے اسے خیال ہوا کہ اس کی وجہ للی سے اس کی مایوسی ہے، لیکن جلد ہی اس پر ظاہر ہو گیا کہ اس نے سالزمان سے معاملت اپنے ارادے کی حقیقی آگہی کے بغیر کی تھی۔ یہ انکشاف اس درجہ ہولناک تھا کہ مایوسی نے اسے مکمل طور پر جکڑ لیا۔ یہ دہشت ناک بصیرت اس نے للی سے ملاقات اور گفتگو کے نتیجے اخذ کی تھی۔ یہ للی کے تفتیشی سوالات تھے جن سے زِچ ہو کر اس نے حقیقت عیاں کر دی تھی، اور یہ انکشاف للی سے زیادہ خود اس کے لیے حیران کن تھا۔ خدا سے اپنے تعلق کی حقیقی نوعیت کا علم اسے للی سے مل کر ہی ہوا تھا۔ اسی ادراک کی بدولت اس نے جانا کہ اپنے ماں باپ کے سوا اس نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ یا شاید بات یوں تھی کہ وہ خدا سے جتنی محبت کر سکتا تھا اُتنی کرتا نہیں تھا، کیوں کہ اسے انسانوں سے محبت نہیں تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی ساری زندگی سامنے بے نقاب کھڑی ہے۔ اسے اپنا اصل روپ پہلی بار دکھائی دیا۔ آج اس نے جانا کہ وہ کسی کو چاہتا ہے نہ کوئی اسے۔ یہ انکشاف لاکھ تلخ سہی لیکن پوری طرح غیر متوقع نہیں تھا۔ گو وہ جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا، اس نے کسی نہ کسی طرح اپنے پر قابو رکھا اور ہاتھوں سے منھ چھپا کر رونے لگا۔

اگلا ہفتہ اس کی زندگی کے بدترین دنوں پر مشتمل تھا۔ کھانا ترک کر دینے سے اس کا وزن گھٹنے لگا۔ اس کی داڑھی بے ترتیب ہو کر بکھر گئی۔ اس نے سیمیناروں میں شرکت چھوڑ دی اور مطالعہ بھی تقریباً موقوف کر دیا۔ گو اپنے تعلیمی برسوں کے رائیگاں ہونے کا خیال اس کے لیے روح فرسا تھا، وہ یونیورسٹی چھوڑنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ اسے یہ تمام سال کتاب سے پھٹے ہوئے ورقوں کی طرح سارے شہر میں بکھرے نظر آئے۔ وہ یہ سوچ کر پریشان تھا کہ اس کے فیصلے کا والدین پر کتنا تباہ کن اثر ہو گا، لیکن اس نے اپنے آپ کو جانے بغیر زندگی گزار دی تھی اور سچائی اسے مذہبی کتابوں میں کبھی نہیں ملی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس سمت دیکھے۔ اس جان لیوا تنہائی میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس کا دُکھ بانٹتا۔ اس نے للی کے بارے میں اکثر سوچا لیکن ایک بار بھی نیچے جا کر اسے فون کرنے پر خود کو آمادہ نہ

Scanned with CamScanner

کر سکا- وہ بہت چڑچڑا اور جھکی ہو گیا تھا، خاص طور پر اپنی لینڈ لیڈی کے ساتھ جو ہر قسم کے ذاتی سوال کیا کرتی تھی- دوسری طرف، ناپسندیدگی محسوس کرتے ہوئے وہ سیڑھیوں پر اس سے ٹکرا جاتا اور پھر سرسری سی معافی مانگ لیتا، یہاں تک کہ وہ بے چاری اس سے بھاگنے لگی- تاہم اپنی حالت سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ یہودی ہے اور یہودی کو دکھ سہنا ہی پڑتا ہے؛ لیکن رفتہ رفتہ ہفتے کے اختتام تک وہ بحال ہو گیا اور حسب سابق اپنے مقصدِ حیات کی طرف لوٹ آیا- وہ آپ نامکمل سہی لیکن مقصد تو مکمل تھا- جہاں تک بیوی کی تلاش کا سوال ہے، اس کے جاری رکھنے کا خیال ہی سوہانِ روح تھا- پھر بھی اپنے وجود کی نئی پہچان کے ساتھ، اس میں کامیابی کا امکان ماضی کے مقابلے میں زیادہ تھا- شاید اب اس کے دل میں محبت بھی جاگ سکتی تھی اور اس محبت کو کوئی ہدف مل سکتا تھا، اور اس مقدس تلاش میں اسے سالزمان کی مدد کی ضرورت نہیں تھی-

رشتہ ساز، جو ہڈیوں کا ڈھانچا لگ رہا تھا، اپنی مضطرب نظروں کے ساتھ اسی شب پھر نمودار ہوا- وہ بہت شکستہ لگ رہا تھا جیسے اکتا دینے والے انتظار کی تصویر ہو، جیسے وہ سارا ہفتہ مس للی کے پہلو میں جم کے بیٹھا رہا ہو اور کبھی نہ آنے والے فون کا منتظر رہا ہو-

کھنکھارتے ہوئے وہ فوراً ہی مطلب پر آ گیا- "تمھیں لڑکی پسند آئی؟"

لیو کو غصہ آ گیا- وہ اسے سرزنش کیے بغیر نہ رہ سکا- "سالزمان، تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟"

سالزمان کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا، جیسے کسی نے اس کی رگوں سے سارا خون نچوڑ لیا ہو-

"کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ انتیس سال کی ہے؟" لیو نے اصرار کیا-

"میں قسم کھاتا ہوں---"

"وہ پینتیس سے ایک دن بھی کم نہیں- کم از کم پینتیس-"

"اس کی عمر کے بارے میں اتنے یقینی نہ بنو- اس کے باپ کا کہنا ہے---"

"چھوڑو اس کے باپ کو- سب سے بڑھ کر یہ کہ تم نے للی سے بھی جھوٹ بولا-"

"آخر کیا جھوٹ بولا ہے میں نے اس سے، بتاؤ تو سہی-"

"تم نے میرے بارے میں ایسی باتیں کہیں جو درست نہیں ہیں- تم نے مجھے بڑھا چڑھا کر پیش کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے مجھے اصل سے بھی کم جانا- اس کے ذہن میں بالکل کوئی اور شخص تھا- وہ مجھے کوئی معجزاتی صوفی سمجھ بیٹھی-"

"میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ تم مذہبی آدمی ہو-"

"مجھے معلوم ہے-"

سالزمان نے آہ بھری- "یہی تو میری کمزوری ہے،" اس نے اعتراف کیا- "میری بیوی کہتی ہے کہ مجھے یہ کام ترک کر دینا چاہیے، لیکن جب مجھے دو ایسے افراد ملتے ہیں جو آپس میں شادی کے لیے موزوں

ہوں تو میں خوشی کے مارے حد سے زیادہ بولنے لگتا ہوں۔" وہ کرب سے مسکرایا۔ "یہی وجہ ہے کہ میں غریب ہوں۔"

لیو کا غصہ اتر گیا۔ "خیر، سالزمان، بات اب ختم ہو چکی۔"

رشتہ ساز نے اپنی گرسنہ نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"کیا مطلب؟ اب تم شادی نہیں کرنا چاہتے؟"

"یہ بات نہیں،" لیو بولا، "لیکن اب میں نے طریقِ کار بدل دیا ہے۔ اب مجھے طے کرائی ہوئی شادی سے دل چسپی نہیں رہی۔ تکلف برطرف، میں شادی سے قبل محبت کی ضرورت محسوس کرنے لگا ہوں۔ یعنی میں شادی اُس سے کروں گا جس سے محبت ہو گی۔"

"محبت؟" سالزمان ہکا بکا رہ گیا۔ پھر لحہ بھر بعد بولا: "ہم یہودیوں کے لیے زندگی ہی محبت ہے۔ ہماری محبت عورتوں کے لیے نہیں، مذہبی کتاب میں لکھا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے، مجھے معلوم ہے،" لیو نے کہا۔ "میں نے اس کے بارے میں اکثر سوچا ہے۔ میں نے اپنے آپ سے حجت کی ہے کہ محبت کو جینے اور عبادت کرنے کا اضافی نتیجہ ہونا چاہیے نہ کہ آپ اپنا مقصد۔ تاہم اپنے لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنی طلب کا کوئی معیار بناؤں اور اسے حاصل کرنے کی جدوجہد کروں۔"

سالزمان نے جھرجھری لی لیکن جواباً بولا: "سنو ربی، تمھیں محبت درکار ہے تو اس کا بھی بندوبست ہو سکتا ہے۔ میرے پاس ایسی ایسی پریاں ہیں کہ تم دیکھتے ہی لٹو ہو جاؤ۔"

لیو ناخوشی سے مسکرایا۔ "تم سمجھے نہیں۔"

لیکن سالزمان نے اپنا بستہ عجلت سے کھولا اور ایک بڑا سا لفافہ برآمد کیا۔

"تصویریں،" لفافہ میز پر تیزی سے رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

لیو کہتا ہی رہ گیا کہ وہ تصویریں اپنے ساتھ لے جائے لیکن سالزمان تو جیسے ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

مارچ کا مہینا آ گیا۔ لیو کی زندگی معمول پر آ گئی تھی۔ وہ ابھی پوری طرح بحال نہیں ہوا تھا اور کمزوری محسوس کر رہا تھا، لیکن اب اس نے ایک بھرپور سماجی زندگی گزارنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ بلاشبہ ایسی زندگی کے لیے رقم درکار تھی لیکن وہ کفایت شعاری میں طاق تھا۔ اِدھراُدھر کا خرچ کم کر کے وہ یہ مد پوری کر سکتا تھا۔ اس دوران سالزمان کی لائی ہوئی تصویریں میز پر پڑی پڑی گرد کھاتی رہیں۔ کبھی کبھار مطالعے کے دوران یا چائے پیتے ہوئے اس کی نظر اس بڑے لفافے پر پڑ جاتی، لیکن وہ اسے کھولنے سے گریزاں ہی رہا۔

دن گزرتے رہے لیکن صنفِ مخالف سے کوئی قابلِ ذکر سماجی رابطہ پیدا نہ ہو سکا؛ اس جیسے شخص کے حالات میں ایسا ہونا مشکل بھی تھا۔ ایک صبح لیو بے دلی سے سیڑھیاں طے کر کے اپنے کمرے میں آیا اور کھڑکی سے باہر پھیلے ہوئے شہر کو دیکھنے لگا۔ حالاں کہ دن روشن تھا لیکن اس کے لیے شہر کا منظر تاریک تھا۔ وہ کچھ دیر سڑک پر تیز تیز چلتے لوگوں کو دیکھتا رہا، پھر بوجھل دل کے ساتھ کمرے میں لوٹ آیا۔ لفافہ

Scanned with CamScanner

میز پر رکھا تھا۔ اس نے ایک اچانک اضطراب کے ساتھ اسے کھول لیا اور ایک ہیجانی کیفیت میں آدھے گھنٹے تک وہیں کھڑا ان تصویروں کو دیکھتا رہا۔ آخر کار ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اس نے تصویریں رکھ دیں۔ دلکشی کے مختلف درجوں کی وہ تصویریں تعداد میں چھ تھیں لیکن غور سے دیکھنے پر سب کی سب للی جیسی تھیں۔ ان سب کی جوانیاں ڈھل چکی تھیں اور ان کی دلکش مسکراہٹوں کے پیچھے فاقہ کشی جھانک رہی تھی۔ ان میں کوئی بھی حقیقی شخصیت کی مالک نہیں تھی۔ ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود زندگی نے انھیں سرسری گزارا تھا۔ وہ فقط مچھلی کی بُو میں بسے ہوئے بستے میں رکھی تصویریں تھیں۔ مگر کچھ دیر بعد اس نے انھیں لفافے میں واپس رکھنا چاہا تو اسے ایک تصویر اَور نظر آئی۔ یہ اُس قسم کا اسنیپ شاٹ تھا جو مشینیں پچیس سینٹ میں نکالتی ہیں۔ لیو نے لمحہ بھر اسے دیکھا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

اس کے چہرے نے لیو کو حد درجہ متاثر کیا۔ پہلے پہل تو وہ اس کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ اس کے چہرے پر جوانی کا رنگ تھا، لیکن بہار کے پھولوں جیسی تازگی کے باوجود عمر عیاں تھی جس کے رائیگاں جانے کا احساس اس کی آنکھوں سے مترشح تھا جو بے انتہا مانوس ہونے کے باوجود اجنبی لگتی تھیں۔ لیو کو ایک مبہم سا احساس ہوا کہ وہ اس لڑکی سے پہلے بھی کہیں مل چکا ہے۔ لیکن کہاں؟ انتہائی کوشش کرنے پر بھی وہ یاد نہ کر پایا، حالاں کہ اس کا نام اسے یاد آتے آتے رہ گیا جیسے اُس کی اپنی تحریر میں کہیں پڑھ چکا ہو۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ ورنہ وہ اسے ضرور یاد رہتی۔ اسے خوب معلوم تھا کہ اس کشش کی وجہ لڑکی کا غیر معمولی حسن نہیں، حالاں کہ اس کا چہرہ خاصا دلکش تھا، جس سے لیو متاثر ہوا تھا۔ یہ اس لڑکی کی کوئی اَور بات تھی۔ خدوخال کے موازنے میں تو تصویروں کی چند لڑکیاں اس سے بہتر ہی ہوں گی، لیکن فقط وہی تھی جو اس کے دل میں آ بسی تھی، وہاں رہ چکی تھی، یا رہنا چاہتی تھی، بلکہ اب تک اس کے بغیر جینے پر متاسف تھی۔ اس نے گہرے دُکھ سہے تھے، اور یہ بات ان جھجکتی ہوئی آنکھوں کی گہرائیوں میں پڑھی جا سکتی تھی؛ یہ بات اس روشنی سے عیاں تھی جو اس کے وجود کے ارد گرد پھیلی ہوئی تھی، اس کے باطن سے اُبھر رہی تھی، امکانات کے در کھول رہی تھی۔ اس لڑکی کے اطوار اس کے اپنے تھے۔ اسی عورت کی آرزو تھی اسے! اس کو لگاتار دیکھتے رہنے سے لیو کا سر چکرانے لگا، اس کی آنکھیں درد کرنے لگیں۔ پھر جیسے اس کے ذہن میں ایک بے نام سی دُھند بھر گئی۔ اسے لڑکی سے خوف آنے لگا۔ اسے احساس ہوا کہ لڑکی کسی نہ کسی طرح بدی سے وابستہ ہے۔ لیو نے کانپتے ہوئے سوچا: ہم سب کے ساتھ بہرحال یہی ہوتا ہے۔ اپنے ہیجان پر قابو پانے کو اس نے تھوڑی سی چائے دم کی اور بغیر شکر ڈالے پینے لگا۔ ابھی اس نے چائے ختم نہ کی تھی کہ ہیجان نے اسے پھر آلیا۔ وہ اس چہرے کو پھر سے دیکھنے لگا۔ اسے ایسا لگا کہ صرف یہی چہرہ ہے جو اس کے لیے ہے، یہی لڑکی ہے جو اسے سمجھ سکتی ہے، اس کے مقصدِ حیات کو پانے میں مدد کر سکتی ہے، اور شاید اس سے محبت بھی کر سکتی ہے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ سالزمان نے اسے مسترد کر کے اپنے پیپے میں کیوں رکھ چھوڑا، لیکن اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ اس لڑکی کی تلاش میں اسے فوراً جانا ہے۔

لیو دوڑتا ہوا نیچے آیا۔ اس نے برونکس کے علاقے کی ٹیلیفون ڈائرکٹری اٹھائی اور سالزمان کے گھر

کا پتا ڈھونڈنے لگا۔ لیکن وہاں سالزمان کے نام کا اندراج تھا نہ اس کے دفتر کا۔ اس کا نام ٹین ہیٹن کی ڈائرکٹری میں بھی مفقود تھا۔ وہ تو کھو اسے یاد آ گیا کہ سالزمان کا پتا اس نے کاغذ کے کسی پُرزے پر لکھ رکھا ہے۔ "فارورڈ" کے ذاتی کالموں میں اشتہار پڑھ کر اس نے پتا لکھ لیا تھا۔ وہ بھگدڑ مچاتا ہوا پھر اوپر آیا اور اپنے کاغذات کھنگالنے لگا، لیکن بے سود۔ صورت حال بڑی مایوس کن تھی۔ عین اس وقت جب رشتہ ساز کی ضرورت تھی وہ گم تھا۔ خوبی قسمت سے اسے اپنا بٹوا دیکھنے کا خیال آ گیا جس میں ایک کارڈ کی پشت پر سالزمان کا پتا مل گیا۔ لیکن فون نمبر یہاں بھی نہیں تھا۔ لیو کو یاد آیا کہ سالزمان سے ابتدائی رابطہ خط کے ذریعے ہوا تھا۔ اس نے کوٹ پہنا اور گول ٹوپی پر ہیٹ منڈھتے ہوئے زیرِ زمین ریلوے کی طرف بھاگا۔ برونکس کے آخری سرے تک وہ اپنی نشست کے کنارے پر بیٹھا ہوا گیا۔ راستے میں کئی بار اس کا جی چاہا کہ لڑکی کی تصویر نکال کر اپنی ذہنی تصویر سے ملائے لیکن اس سے باز رہتے ہوئے اس نے تصویر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب ہی میں رہنے دی۔ وہ اسے اتنا قریب پا کر مطمئن تھا۔ اس نے گاڑی کے پوری طرح رکنے کا بھی انتظار نہ کیا اور چھلانگ لگا کر اتر پڑا۔ سالزمان کی مشتہر کردہ گلی اس نے جلد ہی معلوم کر لی۔

اس کی مطلوبہ عمارت اسٹیشن سے ایک بلاک سے بھی کم فاصلے پر تھی۔ لیکن وہ دفتری عمارت نہ تھی۔ وہ کوئی اسٹور بھی نہ تھی جہاں کرائے پر دفتر لیا جا سکے۔ وہ بہت پرانی اقامتی عمارت تھی۔ گھنٹی کے نیچے سالزمان کا نام ایک گندے سے کاغذ پر پنسل سے لکھا ہوا تھا۔ تین اندھیری منزلیں طے کر کے لیو اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس کی دستک پر ایک دُبلی پتلی، دق زدہ، کھچڑی بالوں والی عورت باہر آئی جس کے پیروں میں معمولی قسم کے سلیپر تھے۔

"جی؟" اس نے میکانکی انداز میں پوچھا۔ اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ لیو قسم کھا سکتا تھا کہ اس عورت کو بھی اس نے کہیں دیکھا ہے، لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ فقط فریبِ نظر ہے۔

"سالزمان یہاں رہتا ہے؟ پائنی سالزمان، رشتہ ساز؟"

وہ ایک منٹ تک اسے دیکھتی رہی۔ "بالکل۔"

لیو کو پریشانی ہونے لگی۔ "گھر پر ہے؟"

"نہیں۔" عورت کا منہ اگرچہ ابھی وا تھا مگر اس کے پاس کہنے کو اَور کچھ نہ تھا۔

"بڑا ضروری کام ہے۔ آپ بتا سکتی ہیں اس کا دفتر کہاں ہے؟"

"ہوا میں۔" اس نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ کا مطلب ہے اس کا کوئی دفتر نہیں؟" لیو نے پوچھا۔

"اس کا دفتر اس کی جُرابوں میں ہے۔"

لیو نے اندر جھانکا۔ وہاں اندھیرا اور گندگی تھی۔ کُل ایک ہی کمرہ تھا جسے اَدھ کھلے پردے نے دو حصّوں میں بانٹ رکھا تھا۔ کمرے کے آخری سرے پر لوہے کا ایک پرانا پلنگ پڑا تھا۔ اِدھر والے حصّے میں ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، پرانی الماریاں، تین ٹانگوں والی ایک میز اور برتنوں کا ڈھیر، بلکہ کچن کا سارا سامان

Scanned with CamScanner

تھا۔ لیکن وہاں کہیں سالزمان کا کوئی سراغ تھا نہ اس کے جادوئی پہیے کا۔ غالباً یہ بھی لیو کے تصور کی کارفرمائی تھی۔ مچھلی تلنے کی خوشبو نے اسے پھر شک میں ڈال دیا۔

"وہ کہاں ہے؟" اس نے اصرار کیا۔ "مجھے تمہارے شوہر سے ضروری کام ہے۔"

آخرکار وہ گویا ہوئی۔ "کون کہہ سکتا ہے وہ کہاں ہے۔ ہر نئے خیال کے ساتھ وہ ایک مختلف سمت میں چل پڑتا ہے۔ اپنے گھر جاؤ۔ وہ تمہیں مل جائے گا۔"

"اسے بتا دینا لیو فنکل آیا تھا۔"

عورت نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

لیو مایوسی سے نیچے آیا۔

لیکن سالزمان اس کے دروازے پر منتظر تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

لیو اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا لیکن ساتھ ہی بے حد خوشی بھی محسوس کرنے لگا۔

"تم مجھ سے پہلے کیسے پہنچ گئے؟"

"بھاگتا ہوا آیا ہوں۔"

"اندر آجاؤ۔"

لیو نے چائے بنائی اور سینڈوچز کے ساتھ پیش کی۔ ابھی وہ چائے پی رہے تھے کہ لیو نے عقب سے تصویروں والا لفافہ نکال کر اسے تھما دیا۔

سالزمان نے گلاس رکھتے ہوئے متوقع انداز میں پوچھا: "کوئی پسند آئی؟"

"ان میں سے نہیں۔"

رشتہ ساز کا منہ لٹک گیا۔

"میری پسند یہ ہے،" لیو نے اسنیپ شاٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

سالزمان نے چشمہ چڑھایا اور کپکپاتے ہاتھوں سے تصویر تھام لی۔ اس کا رنگ فق ہو گیا اور منہ سے چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا؟" لیو نے چلا کر پوچھا۔

"معاف کرنا یہ تصویر غلطی سے آگئی۔ یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔"

سالزمان نے لفافہ تیزی سے بستے میں رکھ لیا اور اسنیپ شاٹ جیب میں۔ وہ برق رفتاری سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

لمحہ بھر مفلوج رہنے کے بعد لیو اس کے تعاقب میں بھاگا اور راہداری میں اسے جا لیا۔ لینڈ لیڈی انھیں دیکھ کر ہسٹیریائی انداز میں چیخنے لگی، لیکن وہ دونوں بے خبر رہے۔

"سالزمان، تصویر مجھے لوٹا دو۔"

"نہیں۔" اس کی آنکھوں میں ہولناک کرب تھا۔

Scanned with CamScanner

"اچھا تو پھر بتاؤ یہ تصویر کس کی ہے۔"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔ معافی چاہتا ہوں۔"

اس نے چلنے کا ارادہ کیا لیکن لیو نے خود فراموشی کے عالم میں اسے پکڑ لیا اور جھٹکے دینے لگا۔

"پلیز،" سالزمان گڑگڑایا، "پلیز!"

لیو نے شرمندہ ہو کر اسے چھوڑ دیا۔ "مجھے بتاؤ وہ کون ہے،" اس نے التجا کی۔ "میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے۔"

"وہ تمہارے لیے موزوں نہیں ہے۔ وہ ایک آزاد لڑکی ہے، آزاد اور بے حیا۔ وہ ایک ربی کی بیوی نہیں بن سکتی۔"

"آزاد سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"جانوروں کی طرح۔ کتوں کی طرح۔ اس نے اپنی غربت کو گناہ سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ میرے لیے مر چکی ہے۔"

"خدا کا واسطہ، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں تمہیں اس سے نہیں ملا سکتا،" سالزمان چلّایا۔

"تم اتنے ہیجان میں کیوں ہو؟"

"پوچھتے ہو ہیجان میں کیوں ہوں؟" سالزمان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "وہ میری بچی ہے۔ میری اسٹیلا ہے۔ خدا کرے وہ دوزخ کا ایندھن بنے۔"

لیو تیزی سے اوپر آیا اور منہ ڈھانپ کر لیٹ گیا۔ منہ ڈھانپے ڈھانپے وہ اپنی زندگی پر غور کرنے لگا۔ گو اسے جلد ہی نیند آ گئی مگر وہ لڑکی اس کے ذہن میں بسی رہی۔ جب وہ جاگا تو گزرے ہوئے واقعات یاد کر کے اپنا سینہ پیٹنے لگا۔ اس نے لڑکی کو بھولنے کے لیے دعائیں مانگیں لیکن بے سود۔ آنے والے اذیت ناک دنوں میں اس نے اسے پیار نہ کرنے کی بے انت کوششیں کیں لیکن کامیابی سے خائف ہو کر انہیں ترک کر دیا۔ پھر اس نے لڑکی کو خیر میں اور خود کو خدا کے قالب میں ڈھالنا چاہا۔ یہ تصور باری باری اسے پریشان اور ارفع کرتا رہا۔

براڈوے کے ایک کیفے میں سالزمان سے اچانک ملاقات تک شاید اسے علم نہیں تھا کہ وہ حتمی نتیجے پر پہنچ چکا ہے۔ سالزمان ایک دور افتادہ میز پر بیٹھا مچھلی کی بچی کھچی ہڈیاں چوس رہا تھا۔ وہ بہت دل گرفتہ اور نحیف نظر آ رہا تھا جیسے ابھی ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔

پہلی نظر میں سالزمان اسے نہ پہچان سکا۔ لیو نے داڑھی بڑھا لی تھی اور اس کی آنکھیں آگہی سے بوجھل تھیں۔

"سالزمان،" اس نے کہا۔ "آخر مجھے محبت ہو ہی گئی۔"

"تصویر سے کون محبت کر سکتا ہے!" رشتہ ساز نے اس کا مذاق اڑایا۔

Scanned with CamScanner

"یہ ناممکن تو نہیں ہے۔"

"اگر تم اس سے محبت کر سکتے ہو تو پھر کسی سے بھی کر سکتے ہو۔ آؤ، تمھیں چند نئی لڑکیوں کے بارے میں بتاؤں۔ انھوں نے تصویریں بھی بھیجی ہیں۔ ایک تو بالکل گڑیا ہے۔"

"مجھے تو بس وہی چاہیے۔"

"بے وقوف مت بنو، ڈاکٹر۔ اُس کا خیال چھوڑ دو۔"

"مجھے اُس سے ملا دو، سالزمان، شاید میں کسی کام آسکوں،" لیو نے عاجزانہ کہا۔

سالزمان نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا، اور اس کے تاثرات سے لیو نے جان لیا کہ معاملہ اب طے ہے۔

تاہم کیفے سے نکلتے وقت وہ اس تکلیف دہ شبہے میں مبتلا تھا کہ یہ سب کچھ سالزمان کی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔

لیو کو خط کے ذریعے بتایا گیا کہ لڑکی ایک خاص موڑ پر اسے ملے گی، اور ایک بہار کی شب وہ بجلی کے کھمبے تلے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ لیو کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا گلدستہ تھا۔ اسٹیلا بجلی کے کھمبے سے لگی ہوئی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کا لباس سفید اور جوتے سُرخ تھے، اور یہ لیو کی توقع کے عین مطابق تھا۔ حالاں کہ ایک تکلیف دہ لمحے میں اس نے تصور کیا تھا کہ لباس سُرخ اور جوتے سفید ہوں گے۔ اسٹیلا بے سکونی اور جھجک کے عالم میں تھی۔ دور سے لیو نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں بالکل اپنے باپ پر ہیں اور ان میں معصومیت ہی معصومیت ہے۔ اس لڑکی میں اسے اپنی نجات دکھائی دی۔ فضا وائلن کی صداؤں سے معمور تھی اور آسمان روشن شمعوں سے۔ پھولوں کو آگے بڑھائے ہوئے لیو اُس کی طرف دوڑ پڑا۔

موڑ کے اُدھر، دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے، سالزمان رفتگاں کے لیے دعائیں پڑھ رہا تھا۔

**

(انگریزی عنوان : The Magic Barrel)

Scanned with CamScanner

برنارڈ مالامڈ

انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی

نوکرانی کے جوتے

نوکرانی اپنا نام دربان کی بیوی کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ کوئی مستقل کام ڈھونڈ رہی ہے۔ وہ کوئی بھی کام کر لے گی لیکن کسی عمر رسیدہ عورت کے لیے کام نہ کرنے کو ترجیح دے گی۔ تاہم اگر مجبوری ہوئی تو کر لے گی۔ وہ پینتالیس سال کی تھی مگر اس سے زیادہ کی نظر آتی تھی۔ اس کا چہرہ مضمحل مگر بال سیاہ تھے اور اس کی آنکھیں اور لب خوب صورت تھے۔ اس کے چند ہی دانت سالم تھے۔ جب وہ ہنستی تو اس کے منھ کے ارد گرد سراسیمگی کا تاثر ہوتا۔ اگرچہ اس سال روم میں اکتوبر کا آغاز سرد تھا اور جوز فروش اپنی پراتوں پر، جن میں لکڑی کے کوئلے دہک رہے تھے، جھکے ہوئے تھے، لیکن نوکرانی نے صرف ایک سیاہ گھسا ہوا سوتی لباس پہن رکھا تھا جس کے بائیں طرف نیچے کے حصے میں، جہاں کولھے پر سے کوئی دو انچ بخیہ اُدھڑ گئی تھی، اس کے زیر جامے کو عیاں کرتی ہوئی ایک جھری تھی۔ اس نے اس جھری کو کئی بار سیا تھا لیکن یہ لمحہ اُن میں سے ایک تھا جب یہ پھر کُھل گئی تھی۔ اس کی بھاری مگر تراشیدہ ٹانگیں عریاں تھیں اور دربان کی بیوی سے باتیں کرتے ہوئے اس نے گھریلو چپل پہن رکھے تھے۔ وہ اسی سڑک پر آگے رہنے والی ایک سنیورا کے لیے ایک دن کی دُھلائی کر کے آئی تھی اور اپنے جوتے ایک کاغذی تھیلے میں ڈال رکھے تھے۔ اس پہاڑی سڑک پر تین نسبتاً نئی اقامتی عمارتیں تھیں اور وہ ہر ایک میں اپنا نام دے آئی تھی۔

دربان کی بیوی جو گٹھے ہوئے بدن کی عورت تھی اور جس نے عمارت میں رہ چکے ایک انگریز خاندان سے ملا ہوا ٹوئیڈ کا سایہ پہن رکھا تھا، بولی کہ وہ نوکرانی کو یاد رکھے گی، مگر پھر وہ بھول گئی؛ وہ بھولی

رہی یہاں تک کہ پانچویں منزل کے ایک آراستہ گھر میں ایک امریکی پروفیسر رہنے آیا اور اس نے اسے کوئی نوکرانی ڈھونڈنے کے لیے کہا۔ دربان کی بیوی نواح سے ایک سولہ سالہ لڑکی کو لے آئی جو حال ہی میں امبریا سے آئی تھی اور اپنی خالہ کے ساتھ آئی۔ لیکن پروفیسر کو، جس کا نام اور لینڈو کرانز تھا، خالہ کی طرف سے لڑکی کی بعض خوبیاں بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا طور پسند نہیں آیا، سو اس نے لڑکی کو لوٹا دیا۔ اس نے دربان کی بیوی کو بتایا کہ اسے کوئی ایسی عمر رسیدہ عورت چاہیے جس کی اسے فکر نہ کرنی پڑے۔ تو دربان کی بیوی کو نوکرانی کا خیال آیا جو اپنا نام پتا دے گئی تھی۔ وہ نوکرانی کے گھر گئی جو ویا آپیا آنتیکا پر زمیں دوز قبرستان کے پاس واقع تھا، اور اسے بتایا کہ ایک امریکی کو دن کے وقت کام کرنے والی نوکرانی چاہیے۔ وہ اس کا نام امریکی کو بتا دے گی بشرطے کہ نوکرانی بھی اس کے صلے میں کچھ کرنے کو تیار ہو۔ نوکرانی نے، جس کا نام روزا تھا، کندھے اُچکائے اور سرد مہری سے نیچے سڑک کو دیکھنے لگی۔ اس نے کہا کہ دربان کی بیوی کو دینے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔

"ذرا دیکھو تو، میں کیا پہنے ہوں،" وہ بولی۔ "اس کاٹھ کباڑ کے ڈھیر کو دیکھو۔ کیا تم اسے گھر کہہ سکتی ہو؟ میں یہاں اپنے بیٹے اور اس کی کتیا بیوی کے ساتھ رہتی ہوں جو میرے منھ میں جانے والے شوربے کا ایک ایک چمچا گنتی ہے۔ وہ دونوں مجھے غلاظت سمجھتے ہیں اور میرے پاس کچھ ہے تو صرف غلاظت۔"

"اس صورت میں تو میں تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکتی،" دربان کی بیوی نے کہا۔ "مجھے بھی اپنا اور اپنے شوہر کا خیال کرنا ہے۔" مگر وہ بس اسٹاپ تک جا کر لوٹ آئی اور نوکرانی سے کہا کہ اگر وہ اپنی پہلی تنخواہ میں سے پانچ ہزار لیرے دینے کو تیار ہو تو وہ اسے امریکی کے پاس رکھوا دے گی۔

"وہ تنخواہ کتنی دے گا؟" نوکرانی نے دربان کی بیوی سے پوچھا۔

"میں اٹھارہ ہزار ماہوار کے لیے کہوں گی۔ تم اس سے کہنا کہ تمھیں دو سو لیرے روزانہ بس کے کرائے میں خرچ کرنے پڑتے ہیں۔"

"یہ تو تقریباً سچ ہے،" روزا بولی۔ "چالیس ایک طرف کے لگیں گے اور چالیس واپسی کے۔ لیکن اگر وہ مجھے اٹھارہ ہزار دے گا تو میں تمھیں پانچ ہزار دے دوں گی، بشرطے کہ تم یہ لکھ دو کہ مجھے صرف اتنا ہی دینا ہے۔"

"میں لکھ دوں گی،" دربان کی بیوی نے کہا اور نوکرانی کو امریکی پروفیسر کے ہاں رکھوا دیا۔

اورلینڈو کرانز ایک ساٹھ سالہ زود حس شخص تھا۔ اس کی آنکھیں ہلکی خاکستری، دہانہ چوڑا اور نوک دار ٹھوڑی دو حصّوں میں منقسم تھی۔ اس کا گول سر بالوں سے مبرّا تھا۔ اس کا بالائی جسم دُبلا تھا مگر پیٹ تھوڑا سا باہر کو نکلا ہوا تھا۔ وہ کسی حد تک عجیب نظر آنے والا آدمی ہے مگر قانون کے مضمون میں سند کی حیثیت رکھتا ہے، دربان کی بیوی نے نوکرانی کو بتایا تھا۔ پروفیسر اپنی اسٹڈی میں میز پر بیٹھا سارا دن لکھا کرتا تھا، تاہم ہر آدھ گھنٹے بعد گھبرائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر نظر ڈالنے کو کسی نہ کسی بہانے اٹھ

جاتا- اسے یہ فکر لگی رہتی کہ معاملات کیسے چل رہے ہیں اور وہ اکثر اپنی اسٹڈی سے باہر نکل آیا کرتا- وہ روزا کو کام کرتے دیکھتا اور پھر اندر جا کر لکھنے لگتا- آدھ گھنٹے بعد پھر باہر آتا اور بناوٹی طور پر باتھ روم میں ہاتھ دھونے یا ایک گلاس ٹھنڈا پانی پینے جاتا مگر در حقیقت یہ دیکھتا کہ وہ کیا کر رہی ہے- روزا تیزی سے کام کرتی تھی، خاص طور پر جب وہ دیکھ رہا ہوتا- پروفیسر کا خیال تھا کہ روزا ناخوش لگتی ہے مگر یہ اُس کا مسئلہ نہیں تھا- وہ جانتا تھا کہ اِن لوگوں کی زندگیاں مصائب سے بھری ہیں بلکہ خستہ و خراب ہیں؛ ان سے لاتعلقی ہی بھلی-

اٹلی میں یہ پروفیسر کا دوسرا سال تھا- پہلا سال اس نے مِیلان میں گزارا تھا، اور اب دوسرے سال کے لیے روم میں تھا- اس نے تین بیڈروم کا ایک بڑا سا اپارٹمنٹ کرائے پر لیا تھا جس میں سے ایک کو وہ اسٹڈی کے طور پر استعمال کرتا تھا- دوسرے بیڈروم اس کی بیوی اور بیٹی کے لیے تھے جو اگست میں عارضی طور پر امریکا چلی گئی تھیں- ان کے واپس آنے میں زیادہ دن نہیں تھے- اس نے روزا کو بتایا تھا کہ جب خواتین آجائیں گی تو وہ اسے کلُ وقتی طور پر رکھ لے گا؛ نوکرانی کا کمرہ موجود ہے، جہاں وہ سو سکتی ہے- در حقیقت اس کمرے کو وہ پہلے ہی اپنے کمرے کے طور پر استعمال کر رہی تھی، حالاں کہ اپارٹمنٹ میں وہ صرف نو بجے سے چار بجے تک رہتی تھی- روزا نے کل وقتی بندوبست سے اتفاق کیا کیوں کہ اس کا مطلب مفت کھانے کے علاوہ اپنے بیٹے اور اس کی سنگ چہرہ بیوی کو کرایہ ادا کرنے سے نجات بھی تھا-

جب تک مسز کرانز اور بیٹی آتیں، خریداری اور باورچگی روزا ہی کو کرنی تھی- وہ صبح آکر پروفیسر کے لیے ناشتہ بناتی اور ایک بجے دوپہر کا کھانا- رات کا کھانا تیار کرنے کے لیے، جو وہ چھ بجے کھاتا تھا، اس نے چار بجے کے بعد بھی ٹھہرنے کی پیش کش کی مگر وہ رات کا کھانا باہر کھانے کو ترجیح دیتا تھا- خریداری کے بعد ایک گیلے کپڑے کو لکڑی سے دھکیلتے، سنگ مرمر کے فرش کو پوچھا لگاتے ہوئے وہ گھر کی صفائی کرتی، حالاں کہ پروفیسر کو فرش خاص گرد آلود نہیں لگتا تھا- وہ اس کے کپڑے دھوتی اور استری کرتی- ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں تیزی سے جاتے ہوئے اپنے چپلوں سے کِلپ کلاپ کرتی وہ اپنا کام خوش اسلوبی سے نمٹاتی اور اکثر گھر جانے کے وقت سے کم و بیش گھنٹا بھر پہلے فارغ ہو جاتی- سو وہ آرام کرنے نوکرانی کے کمرے میں چلی جاتی اور وہاں "تیمپو" یا "اپوکا" اخبار پڑھتی، یا بعض اوقات محبت کی کوئی باتصویر داستان دیکھتی جس میں ہر تصویر کے نیچے آڑے الفاظ چھپے ہوتے- اکثر وہ اپنا بستر بچھا لیتی اور سردی سے بچنے کے لیے کمبل اوڑھ کر لیٹی رہتی- موسم بارانی ہو گیا تھا اور اب اپارٹمنٹ تکلیف دہ طور پر سرد رہتا تھا- اس اقامتی عمارت کے اجتماعی نظام میں گھروں کو پندرہ نومبر سے پہلے گرم نہ کرنے کا رواج تھا، اور اگر سردی اس سے پہلے شروع ہو جاتی، جیسی کہ اب تھی، تو عمارت کے مکینوں کو اپنے طور پر کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا پڑتا تھا- سردی پروفیسر کو پریشان کر رہی تھی- اسے دستانے اور ہیٹ پہن کر لکھنا پڑ رہا تھا اور اس کا چڑچڑاپن بڑھ گیا تھا- وہ نوکرانی کو دیکھنے زیادہ باہر آنے لگا تھا- وہ اپنے کپڑوں کے اوپر ایک بھاری نیلی باتھ روب پہننے لگا تھا- بعض اوقات باتھ روب کی پیٹی گرم پانی کی

Scanned with CamScanner

بوتل کے گرد لپٹی ہوتی جسے وہ اپنی کمر کے زیریں حصے پر کوٹ کے نیچے رکھ لیا کرتا تھا۔ بعض اوقات لکھنے کے دوران وہ گرم پانی کی بوتل پر بیٹھ جاتا تھا۔ یہ ایسا نظارہ تھا کہ ایک بار روزا دیکھ کر منھ پر ہاتھ رکھ کر مسکرانے لگی تھی۔ اگر وہ کھانے کے بعد گرم پانی کی بوتل ڈائننگ روم میں چھوڑ دیتا تو روزا اسے استعمال کرنے کے لیے پوچھ لیتی۔ عموماً وہ اس کی اجازت دے دیتا اور تب وہ ربڑ کی بوتل اپنے پیٹ پر رکھ کر کھنی سے دبائے کام کرتی رہتی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے جگر میں تکلیف ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پروفیسر، جب وہ اپنا کام نمٹا لیتی، کمرے میں جا کر اس کے لیٹنے کا بُرا نہیں مانتا تھا۔

ایک بار، جب روزا جا چکی تھی، پروفیسر اس کے کمرے کے نزدیک راہداری میں تمباکو کی بُو سونگھ کر تفتیش کرنے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں، جو ایک لمبوترے طاقچے سے زیادہ نہیں تھا، ایک تنگ دیوار گیر بستر کے علاوہ ایک چھوٹی سی سبز الماری بھی تھی۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا باتھ روم تھا جس میں طہارت خانہ اور ایک بیٹھک نہان تھا جس میں ٹھنڈے پانی کا نل لگا ہوا تھا۔ وہ اکثر بیٹھک نہان میں ایک تختے پر کپڑے دھوتی تھی لیکن جہاں تک پروفیسر کو معلوم تھا، اس میں نہائی کبھی نہیں تھی۔ اپنی بہو کے نام کے دن والے تہوار سے ایک دن قبل اس نے بڑے باتھ روم میں، پروفیسر کے ٹب میں، گرم پانی سے نہانے کی اجازت مانگی تھی۔ اگرچہ وہ لمحہ بھر کو ہچکچایا تھا مگر انجام کار اس نے ہاں کر دی تھی۔ اس کے کمرے میں پہنچ کر پروفیسر نے الماری کے نچلے حصے کی ایک دراز کھولی۔ وہاں سگریٹ کے بچے ہوئے ٹکڑوں کا ایک ڈھیر تھا، ان ٹکڑوں کا جو پروفیسر نے راکھ دانوں میں رکھ چھوڑے تھے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ روزا نے ردی کی ٹوکری میں سے اس کے پرانے اخبار اور رسالے اکٹھے کر رکھے ہیں۔ اس نے ستلی، کاغذی تھیلے اور ربڑ کے چھلے بھی بچا رکھے تھے اور اس کے پھینکے ہوئے پنسل کے چھوٹے ٹکڑے بھی۔ یہ معلوم ہونے کے بعد سے وہ اسے کبھی کبھار کھانے کا بچا ہوا کچھ گوشت اور سوکھا ہوا پنیر ساتھ لے جانے کو دینے لگا۔ بدلے میں وہ اس کے لیے پھول لاتی۔ ایک بار وہ دو ایک غلیظ انڈے بھی لے آئی جو اس کی بہو کی مرغی نے دیے تھے، مگر پروفیسر نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ ان کی زردی اس کے ذائقے کے لحاظ سے بہت تیز ہے۔ اس نے دیکھا کہ روزا کو جوتوں کی ضرورت ہے، کیوں کہ وہ گھر جاتے ہوئے جو جوتے پہنتی تھی دو جگہ سے پھٹے ہوئے تھے، اور یہ کہ وہ روزانہ وہی جھری والا سیاہ لباس پہنتی ہے جس کے باعث پروفیسر کو اس سے بات کرتے ہوئے شرمندگی ہوتی تھی۔ تاہم اس کا خیال تھا کہ جب اس کی بیوی آئے گی تو ان معاملات پر اس سے بات کرے گا۔

نوکریوں کی جو صورت حال تھی اس کے لحاظ سے روزا جانتی تھی کہ اسے ایک اچھی نوکری میسر ہے۔ پروفیسر اچھی تنخواہ دیتا تھا اور وہ بھی بلا تاخیر۔ وہ اس کے کچھ اطالوی آجروں کے سے متکبرانہ انداز میں اس پر کبھی حکم نہیں چلاتا تھا۔ وہ اگرچہ زود حس اور تنگ مزاج تھا مگر بُرا نہیں تھا۔ اس کا سب سے بڑا نقص اس کی خاموشی تھی۔ وہ گزارے سے بہتر اطالوی بول سکتا تھا، مگر جس وقت کام نہ کر رہا ہوتا ڈرائنگ روم میں آرام کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے کو ترجیح دیتا تھا۔ سارے گھر میں دو افراد تھے، آپ سوچیں گے کہ وہ

Scanned with CamScanner

کبھی کبھار ایک دوسرے سے کچھ بات کرنا چاہتے ہوں گے۔ بعض اوقات پڑھنے کے دوران جب وہ اسے کافی کی پیالی لا کر دیتی تو اپنے مصائب کے بارے میں کچھ کہنے کی کوشش کرتی، اسے اپنی طویل افلاس زدہ بیوگی کے بارے میں بتانا چاہتی، اور یہ کہ اس کا بیٹا کیسا نکلا ہے اور اس کی منحوس بہو کے ساتھ رہنا کیسا لگتا ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ یہ باتیں خوش خلقی سے سنا کرتا، اور وہ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے بلکہ ایک ہی گرم بوتل اور ٹب استعمال کرتے تھے، ان میں گفتگو کبھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس سے اتنی ہی بات کرتا جتنی کوئی گونگا کرے گا اور واضح طور پر جتا دیتا کہ وہ تنہا چھوڑ دیے جانے کو ترجیح دیتا ہے۔ سو روزا نے اسے تنہا چھوڑ دیا اور گھر میں تنہائی میں وقت گزارنے لگی۔ غیر ملکیوں کے ساتھ کام کرنے میں فائدے تو ہیں، اس نے سوچا، مگر اس کے نقصانات بھی ہیں۔

کچھ دن بعد پروفیسر نے محسوس کیا کہ روزا کے لیے، عام طور پر اس وقت جب وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہوتی، ہر سہ پہر کو باقاعدگی سے فون آنے لگا ہے۔ آنے والے ہفتے میں وہ چار بجے تک گھر میں ٹھہرنے کے بجائے فون پر بات کرنے کے بعد جانے کی اجازت مانگنے لگی۔ پہلے پہل اس نے کہا کہ اس کے جگر میں تکلیف ہے، مگر بعد میں اس نے جواز پیش کرنا چھوڑ دیا۔ گو اس قسم کی باتوں کو وہ زیادہ پسند نہیں کرتا تھا، کیوں کہ اسے شبہ تھا کہ نوازشات میں بہت زیادہ فیاضی سے وہ فائدہ اٹھانے لگے گی، پھر بھی اس نے روزا سے کہہ دیا کہ جب تک اس کی بیوی آئے، وہ ہفتے میں دو بار تین بجے جا سکتی ہے بشرطے کہ اپنا کام مکمل طور پر ختم کر چکی ہو۔ وہ جانتا تھا کہ روزا جانے سے پہلے اپنا ہر کام ختم کر لیتی ہے مگر اس نے سوچا کہ یہ بات ضرور کہنی چاہیے۔ چمکتی آنکھوں اور پھڑکتے ہونٹوں کے ساتھ وہ عاجزی سے سنتی رہی اور عاجزی سے مان گئی۔ بعد میں جب پروفیسر کو اس بارے میں سوچنے کا اتفاق ہوا تو اس کا خیال تھا کہ روزا کو یہاں کسی بھی اعتبار سے ایک اچھی جگہ میسر ہے، اور اسے اس کا اظہار جلد ہی اپنے چہرے سے کرنا چاہیے اور اپنے ناخوشی کے تاثر کو ایک کم ناخوش تاثر سے بدلنا چاہیے۔ تاہم ایسا نہیں ہوا کیوں کہ، ان دنوں بھی جب وہ جلدی جا رہی تھی، جب کبھی اسے روزا کو دیکھنے کا اتفاق ہوا وہ اداسی سے اپنی سوچوں میں گم تھی اور یوں آہیں بھر رہی تھی گویا اپنے ہی دل کے کسی بوجھ تلے پس رہی ہو۔

اب وہ بوجھ چاہے جو بھی ہو، اس میں شریک نہ ہونے کو ترجیح دیتے ہوئے اس نے کبھی نہیں پوچھا کہ وہ کیا بوجھ ہے۔ ان لوگوں کے مصائب بے انت تھے۔ کوئی ان میں ایک بار الجھا تو زندگی بھر الجھا ہی رہا۔ وہ ایک عورت کو جانتا تھا، جو اس کے ایک ہم کار کی بیوی تھی، جس نے اپنی نوکرانی سے کہا تھا: "گلریزیا، مجھے تمہارے حال سے ہمدردی ہے مگر میں اس کے بارے میں سننا نہیں چاہتی۔" یہ، پروفیسر نے غور کیا، بنیادی طور پر اچھا اصول ہے۔ یہ مالک اور ملازم کے تعلقات کو ایک معروضی سطح پر اسی جگہ رکھتا ہے جہاں انھیں رہنا چاہیے۔ یوں بھی وہ اپریل میں اٹلی سے جا رہا تھا۔ اسے اپنی زندگی میں روزا کو پھر کبھی نہیں دیکھنا تھا۔ اس کے مصائب میں خود کو غیر ضروری طور پر ڈبونے کی نسبت، مانو وہ اسے کرسمس پر چھوٹا سا چیک بھیج دے تو روزا کے لیے کہیں بہتر ہو گا۔ پروفیسر جانتا تھا کہ وہ زود حس

ہے اور اکثر صورتوں میں بے صبر بھی، اور اسے اپنی طبیعت پر بعض اوقات افسوس بھی ہوتا تھا؛ لیکن وہ جو کچھ تھا سو تھا، اور جن باتوں سے اس کا گہرا اور ذاتی تعلق نہ ہو اُن سے الگ ہی رہنا پسند کرتا تھا۔

لیکن روزا کو یہ صورت حال گوارا نہ تھی۔ ایک صبح اس نے پروفیسر کی اسٹڈی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور جب اس نے "آوانتی" (آجاؤ) کہا تو اس طرح گھبرائی ہوئی اندر آئی کہ اس کے بات کرنے سے پہلے خود پروفیسر پریشان ہو گیا۔

"پروفیسور،" روزا ناخوشی سے بولی، "میں آپ کے کام میں مداخلت کی معافی چاہتی ہوں، مگر مجھے کسی سے تو بات کرنی ہی ہے۔"

"میں بہت مصروف واقع ہوا ہوں،" اس نے قدرے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر ٹھہر نہیں سکتیں؟"

"بس ایک منٹ لگے گا۔ مصیبتیں ساری زندگی پر محیط ہوتی ہیں مگر انھیں بیان کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔"

"کیا یہ تمھارے جگر کا مسئلہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے آپ کا مشورہ چاہیے۔ آپ تعلیم یافتہ آدمی ہیں اور میں ایک جاہل دہقان سے زیادہ نہیں ہوں۔"

"کس قسم کا مشورہ؟" اس نے بے صبری سے پوچھا۔

"آپ اسے جو نام چاہیں دے لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے کسی نہ کسی سے بات تو کرنی ہے۔ میں اپنے بیٹے سے بات نہیں کر سکتی، چاہے اس معاملے میں یہ ممکن بھی ہوتا۔ میں نے اپنا منہ کھولا نہیں اور وہ شیر کی طرح دہاڑا نہیں۔ اور میری بہو اس لائق نہیں کہ میں اپنی توانائی اس پر ضائع کروں۔ بعض اوقات جب دربان کی بیوی اور میں چھت پر کپڑے لٹکا رہے ہوتے ہیں تو میں اس سے ایک آدھ بات کر لیتی ہوں مگر وہ کوئی ہم درد انسان نہیں ہے۔ لہذا مجھے آپ کے پاس آنا پڑا ہے۔ میں بتاتی ہوں کس لیے۔"

اس سے پہلے کہ وہ کہہ سکتا کہ اس کے رازوں کو سننے کے بارے میں وہ کیا محسوس کرتا ہے، روزا نے ٹیکس بیورو میں ملازم اُس درمیانہ عمر کے شخص کی بات چھیڑ دی جس سے اس کی محلّے میں اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی۔ وہ شادی شدہ تھا، چار بچوں کا باپ تھا اور روز دو بجے دفتر سے اٹھنے کے بعد بعض اوقات ترکھان کے طور پر کام کرتا تھا۔ اس کا نام ارماندو تھا۔ یہی تھا جو اُسے ہر سہ پہر فون کیا کرتا تھا۔ وہ حال ہی میں ایک بس پر ملے تھے اور اس نے دو یا تین ملاقاتوں کے بعد، یہ دیکھ کر کہ اس کے جوتے پہننے کے قابل نہیں ہیں، اس پر زور دیا تھا کہ اسے اپنے لیے جوتوں کا ایک جوڑا خرید نے دے۔ روزا نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ احمق نہ بنے۔ وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کے وسائل بہت محدود ہیں۔ یہی کافی تھا کہ وہ اسے ہفتے میں دو بار سنیما لے جاتا ہے۔ روزا نے یہ بات کہہ دی تھی، پھر بھی ہر بار جب وہ ملتے وہ اس کے لیے جوتے خریدنے کی بات کرتا۔

"آخر میں بھی انسان ہوں،" روزا نے بے تکلفی سے پروفیسر کو بتایا، "اور مجھے جوتوں کی اشد ضرورت ہے، لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ ایسی باتوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اگر میں نے اس کے دیے ہوئے جوتے پہن لیے تو وہ مجھے اس کے بستر پر لے جا سکتے ہیں۔ یہ وجہ ہے جو میں نے سوچا کہ آپ سے پوچھوں کہ مجھے جوتے لے لینے چاہییں یا نہیں۔"

پروفیسر کا چہرہ اور گنجا سر دونوں لال ہو گئے۔ "میں نہیں سمجھتا کہ ممکنہ طور پر تمھیں کوئی مشورہ دے سکتا ہوں۔۔۔"

"آپ تعلیم یافتہ آدمی ہیں،" وہ بولی۔

"تاہم،" اس نے اپنی بات جاری رکھی، "چوں کہ صورت حال بنیادی طور پر ابھی تک مفروضہ ہے، لہذا میں اس حد تک کہہ سکتا ہوں کہ تمھیں اس فیاض شخص کو بتا دینا چاہیے کہ اس کی ذمے داریاں اسی کے خاندان کے لیے ہونی چاہییں۔ اس کے لیے بہتر ہوگا کہ تمھیں تحفے پیش نہ کرے، جیسا کہ تمھارے لیے بہتر ہوگا کہ تحفے قبول نہ کرو۔ اگر تم اس سے تحفے نہ لو تو اس کے لیے تم پر یا تمھاری ذات پر حق جتانا ممکن نہیں ہوگا۔ اس سے زیادہ میں نہیں کہہ سکتا۔ تم نے مشورہ مانگا تھا، سو میں نے دے دیا۔ لیکن اب مزید کچھ نہیں کہوں گا۔"

روزا نے آہ بھری۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ جوتے میرے کام آ سکتے ہیں۔ میرے جوتے ایسے لگتے ہیں جیسے بکریوں کے چبائے ہوئے ہوں۔ چھ سال ہو گئے میں نے نئے جوتے نہیں پہنے۔"

لیکن پروفیسر کے لیے اپنی بات میں اضافہ کرنے کے لیے کچھ اور نہ تھا۔

جب روزا اس دن کے کام نمٹا کر چلی گئی تو پروفیسر نے اس کے مسئلے پر سوچنے کے دوران اسے جوتا خرید دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے گمان تھا کہ روزا کچھ ایسی ہی توقع کر رہی ہوگی، یا یوں کہو کہ اُس نے اسی نتیجے کے لیے منصوبہ سازی کی ہوگی۔ لیکن چوں کہ یہ محض قیاس تھا جس کا ثبوت مکمل طور پر ناپید تھا، لہذا اس نے طے کیا کہ وہ یہی فرض کرے گا، تاوقتے کہ اس کے برعکس ثبوت مہیا نہ ہو جائے، کہ اس سے مشورہ مانگنے میں روزا کی نیت کے فتور کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اس نے جان چھڑانے کی غرض سے روزا کو خود جوتا خرید لینے کے لیے پانچ ہزار لیرے دینے پر غور کیا۔ لیکن اسے شک تھا: آخر اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ وہ اس رقم کو مطلوبہ مقصد ہی کے لیے استعمال کرے گی؟ یا نو وہ اگلے دن یہ کہتی ہوئی آئے کہ جگر کی تکلیف نے اسے ڈاکٹر کو بلوانے پر مجبور کر دیا تھا جس نے تین ہزار لیرے فیس لے لی: لہذا ان ناخوشگوار حالات کے پیش نظر پروفیسر جوتوں کے لیے تین ہزار روپے کی اضافی رقم فراہم کرے گا؟ یہ تو کبھی نہیں ہوگا۔ سو اگلی صبح جب نوکرانی پنساری کے ہاں گئی ہوئی تھی، پروفیسر اس کے کمرے میں گیا اور تیزی سے اس خستہ جوتے کا خاکہ کاغذ پر اتار لیا۔ یہ ایک اچھا خاصا مرحلہ تھا مگر اس نے اسے پھرتی سے سر کر لیا۔ اسی شام، اسی پیازا (چوک) کی ایک دکان سے جہاں اس کا پسندیدہ ریستوراں واقع تھا، اس نے روزا کے لیے پچپن سو لیرے کا ایک براؤن جوتا خرید لیا۔ گو قیمت اس کے اندازے سے ذرا زیادہ تھی مگر

Scanned with CamScanner

درمیانی اونچائی کی ایڑھی والا یہ باہر پہننے کا جوتا خوب مضبوط تھا، ایک کار آمد تحفہ۔

اگلے روز، جو بدھ کا دن تھا، اس نے جوتے روزا کو دیے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ خفت محسوس کر رہا تھا کیوں کہ اسے احساس ہو گیا تھا کہ روزا کو تنبیہیں کرنے کے باوجود اس نے اپنے آپ کو اس کے معاملات میں الجھا لیا ہے۔ لیکن اسے جوتا دینے کو وہ نفسیاتی طور پر کئی اعتبار سے مناسب اقدام سمجھتا تھا۔ جوتا نوکرانی کو پیش کرتے ہوئے اس نے کہا: "روزا، جس مسئلے پر تم نے مجھ سے بات کی تھی، غالباً میں اس کا ایک حل تجویز کر سکتا ہوں۔ یہ رہا تمھارا نئے جوتوں کا جوڑا۔ اپنے دوست کو بتا دو کہ تم اس سے جوتا نہیں لے سکتیں۔ اور ایسا کرتے ہوئے غالباً اسے یہ بھی بتانا مناسب ہو گا کہ آئندہ تم اس سے ذرا کم ملنے کا ارادہ رکھتی ہو۔"

پروفیسر کی مہربانی پر روزا پھولی نہ سماتی تھی۔ اس نے پروفیسر کا ہاتھ چومنے کی کوشش کی لیکن اس نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور آرام کرنے اپنی اسٹڈی میں چلا گیا۔ جمعرات کو جب اس نے روزا کی گھنٹی پر دروازہ کھولا تو وہ اس کے دیے ہوئے جوتے پہنے تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا کاغذی تھیلا تھا جس میں سے تین چھوٹے چھوٹے مالٹے، جو ہرے پتوں کے ساتھ ابھی تک ایک شاخ پر لگے ہوئے تھے، اس نے پروفیسر کو پیش کیے۔ پروفیسر نے کہا کہ اسے یہ لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن روزا نے، اس غرض سے کہ اس کے دانت نظر نہ آئیں، نیم اخفا سے مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ اس پر اپنی ممنونیت کا اظہار کرنا چاہتی ہے۔ بعد ازاں اس نے تین بجے جانے کی اجازت مانگی تاکہ ارماندو کو اپنے نئے جوتے دکھا سکے۔

پروفیسر نے رکھائی سے کہا: "اگر تمھارا کام ختم ہو جائے تو تم تین بجے جا سکتی ہو۔"

روزا اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بچھ بچھ گئی۔ روزمرہ کے فرائض جلدی جلدی نمٹاتے ہوئے وہ تین بجے کے ذرا دیر بعد رخصت ہو گئی، لیکن ہیٹ، دستانوں اور ہاتھ روب میں ملبوس پروفیسر کی نظر پڑنے سے پہلے نہیں جو اپنی اسٹڈی کے کھلے دروازے پر کھڑا اس کے ابھی ابھی پوچا لگائے ہوئے راہداری کے فرش کے معائنے کے دوران، اسے خوب صورت سیاہ نوک دار پمپ پہنے اسے اپارٹمنٹ سے جلدی جلدی باہر جاتے دیکھ رہا تھا۔ اس بات نے پروفیسر کو برہم کر دیا، اور جب اگلی صبح روزا آئی تو پروفیسر کی زبانی یہ سن کر کہ اس نے پروفیسر کو بےوقوف بنایا ہے اور وہ سبق سکھانے کے لیے اسے نوکری سے نکال رہا ہے، وہ اس سے ایسا نہ کرنے کی التجائیں کرنے لگی۔ مگر پروفیسر کا فیصلہ اٹل تھا۔ اس نے روتے ہوئے ایک اور موقع دیے جانے کی حجتیں کیں پروفیسر نے مان کر نہ دیا۔ لہٰذا اس نے مایوسی کے ساتھ اپنے کمرے کے متفرقات ایک اخبار میں لپیٹے اور رخصت ہو گئی۔ وہ ابھی تک رو رہی تھی۔ بعد میں پروفیسر پریشان اور بےحد زود حس ہو گیا۔ اس روز اس سے سردی برداشت نہیں ہوئی اور وہ کام بھی نہیں کر سکا۔

ایک ہفتے بعد، جب عمارت میں حرارت رواں کی گئی، روزا اپارٹمنٹ کے دروازے پر ظاہر ہوئی اور کام پر واپس آنے کے لیے گڑگڑانے لگی۔ اس کا ذہن منتشر تھا۔ اس نے اپنے پھولے ہوئے، نیل

پڑے ہونٹ کو آہستگی سے چھوتے ہوئے کہا کہ اس کے بیٹے نے اسے مارا ہے۔ اگرچہ وہ رو نہیں رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے وضاحت کی کہ جوتوں کے دونوں جوڑے قبول کرنے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ارماندو اپنا جوڑا اسے پہلے دے چکا تھا، بلکہ کسی ممکنہ رقیب سے حسد کے باعث اس نے روزا کو یہ جوڑا قبول کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر جب پروفیسر نے مہربانی کرتے ہوئے اسے اپنی طرف سے جوتوں کا جوڑا پیش کیا تو وہ انکار کرنا چاہتی تھی مگر پروفیسر کو ناراض کرنے اور اپنا کام گنوا بیٹھنے سے خائف تھی۔ "سینٹ پیٹر کی قسم کہ یہ خدائی سچ ہے!" اس نے وعدہ کیا کہ اگر پروفیسر نے اسے دوبارہ رکھ لیا تو وہ ارماندو کو ڈھونڈ کر، جسے وہ ہفتے بھر سے نہیں ملی ہے، اس کے جوتے لوٹا دے گی۔ اور اگر پروفیسر نے اسے رکھنے سے انکار کر دیا تو وہ تیویرے دریا میں چھلانگ لگا دے گی۔ پروفیسر نے، اگرچہ اُسے اس قسم کی گفتگو کی پروا نہیں تھی، روزا کے لیے ایک خاص ہم دردی محسوس کی۔ وہ جس طرح روزا سے پیش آیا تھا اس پر اسے خود سے مایوسی محسوس ہو رہی تھی۔ بہتر ہوتا اگر ایمان داری کے موضوع پر چند مناسب الفاظ کے ساتھ اس معاملے کو فلسفیانہ انداز میں نمٹا دیا جاتا۔ روزا کو نوکری سے نکال کر اس نے معاملات کو خواہ مخواہ پیچیدہ کر لیا ہے کیوں کہ اس دوران وہ دو اور نوکرانیوں کو آزما کر ناموزوں قرار دے چکا تھا: ایک چور تھی اور دوسری کاہل۔ حالاں کہ دربان کی بیوی ہر صبح گھنٹے بھر کے لیے آ کر صفائی کر جاتی تھی مگر روزا کے جانے کے بعد سے گھر اس طرح بکھرا پڑا تھا کہ اس کے لیے سکون سے کام کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ عین اس لمحے روزا دروازے پر نمودار ہوئی۔ جب اُس نے اپنا کوٹ اتارا تو پروفیسر کو یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ اس کے لباس کی جھری آخر کار رفو کر دی گئی تھی۔

ہر نظر آنے والی شے کو جھاڑتی، پونچھتی، چمکاتی، وہ اداسی سے کام میں لگ گئی۔ اس نے بستر تہہ کیے، پھر انھیں بچھایا، مسہریوں کے نیچے جھاڑو دی، پوچھا لگایا اور ان کے سرہانوں اور پائنتیوں کو چمکاتے ہوئے تازہ استری کیے ہوئے سرپوشوں سے سجا دیا۔ حالاں کہ اسے کام دوبارہ مل گیا تھا اور وہ معمول کی کارکردگی کے ساتھ کام کر رہی تھی، مگر پروفیسر نے دیکھا کہ وہ اداسی سے کام کر رہی ہے۔ وہ رہ رہ کر آہیں بھرتی اور صرف اُسی وقت مسکرانے کی کوشش کرتی جب پروفیسر اسے دیکھ رہا ہوتا۔ یہ ان کی فطرت ہے، اس نے سوچا، ان کی زندگیاں کٹھن ہیں۔ بیٹے کی مزید مار پیٹ سے بچانے کے لیے پروفیسر نے اسے اپارٹمنٹ میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اس غرض سے کہ روزا اپنے رات کے کھانے کے لیے گوشت خرید سکے، پروفیسر نے اضافی رقم کی پیش کش کی لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ پاستا (pasta) سے کام چل جائے گا۔ وہ رات کو صرف پاستا اور سبز سلاد کھاتی تھی۔ کبھی کبھار وہ دوپہر کی بچی ہوئی باقی چک سبزی اُبال لیتی اور تیل اور سرکہ ملا کر کھا لیتی۔ وہ اُسے الماری میں رکھی سفید وائن پینے کی دعوت دیتا اور پھل لینے کو کہتا۔ کبھی کبھی وہ لے بھی لیتی مگر ہمیشہ بتا دیتی کہ اس نے کیا اور کتنا لیا ہے، حالاں کہ پروفیسر بار بار کہتا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اپارٹمنٹ میں ہر چیز سلیقے سے اپنی جگہ پر رکھی تھی۔ فون کی گھنٹی حسبِ معمول روز تین بجے سہ پہر بجتی لیکن ایسا بہت کم ہوتا کہ ارماندو سے بات کرنے

Scanned with CamScanner

کے بعد وہ گھر سے باہر گئی ہو۔

پھر ایک افسردہ صبح روزا پروفیسر کے پاس آئی اور اپنے منتشر انداز میں اعتراف کیا کہ وہ حاملہ ہے۔ اس کے چہرے پر مایوسی کی چمک تھی اور سیاہ لباس میں سے اس کا سفید زیر جامہ جھانک رہا تھا۔

اسے دوبارہ رکھ لینے پر اپنے آپ کو الزام دیتے ہوئے پروفیسر نے برہمی اور بددلی محسوس کی۔

"تمھیں فوراً چلے جانا چاہیے،" اپنی آواز کو کپکپانے سے روکتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں نہیں جا سکتی،" وہ بولی۔ "میرا بیٹا مجھے مار ڈالے گا۔ خدا کے نام پر میری مدد کیجیے، پروفیسور۔"

وہ اس کی حماقت پر مشتعل ہو گیا۔ "میں تمھارے جنسی کارناموں کا ذمے دار نہیں ہوں۔"

"کیا یہ اسی ارماندو کا کام ہے؟" اس نے تقریباً وحشیانہ انداز سے پوچھا۔

روزا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا تم نے اسے بتا دیا ہے؟"

"وہ کہتا ہے کہ اسے یقین نہیں آتا،" اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

"اسے میں یقین دلاؤں گا،" وہ بولا۔ "تمھارے پاس اس کا فون نمبر ہے؟"

روزا نے اسے فون نمبر بتایا۔ اس نے ارماندو کو دفتر میں فون کیا اور اپنی پہچان کراتے ہوئے اسے فوراً اپنے اپارٹمنٹ میں آنے کو کہا۔ "تم پر روزا کی ایک بھاری ذمے داری ہے۔"

"بھاری ذمے داری مجھ پر اپنے خاندان کی ہے،" ارماندو نے جواب دیا۔

"اس کا خیال تمھیں پہلے کرنا چاہیے تھا۔"

"ٹھیک ہے، میں کل دفتر کے بعد آؤں گا۔ آج تو ناممکن ہے۔ مجھے ایک ترکھانی ٹھیکے کا کام نمٹانا ہے۔"

"وہ تمھارا انتظار کرے گی،" پروفیسر نے کہا۔

وہ جتنا فکرمند تھا گو اُس سے زیادہ جذباتی محسوس کر رہا تھا، مگر فون رکھنے کے بعد اس کا غصہ کم ہو چکا تھا۔ "کیا تمھیں اس بات کا پورا یقین ہے،" اس نے روزا سے پوچھا، "کہ تم حاملہ ہو؟"

"ہاں۔" وہ اب رو رہی تھی۔ "کل میرے بیٹے کی سال گرہ ہے۔ یہ اطلاع اس کے لیے کیا عمدہ تحفہ ہو گی کہ اس کی ماں ایک رنڈی ہے۔ وہ ہاتھوں سے نہیں، دانتوں سے میری ہڈیاں توڑ ڈالے گا۔"

"تمھاری عمر کو دیکھتے ہوئے تمھیں حمل ٹھہرنے کا امکان مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔"

"میری ماں نے پچاس سال کی عمر میں بچہ جنا تھا۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تمھیں غلط فہمی ہوئی ہو؟"

"میں کہہ نہیں سکتی۔ پہلے کبھی ایسا ہوا نہیں۔ آخر مجھے بیوہ ہوئے بھی تو۔۔۔"

"بہتر ہو گا کہ تم اچھی طرح اطمینان کر لو۔"

Scanned with CamScanner

"ہاں، میں بھی یہی چاہتی ہوں،" روزا بولی۔ "میں اپنے علاقے کی دایہ سے ملنا چاہتی ہوں لیکن میرے پاس ایک لیرا بھی نہیں ہے۔ میرے پاس جو کچھ تھا وہ بے کاری کے دنوں میں خرچ کر چکی ہوں۔ یہاں آنے کے لیے بس کا کرایہ ادھار لینا پڑا ہے۔ ارماندو فوری طور پر میری مدد نہیں کر سکتا۔ اس ہفتے اسے اپنی بیوی کے دانتوں کی ادائیگی کرنی ہے۔ اس بے چاری کے دانت بہت خراب ہیں۔ یہی وجہ ہے جو میں آپ کے پاس آئی ہوں۔ کیا آپ دایہ سے معائنہ کرانے کے لیے مجھے تنخواہ میں سے دو ہزار پیشگی دے سکتے ہیں؟"

ایک منٹ بعد پروفیسر نے اپنے بٹوے میں سے ہزار ہزار لیرے کے دو نوٹ گن دیے۔ "دایہ کے پاس ابھی چلی جاؤ،" اس نے کہا۔ وہ اپنی بات میں اتنا اضافہ کرنے والا تھا کہ اگر وہ حاملہ ہو تو واپس نہ آئے، مگر اسے ڈر ہوا کہ کہیں وہ کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا لے یا نوکری بچانے کی خاطر جھوٹ نہ بول دے۔ اب وہ اسے رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جب اسے اس ابتری کے دوران اپنی بیوی اور بیٹی کے پہنچنے کا خیال آیا تو گھبراہٹ سے اس کا جی الٹنے لگا۔ وہ نوکرانی سے جلد سے جلد نجات حاصل کر لینا چاہتا تھا۔

اگلے دن روزا نو کے بجائے بارہ بجے آئی۔ اس کا مغموم چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔ "دیر سے آنے کی معافی چاہتی ہوں،" وہ زیرِ لب بولی۔ "میں اپنے شوہر کی قبر پر دعا کرنے گئی تھی۔

"کوئی بات نہیں،" پروفیسر نے کہا۔ "لیکن کیا تم دایہ کے پاس گئیں؟"

"ابھی نہیں۔"

"کیوں؟" غصے کے باوجود وہ نرمی سے بول رہا تھا۔

روزا فرش کو تکنے لگی۔

"مہربانی کر کے میرے سوال کا جواب دو۔"

"میں یہ بتانے والی تھی کہ وہ دو ہزار لیرے بس میں گر گئے، لیکن اپنے شوہر کی قبر سے آنے کے بعد میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔ بہرحال، بات تو تحمّل کر رہے گی۔

یہ تو انتہا ہے، اس نے سوچا، اس کا کوئی انت نہیں۔ "تم نے رقم کا کیا کیا؟"

"میرا یہی تو مطلب ہے،" روزا نے آہ بھری۔ "میں نے اپنے بیٹے کے لیے تحفہ خرید لیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس کا مستحق ہے، بلکہ اس لیے کہ یہ اس کی سالگرہ کا حق تھا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پروفیسر لمحہ بھر اسے دیکھتا رہا، پھر بولا: "ذرا میرے ساتھ آؤ۔"

وہ اپنی باتھ روب ہی میں اپارٹمنٹ سے باہر نکل پڑا۔ روزا اس کے پیچھے چل دی۔ اس نے لفٹ کا دروازہ کھولا اور روزا کے لیے کھلا رکھتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ روزا لفٹ میں داخل ہو گئی۔

وہ دو منزل نیچے رکے۔ پروفیسر باہر نکلا اور گھنٹیوں کے اوپر لگی پیتل کی تختیوں پر درج نام قریب جا کر غور سے پڑھنے لگا۔ مطلوبہ نام ملنے پر اس نے بٹن دبایا۔ ایک نوکرانی نے دروازہ کھول کر انھیں اندر بٹھایا۔ وہ روزا کے چہرے کے تاثر سے ڈری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

Scanned with CamScanner

"کیا ڈاکٹر موجود ہیں؟" پروفیسر نے ڈاکٹر کی نوکرانی سے پوچھا۔
"دیکھتی ہوں۔"
"مہربانی کر کے ان سے پوچھو کہ کیا ایک منٹ کے لیے مجھ سے مل سکتے ہیں۔ میں اسی عمارت میں رہتا ہوں، دو منزل اوپر۔"
"جی سینیور۔" اس نے روزا پر دوبارہ نظر ڈالی اور اندر چلی گئی۔
اطالوی ڈاکٹر، جو چھوٹے قد کا اوسط عمر باریش آدمی تھا، باہر آیا۔ پروفیسر عمارت کے احاطے میں اسے دو ایک بار دیکھ چکا تھا۔ ڈاکٹر اپنی آستین کا بٹن بند کر رہا تھا۔
"جناب، میں آپ کو تکلیف دینے پر معذرت چاہتا ہوں،" پروفیسر بولا۔ "یہ میری نوکرانی ہے۔ اسے کچھ مشکل پیش آ گئی ہے۔ یہ اس بات کا یقین کرنا چاہتی ہے کہ آیا یہ حاملہ ہے۔ کیا آپ اس کی مدد کر سکتے ہیں؟"
ڈاکٹر نے پروفیسر کو دیکھتے ہوئے نوکرانی پر نظر ڈالی جس نے اپنی آنکھوں کو رومال سے ڈھانک رکھا تھا۔
"اسے میرے کمرے میں بھیج دیجیے۔"
"شکریہ،" پروفیسر نے کہا۔ ڈاکٹر نے سر ہلا دیا۔
پروفیسر اپنے اپارٹمنٹ میں واپس چلا آیا۔ آدھے گھنٹے بعد فون کی گھنٹی بجی۔
"پرونتو۔"
ڈاکٹر بول رہا تھا۔ "اسے حمل نہیں ہے،" اس نے بتایا۔ "بس خوفزدہ ہے۔ اس کے جگر میں بھی تکلیف ہے۔"
"آپ کو یقین ہے، ڈاکٹر؟"
"بالکل۔"
"شکریہ،" پروفیسر نے کہا۔ "اگر آپ اس کے لیے کوئی نسخہ تجویز کریں تو ازراہِ کرم میرے حساب میں ڈال دیں اور اپنا بِل مجھے بھجوا دیں۔"
"بہتر،" ڈاکٹر بولا اور فون بند کر دیا۔
روزا اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی۔ "ڈاکٹر نے تمھیں بتایا؟" پروفیسر نے پوچھا۔ "تمھیں حمل نہیں ہے۔"
"یہ مقدس کنواری کا کرم ہے،" روزا بولی۔
پھر اس نے پُرسکون انداز سے بولتے ہوئے روزا کو بتایا کہ اسے جانا ہوگا۔ "مجھے افسوس ہے، روزا، لیکن میں اس قسم کی باتوں میں اُلجھا نہیں رہ سکتا۔ میں اس سے پریشان ہوتا ہوں اور میرے کام کا حرج ہوتا ہے۔"

Scanned with CamScanner

نوکرانی نے اپنا منہ پھیر لیا۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ یہ ارماندو تھا جو ایک لمبے خاکستری اوور کوٹ میں ملبوس، چھوٹے قد کا، ہلکی ہلکی مونچھوں والا دبلا پتلا آدمی تھا۔ اس نے ایک سوقیانہ سیاہ ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور متفکر تھیں۔ ان دونوں کو دیکھ کر اس نے اپنا ہیٹ چھُوا۔

روزا نے اسے بتایا کہ وہ اپارٹمنٹ چھوڑ رہی ہے۔

"آؤ، میں تمھاری چیزیں اکٹھی کرنے میں مدد کرتا ہوں،" ارماندو نے کہا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں گیا اور دونوں روزا کی چیزیں اخبار میں لپیٹنے لگے۔

جب ارماندو اور روزا، بالترتیب ایک تھیلا اور اخبار میں لپٹا جوتے کا ڈبّا اٹھائے، کمرے سے باہر آئے تو پروفیسر نے مہینے کی بقایا تنخواہ روزا کو دے دی۔

"مجھے افسوس ہے،" اس نے کہا۔ "مجھے اپنی بیوی اور بیٹی کا خیال کرنا ہے۔ وہ آج کل میں آنے والی ہیں۔"

نوکرانی نے جواب نہیں دیا۔ ارماندو نے، جس کے منہ میں سگریٹ اٹکا ہوا تھا، آہستگی سے اس کے لیے دروازہ کھولا اور وہ اکٹھے رخصت ہو گئے۔

بعد ازاں جب پروفیسر نوکرانی کے کمرے میں گیا تو اس نے دیکھا کہ اُس کے دیے ہوئے جوتوں کے سوا روزا اپنی ہر چیز لے جا چکی ہے۔ جب یوم تشکر سے ذرا پہلے اس کی بیوی اپارٹمنٹ میں آئی تو اس نے جوتے دربان کی بیوی کو دے دیے جس نے انھیں ہفتے بھر پہننے کے بعد اپنی بہو کے حوالے کر دیا۔

**

(انگریزی عنوان: Maid's Shoes)

برنارڈ مالامڈ

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

ماتم گسار

کیسلر، جس کا سابقہ پیشہ انڈوں کو چھانٹ کر مختلف درجوں میں تقسیم کرنا تھا، اب سوشل سکیورٹی کے وظیفے پر تنہا گزر بسر کرتا تھا۔ اس کی عمر پینسٹھ برس سے زیادہ تھی، اس کے باوجود وہ انڈوں اور مکھن کے ایک سے زیادہ تاجروں کے پاس اچھی خاصی اجرت پر نوکری حاصل کر سکتا تھا، کیوں کہ وہ انڈوں کو چھانٹنے اور مختلف درجوں میں الگ الگ کرنے کا کام تیزی سے اور غلطی کیے بغیر کر سکتا تھا، لیکن وہ جھگڑالو قسم کی طبیعت رکھتا تھا اور فسادی سمجھا جاتا تھا، چناں چہ تاجر اسے نہ رکھنے ہی کو ترجیح دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد سے، اپنی قلیل ضرورتوں کے ساتھ بڑھاپے کی پنشن پر گزر کرتے ہوے، وہ ایسٹ سائیڈ پر واقع ایک خستہ حال عمارت کی سب سے اوپر کی منزل پر ایک سستے اور چھوٹے سے فلیٹ میں رہ رہا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ اتنے زینے اوپر رہتا تھا، کوئی اس سے ملنے کے لیے آنے کی زحمت نہ کرتا تھا۔ وہ بہت تنہا تھا، جیسا کہ اپنی بیشتر زندگی میں رہا تھا۔ ایک وقت تھا کہ اس کے بھی گھر والے تھے، مگر اپنی بیوی یا بچوں کی موجودگی کی تاب نہ لاتے ہوے، جو ہمیشہ اس کے راستے میں آتے تھے، اس نے چند برسوں میں ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد سے اس کی ان سے ملاقات نہ ہوئی، کیوں کہ نہ اس نے انھیں تلاش کیا اور نہ انھوں نے اسے۔ تیس برس گزر گئے تھے۔ اب اسے کچھ اندازہ نہ تھا کہ وہ لوگ کہاں ہیں، اور وہ اس بارے میں زیادہ سوچتا بھی نہیں تھا۔

عمارت میں، اگرچہ وہ وہاں دس برس سے رہ رہا تھا، وہ کم و بیش غیر معروف تھا۔ پانچویں منزل پر واقع اس کے فلیٹ کے دونوں جانب رہنے والے کرایہ داروں نے -- جن میں ایک طرف تین ادھیڑ عمر

Scanned with CamScanner

بیٹوں اور ان کی دُبلی پتلی ماں پر مشتمل ایک اطالوی خاندان تھا اور دوسری طرف ہوفمان نامی ایک بے اولاد جرمن جوڑا۔۔ کبھی اسے مخاطب کر کے ہیلو تک نہ کہا تھا اور نہ اس نے تنگ چوبی سیڑھیوں پر اُترتے چڑھتے کبھی ان سے کوئی کلمہ بولا تھا۔ عمارت کے دوسرے مکین جب گلی میں اس کے برابر سے گزرتے تو اس کی صورت پہچان جاتے، لیکن انہیں گمان ہوتا کہ وہ اسی بلاک کی کسی اور عمارت میں رہتا ہے۔

اِگنیس، عمارت کا پستہ قد، خمیدہ پُشت دربان اور مستری، اس سے سب سے زیادہ واقف تھا کیوں کہ وہ دونوں کئی بار دوگڈیوں والا تاش کا کھیل پِنوکل کھیل چکے تھے؛ لیکن اگنیس نے، جو عموماً ہارتا تھا کیوں کہ اسے تاش کھیلنے میں مہارت نہیں تھی، کچھ عرصے بعد اوپر آنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے شکایت کی کہ اس سے اس فلیٹ کی بدبُو برداشت نہیں ہوتی اور وہاں پڑا ہوا ٹوٹا پھوٹا فرنیچر دیکھ کر اس کی طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔ مستری نے اُس منزل پر رہنے والوں میں بھی کیسلر کے بارے میں یہی کچھ مشہور کر دیا تھا، اور وہ لوگ اسے ایک غلیظ بوڑھا گردانتے ہوئے اس سے کتراتے تھے۔ کیسلر کو اس کا احساس تھا لیکن وہ ان سب کو حقیر سمجھتا تھا۔

ایک بار اگنیس اور کیسلر میں اس بات پر تکرار ہو گئی کہ انڈے چھانٹنے والا بوڑھا اپنے گھر کی غلاظت کو بالٹی میں رکھنے کے بجائے چکنائی سے لتھڑے تھیلوں میں منہ تک ٹھونس کر کوڑے دان میں ڈال دیتا ہے۔ بات سے بات نکلتی گئی اور کچھ ہی دیر میں دونوں ایک دوسرے کو وحشیانہ گالیوں سے نوازنے لگے؛ آخر کیسلر نے اپنے فلیٹ کا دروازہ دھڑ سے مستری کے منہ پر بند کر دیا۔ اگنیس پانچ زینوں سے دوڑتا ہوا اترا اور اپنی ٹھس بیوی سے مخاطب ہو کر بوڑھے کو اونچی آواز میں بے نقط سنانے لگا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ عمارت کا مالک گروبر، مستقل طور پر تشویش زدہ چہرے والا ایک موٹا شخص، جو گزوں کے حساب سے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنتا تھا، اس وقت عمارت ہی میں موجود تھا اور پلمبنگ کی مرمّت کا جائزہ لے رہا تھا۔ اگنیس نے اسے کیسلر کے باعث ہونے والی مشکلات کا پورا احوال کہہ سنایا۔ اپنی ناک پر ہاتھ رکھ رکھ کر اس نے کیسلر کے فلیٹ سے اٹھنے والی بدبو کا بیان کیا اور اسے اپنی زندگی کے غلیظ ترین شخص کا لقب دیا۔ گروبر جانتا تھا کہ اس کا مستری مبالغے سے کام لے رہا ہے لیکن اسے ان مالی پریشانیوں کا بھاری بوجھ محسوس ہوا جن کے باعث اس کا بلڈ پریشر حیرت ناک بلندیوں تک جا پہنچتا تھا، چناں چہ اس نے فوراً یہ کہہ کر معاملہ ختم کر دیا: "اسے نوٹس دے دو۔" جنگ کے خاتمے کے بعد سے عمارت کے کسی بھی کرایہ دار کے پاس تحریری لیز نہ تھی، اور گروبر کو پورا اعتماد تھا کہ اگر کسی نے کوئی اعتراض کیا تو وہ کیسلر کو ناپسندیدہ کرایہ دار قرار دے کر نکال باہر کرنے کے اقدام کا جواز آسانی سے پیش کر سکے گا۔ اس نے سوچا کہ فلیٹ خالی کرانے کے بعد اگنیس سے اس کی دیواریں سستے روغن سے پُتوائی جا سکتی ہیں اور اسے اس سے پانچ ڈالر زیادہ کرائے پر چڑھایا جا سکتا ہے جو یہ بوڑھا ادا کرتا ہے۔

اس رات کھانا کھا کر اگنیس نے فاتحانہ انداز میں زینہ چڑھ کر کیسلر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ انڈے چھانٹنے والے نے دروازہ کھولا، اور یہ دیکھ کر کہ کون کھڑا ہے، فوراً دھڑ سے بند کر لیا۔ اگنیس نے بند

دروازے میں سے چلا کر کہا: "مسٹر گروبر نے تمھیں نوٹس دینے کو کہہ دیا ہے۔ ہم تمھیں یہاں نہیں دیکھنا چاہتے۔ تمھاری گندگی نے پوری عمارت کو سڑا رکھا ہے۔" جواب میں خاموشی رہی، لیکن اگنیس، اپنے کیے پر اتراتا ہوا، منتظر رہا۔ اگرچہ اسے پانچ منٹ تک کوئی آواز سنائی نہ دی، پھر بھی وہ وہاں سے ٹلا نہیں اور بند دروازے کے پیچھے بوڑھے یہودی کے تھر تھر کانپنے کا تصوّر کرتا رہا۔ پھر وہ دوبارہ بولا: "تمھیں پہلی تاریخ تک دو ہفتے کا نوٹس دیا جاتا ہے۔ پہلی تاریخ کو یہاں سے چلتے بنو تو بہتر ہے، ورنہ مسٹر گروبر اور میں دونوں مل کر تمھیں نکال باہر کریں گے۔" دروازے کو آہستہ آہستہ کھلتے اگنیس غور سے دیکھتا رہا۔ اسے حیرت ہوئی جب اس نے بوڑھے کے نمودار ہونے پر خود کو خوف زدہ محسوس کیا۔ وہ دروازہ کھولتے ہوئے یوں نظر آ رہا تھا جیسے کوئی مُردہ اپنے تابوت کا ڈھکنا اٹھا رہا ہو۔ مگر دیکھنے میں وہ چاہے مُردہ معلوم ہو رہا ہو، اس کی آواز بالکل زندہ تھی۔ وہ اس کے حلق سے خوف ناک درشتی کے ساتھ نکلی اور اس نے اگنیس کی زندگی کے تمام برسوں پر کوسنوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس کی آنکھیں لال تھیں، گال پچکے ہوئے تھے اور جھاڑو جیسی داڑھی بری طرح ہل رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے چلّاتے چلّاتے اس کا وزن گھٹتا چلا جا رہا ہو۔ مستری دل اب اس تماشے سے اُوب چلا تھا لیکن وہ ایک ساتھ اتنی ساری گالیاں برداشت نہ کر سکتا تھا اس لیے چیخ اٹھا: "غلیظ بڈھے، یہاں سے دفع ہو اور اپنی بک بک بند کر۔" اس پر کیسلر نے طیش میں آ کر قسم کھائی کہ فلیٹ خالی کرانے کے لیے انھیں اس کو قتل کرنا اور مُردہ حالت میں گھسیٹ کر باہر نکالنا ہو گا۔

پہلی دسمبر کی صبح اگنیس کو اپنے لیٹر بکس میں ایک میلا سا کاغذ تہہ کیا ہوا ملا جس میں کیسلر کی جانب سے پچیس ڈالر رکھے تھے۔ شام کو جب مالک مکان فلیٹوں کا کرایہ وصول کرنے آیا تو اس نے اسے یہ رقم دکھائی۔ گروبر کچھ دیر تک خالی الذہن ہو کر رقم کو تکتا رہا، پھر ناگواری سے بھنویں سکیڑیں۔

"میرا خیال ہے کہ میں نے نوٹس دینے کو کہا تھا۔"

"جی مسٹر گروبر،" اگنیس نے اتفاق کا اظہار کیا۔ "میں نے نوٹس دے دیا تھا۔"

"اچھا، اس کی یہ دیدہ دلیری!" گروبر بولا۔ "لاؤ چابیاں مجھے دو۔"

اگنیس نے چابیوں کا گچھا اسے تھمایا اور گروبر زور زور سے ہانپتا لکڑی کے تختوں سے بنی سیڑھیوں کے طویل راستے پر چل پڑا۔ اگرچہ وہ ہر زینے کے بعد رک کر سانس درست کرتا تھا لیکن سیڑھیاں چڑھنے کی مشقت اور بہتے ہوئے بے تحاشا پسینے کے باعث اس کی تلملاہٹ بڑھتی گئی۔

سب سے اوپر کی منزل پر پہنچ کر اس نے اپنی کلائی سے کیسلر کا دروازہ دھڑدھڑایا۔ "میں ہوں گروبر، مالک مکان۔ کھولو دروازہ۔"

کوئی جواب نہ آیا، نہ اندر کسی حرکت کی آواز ہوئی، چناں چہ گروبر نے تالے میں چابی ڈال کر گھمائی۔ کیسلر نے درازوں والی الماری اور کچھ کرسیاں دروازے کے ساتھ آڑا رکھی تھیں، لہٰذا گروبر کو اپنا کندھا دروازے پر رکھ کر پورے بدن کا زور لگانا پڑا تب کہیں وہ ڈھائی کمروں کے اس نیم تاریک فلیٹ کی

Scanned with CamScanner

راہداری میں قدم رکھ پایا۔ بوڑھا، جس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا، باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا تھا۔
"میں نے تمہیں یہاں سے دفع ہونے کو کہا تھا،" گروبر اونچی آواز میں بولا۔ "جاتے ہو یا سٹی مارشل کو فون کروں؟"
"مسٹر گروبر۔۔۔" کیسلر شروع ہوا۔
"کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ بس نکل جاؤ۔" اس نے ارد گرد نظر ڈالی۔ "دیکھنے میں کباڑخانہ لگتا ہے اور بدبو ایسی ہے جیسے پاخانہ۔ اس کی تو صفائی کرنے میں مہینا بھر لگ جائے گا۔"
"یہ تو گوبھی کی بُو ہے جو میں رات کے کھانے کے لیے پکا رہا ہوں۔ ٹھہریے، میں کھڑکی کھولتا ہوں، ابھی جاتی رہے گی۔"
"جب تم جاتے رہو گے تو یہ بھی جاتی رہے گی۔" گروبر نے اپنا موٹا سا بٹوا کھولا، گن کر بارہ ڈالر نکالے، پچاس سینٹ اور ملائے اور اس رقم کو درازوں والی الماری کے اوپر رکھ دیا۔ "تمہیں دو ہفتے کی اور مہلت دیتا ہوں۔ پندرہ تاریخ کو ہر حال میں فلیٹ خالی کرو، ورنہ میں باہر پھنکوا دوں گا۔ ٹرٹر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں سے نکلو اور کسی ایسی جگہ جاؤ جہاں کوئی تمہیں جانتا نہ ہو، شاید کوئی ٹھکانا مل جائے۔"
"نہیں مسٹر گروبر،" کیسلر بُری طرح رونے لگا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا، میں یہیں رہوں گا۔"
"دیکھو، میرے بلڈپریشر سے چھیڑچھاڑ مت کرو،" گروبر بولا۔ "اگر پندرہ تاریخ تک تم باہر نہ ہوئے تو میں تمہارے ڈھانچ کو خود اٹھا کر باہر پھینکوں گا۔"
یہ کہہ کر وہ وہاں سے ہٹا اور بھاری قدم رکھتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا۔
پندرہ تاریخ آئی تو اگنیس کو پھر اپنے لیٹر بکس میں ساڑھے بارہ ڈالر ملے۔ اس نے فون کر کے گروبر کو اطلاع دے دی۔
"میں اس کو نکلوانے کا بندوبست کرتا ہوں،" گروبر نے چلّا کر کہا۔ اس نے مستری کو ہدایت کی کہ کیسلر کو رقعہ لکھ کر دے دے کہ کرایہ واپس کیا جا رہا ہے اور اسے اس کے دروازے کے نیچے سے اندر ڈال دے۔ اگنیس نے یہی کیا، کیسلر نے رقم پھر لیٹر بکس میں ڈال دی، مگر اگنیس نے پھر ایک رقعہ لکھ کر رقم اس میں لپیٹی اور دروازے میں سے اندر کھسکا دیا۔
ایک دن اور گزرا تو کیسلر کو فلیٹ خالی کرنے کے عدالتی نوٹس کی نقل وصول ہوئی۔ اس میں اسے جمعے کو دس بجے عدالت میں حاضر ہو کر وضاحت کرنے کا حکم دیا گیا تھا کہ اسے متواتر غفلت اور کرائے کی جائیداد کی بربادی کی پاداش میں مکان سے کیوں نہ نکال دیا جائے۔ سرکاری نوٹس دیکھ کر کیسلر کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کیوں کہ اس نے آج تک عدالت کی شکل نہ دیکھی تھی۔ وہ مقررہ تاریخ کو عدالت میں حاضر نہ ہوا۔
اُسی سہ پہر کو عدالت کا مارشل اپنے دو مسٹنڈے نائبوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اگنیس نے بڑھ کر کیسلر کے فلیٹ کا تالا کھولا، اور جب وہ تینوں دروازے کو دھکا دے کر اندر داخل ہوئے تو مستری دوڑ کر

Scanned with CamScanner

سیڑھیاں اترنے لگا کہ نیچے تہ خانے میں جا چھپے۔ کیسلر کے بلبلانے اور چیخنے چلانے کی پروا کیے بغیر دونوں نائبوں نے نہایت مستعدی سے اس کا قلیل فرنیچر اٹھایا اور نیچے فٹ پاتھ پر لے جا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد انھوں نے کیسلر کو باہر نکالا، گو کہ اس کے لیے انھیں غسل خانے کا دروازہ توڑنا پڑا کیوں کہ بوڑھے نے وہاں گھس کر اندر سے چٹخنی لگالی تھی۔ وہ چلایا، ہاتھ پیر مارے، پڑوسیوں کی منتیں کیں کہ اس کی مدد کریں، مگر وہ سب دروازے کے پاس حلقہ بنائے خاموشی سے تکتے رہے۔ دونوں نائب بلکتے اور بچھاڑیں کھاتے بوڑھے کی سوکھی ٹانگیں اور بازو پکڑ کر اسے زینے سے نیچے لے گئے۔ انھوں نے اسے اس کے کاٹھ کباڑ کے بیچ ایک کرسی بچھا کر اس پر بٹھا دیا۔ اوپر مارشل نے فلیٹ کے دروازے پر اگنیس کا مہیا کیا ہوا تالا ڈال دیا، ایک کاغذ پر دستخط کر کے مستری کی بیوی کو تھمایا اور اپنے نائبوں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

کیسلر وہیں فٹ پاتھ پر اپنی ٹوٹواں کرسی پر بیٹھا رہا۔ بارش ہوئی اور پھر اولے پڑنے لگے، مگر اس نے وہاں سے جنبش نہ کی۔ راہ گیر اس کے سامان سے بچتے ہوئے چکر کاٹ کر گزرتے رہے۔ وہ کیسلر کو گھورتے اور کیسلر خلا میں نظریں جمائے رہتا۔ اس نے کوئی ہیٹ یا کوٹ نہیں پہن رکھا تھا، اور اس پر گرتی ہوئی برف نے اس کے اور سامان کے درمیان کوئی فرق نہ رہنے دیا۔ کچھ ہی دیر بعد اوپر کی منزل پر رہنے والی دُبلی اطالوی عورت اپنے دو بیٹوں کے ساتھ کہیں سے لوٹی؛ تینوں کے ہاتھوں میں خریداری کی اشیا سے اوپر تک بھرا ایک ایک تھیلا تھا۔ جب اس نے فرنیچر کے درمیان بیٹھے کیسلر دیکھ کر پہچانا تو اس کے منھ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے چلّا کر کیسلر سے اطالوی زبان میں کچھ کہا تھا مگر اس نے عورت پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ جھک کر کھڑی ہو گئی، اَور بھی پستہ قد دکھائی دینے لگی، اور اپنے دبلے بازو ہلا ہلا کر غصے کے عالم میں منھ سے بے تحاشا الفاظ اگلنے لگی۔ اس کے بیٹوں نے اسے بہلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ چلّاتی رہی۔ کئی پڑوسی یہ دیکھنے کو نیچے اتر آئے کہ یہ کون فضیحتا کر رہا ہے۔ آخر کار جب دونوں بیٹوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں تو انھوں نے اپنے تھیلے زمین پر رکھے، کیسلر کو کرسی پر سے اٹھایا اور اسے بغلوں میں ہاتھ دے کر اوپر لے گئے۔ کیسلر کے دوسرے پڑوسی ہوفمان نے تالے کو چھوٹی سی تکونی ریتی سے کاٹ کر کھول دیا، اور کیسلر کو اٹھا کر اُسی فلیٹ میں واپس لے جایا گیا جہاں سے نکالا گیا تھا۔ اگنیس ہر کسی پر چلّاتا، گندی گالیاں بکتا رہا، مگر تینوں آدمی دوبارہ نیچے گئے اور کیسلر کی کرسیاں، ٹوٹی ہوئی میز، درازوں والی الماری اور دھات کی قدیم چارپائی بھی اٹھا کر اوپر پہنچا دی۔ انھوں نے تمام فرنیچر بیڈروم میں ڈھیر کر دیا۔ کیسلر چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ کچھ دیر بعد جب بوڑھی اطالوی عورت نے گرم گرم میکرونی سے بھرے سُوپ کا پیالہ ٹماٹر کی چٹنی اور پنیر کی ہوائیاں ڈال کر بھیجا تب وہ رخصت ہوئے۔

اگنیس نے گروبر کو فون کیا۔ مالک مکان اس وقت کھانا کھا رہا تھا، اور کھانا اس کے گلے میں اٹک گیا۔ "میں ان سب حرام زادوں کو نکال دوں گا،" وہ دہاڑا۔ اس نے اپنا ہیٹ لگایا، گاڑی میں بیٹھا اور کیچڑ میں سے ہوتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس دوران وہ مسلسل اپنی پریشانیوں کے بارے میں سوچتا رہا: مرمت کے

بڑھتے ہوئے اخراجات؛ عمارت کو کھڑا رکھنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے، کہیں ایک روز گر ہی نہ پڑے۔ اس نے ایسے واقعات پڑھ رکھے تھے کہ اچانک عمارت کا سامنے کا کچھ حصہ باقی عمارت سے الگ ہوا اور ٹوٹتی ہوئی لہر کی طرح گلی میں آرہا۔ گروبر کھانے پر سے اٹھا دینے پر بڈھے کو کوسنے لگا۔ عمارت میں پہنچ کر اس نے اگنیس کے ہاتھ سے چابیاں جھپٹیں اور ڈولتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اگنیس نے اس کے پیچھے پیچھے آنے کی کوشش کی مگر گروبر نے اسے اپنے بِل میں جا کر مرنے کی ہدایت کی۔ جب مالک مکان کی نظر ہٹی تو اگنیس چپکے چپکے پھر اوپر جانے لگا۔

گروبر نے تالا کھولا اور کیسلر کے تاریک فلیٹ میں داخل ہوگیا۔ اس نے ڈوری کھینچ کر بتی جلائی اور بوڑھے کو ڈھیلے ڈھالے انداز میں چارپائی کی پٹی پر بیٹھا ہوا پایا۔ فرش پر اس کے پیروں کے پاس سوکھ کر اکڑے ہوئے میکرونی کا پیالہ دھرا تھا۔

"تُو یہاں کیا کررہا ہے بڈھے؟" گروبر نے دہاڑ کر پوچھا۔

بوڑھا بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

"تجھے پتا نہیں یہ قانون کی خلاف ورزی ہے؟ یہ کسی کے گھر میں زبردستی گھسنا ہے اور تو نے قانون توڑا ہے۔ جواب دے!"

کیسلر چپ رہا۔

گروبر نے زرد پڑے ہوئے بڑے سے رومال سے ماتھا پونچھا۔

"دیکھو، میرے دوست، تم خود کو بڑی مصیبت میں ڈال رہے ہو۔ اگر وہ تمھیں یہاں سے گرفتار کرلیں تو تمھیں ورک ہاؤس جانا پڑے گا۔ میں تو صرف تمھیں سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں۔"

اسے تعجب ہوا جب کیسلر نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں اس کی طرف اٹھائیں جن میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

"میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟" وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ "ایسے آدمی کو کون نکالتا ہے جو دس سال سے رہ رہا ہو اور ہر مہینے وقت پر کرایہ دیتا ہو؟ میں نے آخر کیا کیا ہے، یہ تو بتاؤ۔ کون کسی کو بلاوجہ تکلیف پہنچاتا ہے؟ تم ہٹلر ہو یا یہودی؟" وہ ہاتھ کا گھونسا بنا کر اپنا سینہ پیٹ رہا تھا۔

گروبر نے اپنا ہیٹ اتارا۔ اس نے غور سے بات سنی، پہلے تو چکرایا کہ کیا جواب دے، مگر پھر بولا: "سنو کیسلر، مجھے تم سے کوئی ذاتی شکایت نہیں۔ یہ مکان میرا ہے اور گرا جارہا ہے۔ مرمت کے بِل آسمان سے باتیں کررہے ہیں۔ جو کرایہ دار مکان کی دیکھ بھال نہ کرسکے اسے مکان چھوڑنا پڑتا ہے۔ تم ایک تو خیال نہیں رکھتے، پھر میرے مستری سے لڑتے بھی ہو، اس لیے تمھیں فلیٹ چھوڑنا پڑے گا۔ صبح یہاں سے چلے جانا، اس کے بعد میں ایک لفظ نہ کہوں گا۔ لیکن اگر صبح تک تم نہیں گئے، تو تمھیں پھر ڈنڈا ڈولی کرکے نکالا جائے گا۔ میں مارشل کو دوبارہ بلاؤں گا۔"

"مسٹر گروبر،" کیسلر نے کہا۔ "میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ آپ چاہیں تو مجھے قتل کردیں مگر میں

جاؤں گا نہیں۔"

گروبر غصّے میں بھرا ہوا باہر نکلا تو اگنیس جلدی سے بھاگ گیا۔ اگلی صبح، پریشانیوں بھری بے چین رات گزار کر، مالک مکان ستّی مارشل کے دفتر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں وہ ایک کینڈٹی کی دکان پر سگریٹ کا ڈبا لینے کے لیے رکا، اور وہاں فیصلہ کیا کہ کیسلر سے ایک بار پھر بات کرلی جائے۔ اسے ایک ترکیب سوجھی تھی: وہ کسی پبلک ہوم میں بوڑھے کیسلر کے رہنے کا بندوبست کرانے کی پیش کش کرے گا۔

وہ گاڑی چلاتا ہوا عمارت پہنچا اور اگنیس کے دروازے پر دستک دی۔

"کیا بڈھا اب تک وہیں ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں مسٹر گروبر۔" مستری بے آرامی سی محسوس کر رہا تھا۔

"معلوم نہیں کا کیا مطلب ہوا؟"

"میں نے اسے باہر جاتے نہیں دیکھا۔ اس سے پہلے میں نے تالے کے چھید میں سے جھانک کر دیکھا تھا، ہلنے جلنے کی کوئی آواز نہیں تھی۔"

"تو پھر تم نے اپنی چابی سے دروازہ کھولا کیوں نہیں؟"

"مجھے ڈر لگ رہا تھا،" اگنیس نے سٹ پٹا کر جواب دیا۔

"کاہے کا ڈر؟"

اگنیس کچھ نہ بتا سکا۔

خوف کی ایک لہر گروبر کے وجود میں سے گزری مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس نے چابیاں جھپٹیں اور سنگین قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگا، تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کی رفتار تیز ہو جاتی۔

دروازہ کھٹکھٹانے پر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ تالا کھولتے ہوئے اسے بے تحاشا پسینا آ گیا۔

مگر بوڑھا موجود تھا، زندہ تھا، اور جوتے اتارے، بیڈروم کے فرش پر بیٹھا تھا۔

"سنو، کیسلر،" مالک مکان نے، سر میں ہونے والی دھمک کے باوجود سکون محسوس کرتے ہوئے، کہا۔ "مجھے ایک خیال آیا ہے۔ اگر میرے کہے پر عمل کرو تو تمھاری مشکلیں حل ہو جائیں گی۔"

اس نے کیسلر کو اپنی تجویز اچھی طرح سمجھائی، مگر انڈے چھانٹنے والا بوڑھا سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں اور جسم دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ جب مالک مکان اپنی بات کر رہا تھا، وہ اُن خیالوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو باہر فٹ پاتھ پر گرتی [illegible] ن کے نیچے بیٹھے ہوئے اس کے ذہن میں چکراتے رہے تھے۔ اس وقفے میں اس کے ذہن میں اس کی پوری قابلِ رحم زندگی پھر گئی تھی۔ اسے یاد آیا تھا کہ کس طرح جوانی کے دنوں میں وہ اپنی بیوی اور تین معصوم بچوں کو چھوڑ کر نکل آیا تھا، اور اس کے بعد خبر تک نہ لی تھی کہ ان کی گزر بسر کیسے ہوتی ہے، بلکہ اس نے تو — خدا اس پر رحم کرے — ان تمام برسوں میں یہ تک معلوم کرنے کی کوشش نہ کی تھی کہ وہ جیتے ہیں یا مر گئے۔ اتنی مختصر

سی زندگی میں کوئی شخص اس قدر غلط کار کیوں کر ہو سکتا ہے؟ یہ خیال اس کے دل تک اُتر گیا اور وہ بے اختیار اپنے ماضی کو یاد کر کر کے کراہتا اور ناخنوں سے اپنی بوٹیاں نوچتا رہا۔

کیسلر کو اس قدر مصیبت زدہ دیکھ کر گروبر کو خوف آنے لگا۔ اسے یہیں پڑا رہنے دوں، اسے خیال آیا۔ پھر بوڑھے پر نظر ڈال کر اسے احساس ہوا کہ وہ فرش پر اپنے گھٹنے بازوؤں میں گھیرے ہوئے دراصل سوگ میں بیٹھا ہے۔ کچھ کھائے پیے بغیر، کم زوری سے سفید، ہولے ہولے جھولتا ہوا، وہ فرش پر بیٹھا ہے اور اس کی داڑھی، پہلے سے کہیں پتلی، محض اپنا سایہ رہ گئی ہے۔

کوئی بات ضرور ہوئی ہے۔۔ گروبر سوچنے لگا کہ کیا بات ہو سکتی ہے۔ اسے کمرے میں سخت گھٹن محسوس ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر باہر نکل جائے، مگر پھر اس نے اپنے تصور میں خود کو سیڑھیوں پر الجھ کر گرتے اور لڑھک کر پانچ زینوں سے نیچے جاتے ہوئے دیکھا: اپنے شکستہ جسم کو سیڑھیوں کے نیچے پڑا دیکھنے کے خیال پر اس کے منھ سے ایک کراہ نکل گئی۔ وہ کیسلر کے کمرے میں تنہا بیٹھا اسے منھ ہی منھ میں دعائیں پڑھتے دیکھ رہا تھا۔ کوئی مر گیا ہے، گروبر بڑبڑایا۔ اسے خیال آیا کہ کیسلر کو کوئی بُری خبر ملی ہے، مگر وہ اپنے دل میں جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ تب اچانک ایک خیال ہولناک قوت کے ساتھ اس کے ذہن میں کوندا کہ بوڑھا دراصل اس کا ماتم کر رہا ہے: مرنے والا وہ خود ہے۔

مالک مکان سخت کرب کی حالت میں تھا۔ وحشیانہ انداز میں پسینے پسینے ہوتے ہوئے اس نے اپنے اندر کسی بھاری سخت چیز کو آہستہ آہستہ اوپر کی طرف چڑھتا محسوس کیا، یہاں تک کہ اس کا سر بالکل پھٹنے کو ہونے لگا۔ پورا ایک منٹ اس نے اپنے جسم پر فالج کے حملے کے انتظار میں گزارا؛ مگر یہ احساس سخت تکلیف کے ساتھ رفتہ رفتہ گزر گیا اور اسے نہایت قابلِ رحم حالت میں چھوڑ گیا۔

جب کچھ دیر بعد اس نے ادھر اُدھر نظر ڈالی تو کمرے کو بالکل صاف ستھرا اور دن کی روشنی اور خوشبو میں دھلا ہوا پایا۔ تب گروبر کو بوڑھے کے ساتھ اپنے سلوک پر ناقابلِ برداشت پشیمانی محسوس ہونے لگی۔

رفتہ رفتہ یہ پشیمانی اس کے بس سے باہر ہو گئی۔ شرمندگی کی ایک بلند کراہ کے ساتھ اس نے کیسلر کی چارپائی پر بچھی چادر نوچ لی اور اسے اپنے بھاری جسم کے گرد لپیٹ کر آہستہ آہستہ فرش پر بیٹھتا چلا گیا اور ماتم کرنے لگا۔

**

(انگریزی عنوان: The Mourners)

Scanned with CamScanner

برنارڈ مالامڈ

انگریزی سے ترجمہ : اجمل کمال

دراز میں بند آدمی

مجھے خیال ہوا کہ دھیمی آواز میں "شالوم" کا لفظ سنائی دیا ہے، مگر ڈرائیور کے چہرے کے سلاوی نقوش کو دیکھتے ہوئے یہ بات غیر اغلب معلوم ہوتی تھی۔ وہ میرے ٹیکسی میں سوار ہونے کے بعد سے پیچھے دیکھنے والے آئینے میں مجھے مسلسل دیکھے جا رہا تھا، اور سچ بات یہ ہے کہ مجھے کچھ لمحاتی سا خوف بھی محسوس ہوا۔ میں سینتالیس سال کا ہوں، میرا وزن پچھلے دنوں کچھ کم ہوا ہے، لیکن یہ بات میں اپنے اضطراب کے بارے میں نہیں کہہ سکتا۔ پہلے پہل میرا خیال تھا کہ اس کی وجہ میرا امریکی لباس ہے۔ اس لباس میں آدمی پہچان لیا جانے والا اجنبی ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ شروع ہی سے میرا پیچھا کر رہا ہو، مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آخر یہ ٹیکسی یوں ہی پاس سے گزر رہی تھی جسے خود میں نے ہاتھ ہلا کر روک لیا تھا۔

اس نے اپنی شور مچاتی ہوئی قدیم زمانے کی وولگا میں مجھے لینن ہلز کے پاس سے بٹھایا تھا جہاں میں تمام سہ پہر موسکو یونیورسٹی میں اور اس کے آس پاس مٹر گشت کرتا پھرا تھا۔ آخر کار جگہیں دیکھنے سے میرا جی بھر گیا اور جب مجھے یہ ٹیکسی دکھائی دی تو میں نے اسے آواز دی اور دونوں ہاتھ لہرائے۔ ڈرائیور جو بڑی تیزی میں گاڑی چلا رہا تھا، یک دم، آپ کہہ سکتے ہیں کہ صرف ایک کوپک کی خاطر، یوں رک گیا جیسے میں کوئی ایسا شخص ہوں جسے بٹھانے کے لیے وہ مرا جا رہا ہو؛ جیسے اس نے مجھے غلطی سے اپنا دوست سمجھا ہو۔ کیف کے علاقے میں اپنے حالیہ تجربوں کے بعد، غلطی سے دوست سمجھ لیا جانا ہرگز ایسی بات نہ تھی جس کا میں بُرا مانتا۔

جس لمحے ہماری مڈبھیڑ ہوئی تبھی سے ہماری آنکھیں ایک رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی پہچان میں ڈھلتی چلی

گئیں اگرچہ ہم ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی تھے۔ میں موسکو میں، "اِن ٹورسٹ" نامی سرکاری سیاحتی ادارے میں کام کرنے والی ایک آدھ لڑکی کو چھوڑ کر، کسی سے واقف نہ تھا۔ دھبوں پڑے آئینے میں ڈرائیور کا چہرہ کچھ بگڑا ہوا لگ رہا تھا، اس کا عکس مسخ سا ہوا جا رہا تھا؛ لیکن اس کی چھوٹی چھوٹی، چالاک اور متجسس آنکھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ٹٹولتی، پرکھتی، شک کرتی ہوئی وہ آنکھیں جاننے کی التجا کرتی معلوم ہو رہی تھیں: اسے کچھ بتا دو تو وہ شکر گزار ہو جائے گا، مگر کیوں اور کس وجہ سے، اس کا کچھ پتا نہ چلتا تھا۔ کچھ دیر اسی طرح گزری اور پھر، جیسے اس تمام معاملے کی تھکن اس کی برداشت سے باہر ہو گئی ہو، وہ یوں ظاہر کرنے لگا کہ اسے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔

ٹھیک ہی ہے، میں نے سوچا، لیکن کیا حرج ہے کہ وہ کبھی کبھار تھوڑا سا دھیان سڑک کی طرف بھی دے لیا کرے ورنہ ہم جہاں کہیں جا رہے ہیں وہاں کبھی نہ پہنچ سکیں گے۔ کہاں؟ مجھے احساس ہوا کہ یہ تو میں نے اسے بتایا ہی نہیں، کیوں کہ میں کچھ فیصلہ ہی نہ کر پایا تھا۔۔ کوئی بھی جگہ ہو، بس مجھے ابھی سے میٹروپول واپس نہ جانا پڑے۔ وہ دن ایسے دنوں میں سے تھا جب میں ہوٹل کے کمرے کو بالکل نہیں سہار سکتا تھا۔

"شالوم!" آخر اس نے اونچی آواز میں کہا۔

"تمھیں بھی شالوم۔" تو یہ میں نے واقعی سنا تھا! بھلا کون ایسی بات سوچ سکتا تھا؟ پھر ہم دونوں پُرسکون ہو گئے، اور سڑک پر مخالف سمتوں میں دیکھنے لگے۔

ٹیکسی ڈرائیور جون کے اس خنک دن بھی، جب درجۂ حرارت پچپن فارن ہائیٹ سے زیادہ نہ تھا، صرف قمیص پہنے بیٹھا تھا۔ اس کی عمر تیس اور چالیس کے درمیان رہی ہو گی اور دیکھنے میں وہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ وہ کھاتا ہے اس کے بدن کو نہیں لگتا۔۔ بعد میں سوچنے پر مجھے لگا کہ وہ غیر مطمئن قسم کا آدمی ہے اور اس کے چہرے پر تھکن کے آثار ہیں۔ اب، جب میں کچھ دیر اس کا مطالعہ کر چکا تھا، احساس ہوا کہ وہ بدشکل نہیں ہے، اگرچہ اس کا سر یوں معلوم ہوتا تھا کسی کے وزنی ہاتھ نے دبا کر تھوڑا سا پچکا دیا ہو اور کھوپڑی پر گھنے، صحت مند بال نہ ہوتے تو بالکل پچک گیا ہوتا۔ اس کا چہرہ، جیسا کہ میں نے بتایا، کچھ کچھ سلاوی خدوخال رکھتا تھا: گول ساخت، رخساروں کی ہڈیاں چوڑی، ٹھوڑی چھوٹی سی مگر مضبوط۔ لیکن ناک اس کی لمبی تھی، اور بالوں بھری پتلی گردن میں ایک بڑا نمایاں گڑھا محسوس ہوتا تھا۔ بہر کیف، "شالوم" نے اس کے ظاہری تاثر کو بدل سا دیا تھا، یہاں تک کہ چوکنی آنکھیں بھی اب مختلف لگ رہی تھیں۔ جون کے اُس خوش گوار دن وہ یقیناً غیر مطمئن معلوم ہو رہا تھا۔۔ کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ملازمت؟ تقدیر؟ شکل صورت؟ کیا؟۔۔ اور ایک بڑی عجب قسم کی اداسی اس پر چھائی ہوئی تھی، جو خدا جانے کہاں سے آ رہی تھی۔ اسے اس بات کی کچھ خاص پروا بھی نہیں لگتی تھی کہ اس کی حالت بالکل عیاں ہے، حالاں کہ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس طرح بے پروا ہو سکتا، یا ہونا چاہتا۔ یہ شخص تو بالکل کھلی کتاب معلوم ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے بہت زیادہ خوش حال نہیں تھا، لیکن بالکل زیرِ زمین رہنے والا بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ اپنی سیٹ پر سیدھا ہو کر

Scanned with CamScanner

بیٹھا تھا اور اس کا پورا وجود ڈرائیونگ میں منہمک معلوم ہوتا تھا، بلکہ کچھ کچھ بے تابی کے ساتھ۔ ایسی تفصیلات بھانپنے میں میری تجربہ کار آنکھ بہت تیز ہے۔

"اسرائیلی؟" اس نے سرگوشی میں سوال کیا۔

"امیریکانسکی۔" "مجھے روسی زبان نہیں آتی، بس دو چار تعارفی لفظ بول لیتا ہوں۔

اس نے اپنی قمیص کی جیب میں اندر تک ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پتلا سا پیکٹ نکالا اور بازو پوری سیٹ پر پھیلا دیا۔ اس کی اس حرکت سے وولگا ایک موڑ کاٹتے ٹرک سے بچنے کے لیے زور سے لہرائی۔

"احتیاط سے!"

میں جھونک میں آ کر ایک طرف جا گرا تھا، مگر اُس نے معذرت کا ایک لفظ تک نہیں کہا۔ ایک بلغاروی سگریٹ نکال کر، جسے پینے کا میں کچھ مشتاق نہ تھا۔۔ بہت تیکھا سگریٹ ہے۔۔ میں نے پیکٹ اسے لوٹا دیا۔ میں اسے جواباً اپنا خوش حال امریکی سگریٹ پیش کرنے پر غور کر رہا تھا، مگر پھر اس کی ہتک کا سوچ کر باز رہا۔

"فیلکس لیوبتانسکی،" وہ بولا۔ "آپ لیسے ہیں؟ میں ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔" وہ بڑے سخت اجنبی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا، مگر اس کی زبان میں روانی بہت تھی۔

"اچھا، انگریزی بول لیتے ہو؟ مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا۔"

"میرا پیشہ ترجمان کا ہے۔۔ انگریزی، فرانسیسی۔" اس نے کندھے ایک طرف کو اُچکائے۔

"میرا نام ہاورڈ ہورووٹز ہے۔ میں یہاں کچھ دن چھٹیاں گزارنے آیا ہوں، کوئی تین ہفتے۔ میری بیوی کچھ عرصہ پہلے فوت ہوئی ہے اور میں، ایک حد تک، ذہن کو سکون دینے کے لیے سفر پر نکلا ہوں۔"

میری آواز ذرا اٹکی، مگر میں نے کہہ ہی دیا کہ اگر میں کسی رسالے کے لیے ایک آدھ مضمون کا مواد حاصل کر سکوں تو وہ بھی سہی۔

لیوبتانسکی نے ہمدردی کے اظہار میں دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ ویل سے اٹھا دیے۔

"دیکھ کے، خدا کے لیے!"

"ہورووٹز؟ یہی بتایا نا؟"

میں نے اپنے نام کے ہجے کیے۔ "دراصل میرے کالج میں داخلہ لینے کے بعد ہیرس ہو گیا تھا مگر حال ہی میں میں نے دوبارہ وہی نام رکھ لیا ہے۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد میرے باپ نے باقاعدہ قانونی طور پر تبدیل کرایا تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا، عملی قسم کا آدمی۔"

"تم مجھے یہودی نہیں لگتے۔"

"تو پھر تم نے شالوم کیوں کہا؟"

"کبھی کبھی آدمی یوں ہی کہہ دیتا ہے۔" ایک منٹ بعد اس نے پوچھا: "مگر کس لیے؟"

"کیا کس لیے؟"

Scanned with CamScanner

"نام دوبارہ کس لیے بدلا؟"

"میری زندگی میں بحران آگیا تھا۔"

"وجودی بحران؟ معاشی بحران؟"

"سچ بات یہ ہے کہ بیوی کے مرنے کے بعد میں نے دوبارہ پہلے والا نام رکھ لیا۔"

"اس کے کیا معنی؟"

"معنی یہ کہ اب میں اپنے اصل وجود سے زیادہ نزدیک ہوں۔"

ڈرائیور نے ماچس کی تیلی اپنے انگوٹھے کے ناخن پر رگڑی اور سگریٹ سلگایا۔

"میں بس رسماً یہودی ہوں،" وہ بولا، "گو میرا باپ -- اورنام اسحا کووچ لیوبتانسکی -- واقعی یہودی تھا۔ چوں کہ میری ماں غیر یہود تھی، اس لیے مجھے انتخاب کا موقع دیا گیا، لیکن میری ماں نے اصرار کر کے میرے اندرونِ ملک پاسپورٹ پر یہودی قومیت لکھوائی، میرے باپ کے احترام میں۔ میں نے مان لیا۔"

"واقعی؟"

"میں چھوٹا تھا جب میرے باپ کا انتقال ہوا۔ میری پروان -- پرورش؟ -- اس طرح ہوئی کہ میں یہودیوں اور یہودی مذہب کا احترام کرنے لگا، مگر میرا راستا اور ہے۔ میں ملحد ہوں۔ ملحد ہونا تقریباً ناگزیر ہے۔"

"یعنی سوویت طرزِ زندگی کی وجہ سے؟"

لیوبتانسکی جواب دیے بغیر سگریٹ پیتا رہا اور مجھے اپنے سوال پر شرمندگی ہونے لگی۔ میں نے یہ جاننے کے لیے باہر دیکھا کہ اس علاقے کو پہچانتا ہوں یا نہیں۔ اب اسے خیال آیا اور اس نے پوچھا: "کس طرف؟"

میں ابھی تک پچھلے موضوع پر اٹکا ہوا تھا، اسے بتانے لگا کہ میں خود بھی کچھ زیادہ یہودی نہیں ہوں۔ "میرے ماں باپ بالکل ضم ہو چکے تھے۔"

"اپنی خوشی سے؟"

"بالکل، اپنی خوشی سے۔"

"کیا آپ،" تب اس نے پوچھا، "آرخی پووا اسٹریٹ پر مرکزی سیناگوگ دیکھنا پسند کریں گے؟ بہت دل چسپ تجربہ ہوگا۔"

"اس وقت نہیں،" میں نے کہا۔ "ابھی تو مجھے سادووایا کدرِنسکایا اسٹریٹ پر چیخوف میوزیم لے چلو۔"

اس پر ڈرائیور نے بظاہر سکون کا سانس لیا۔

Scanned with CamScanner

روز، میں نے خود سے کہا۔

میں نے اپنی ناک سنکی۔ اُس کی موت کے بعد میں نے سوویت یونین کا منصوبہ بنایا تھا مگر خود کو چلنے پر آمادہ نہ کر پایا۔ میں کسی صدمے سے سنبھلنے کے معاملے میں خاصا سُست آدمی ہوں، مگر ویسے مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ اہم معاملات میں فوری فیصلہ کرنے میں مجھے شروع ہی سے دقت پیش آتی رہی ہے۔ آٹھ مہینے بعد، جب میں تقریباً اپنا سامان باندھ رہا تھا، مجھے محسوس ہوا کہ جس ذہنی سکون کی مجھے تلاش ہے اس کا تعلق، ذہن پر سوار معاملے سے قطعِ نظر، کچھ اس بات سے بھی ہے کہ مجھے غیر متوقع طور پر ایک گمبھیر ذاتی فیصلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ تنہائی سے اُکتا کر، موسمِ بہار میں، میں اپنی سابقہ بیوی، لیلین، سے دوبارہ ملنے لگا تھا؛ اور، چوں کہ اس نے دوبارہ شادی نہیں کی تھی اور اب تک پُرکشش تھی، ہمارے درمیان دوبارہ شادی کرنے کے بارے میں دبی دبی بات ہونے لگی تھی، جس پر مجھے تعجب تھا۔ ایسی باتیں، آدمی کو خبر ہوئے بغیر، ایک جملے سے دوسرے جملے تک آتے آتے ہاتھ سے پھسل جاتی ہیں۔ اگر ہم سچ مچ شادی کر لیتے تو روس کے اس سفر کو ایک قسم کے ہنی مون کی شکل دے سکتے تھے —— میں "دوسرا ہنی مون" تو نہیں کہوں گا، کیوں کہ ہم نے کوئی خاص پہلا ہنی مون نہیں منایا تھا۔ آخر کار، کیوں کہ ہماری زندگیاں اس قدر پیچیدہ ہو چکی تھیں، اور ایک دوسرے میں اس قدر مخل ہوتیں، کہ مجھے فیصلہ کرنا ناممکن معلوم ہوا، اگرچہ مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ لیلین اسے آزمانے پر تیار محسوس ہوتی تھی۔ میرے احساسات خود مجھ پر اس قدر غیر واضح تھے کہ میں نے کچھ بھی فیصلہ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیلین نے، جو بالکل سیدھی سوچ اور وکیلوں کا سا ذہن رکھتی ہے، مجھ سے پوچھا کہ کیا اس تجویز سے میری دل چسپی ختم ہو رہی ہے، اور میں نے اسے بتایا کہ اپنی بیوی کے مرنے کے بعد سے میں اپنی زندگی کا جائزہ لے رہا ہوں اور مجھے یہ جاننے میں ابھی کچھ اَور وقت لگے گا کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔ "اب بھی؟" وہ بولی۔ اس کی مراد زندگی کا جائزہ لینے سے تھی اور میں نے سوچا اس کا اشارہ اس طرف ہے کہ اس میں ساری عمر لگ جائے گی۔ میں جواب میں صرف اتنا کہہ سکا: "ہاں، اب بھی،" اور پھر، ذرا غصے سے یہ کہ "ہاں، ساری عمر۔" بعد میں میں نے خود کو انتباہ کیا: آئندہ اس قسم کی پیچیدہ بحثوں سے خبردار رہو۔

خیر، تو یہ معاملہ یوں ختم ہوا۔ وہ کوئی خاص مسرور شام نہیں تھی، اگرچہ مسرّت کے لمحے اس میں آتے رہے۔ ایک وقت تھا کہ میں لیلین سے واقعی محبت کرتا تھا۔ تب میں نے سوچا کہ منظر کی تبدیلی، شاید مہینے بھر کی چھٹیوں پر باہر کا سفر، فائدہ مند بات ہو گی۔ میں بہت عرصے سے سوویت یونین کا سفر کرنا چاہ رہا تھا، اور تنہائی میں کچھ وقت گزارنے کی بھی خواہش رکھتا تھا، اور مجھے امید تھی کہ اگر اس دوران مجھے اپنی ذہنی اُلجھنیں سلجھانے کا بھی موقع مل جائے تو اس سفر کا حاصل اَور بڑھ جائے گا۔

چناں چہ جب مجھے ویزا مل گیا تو مجھے یہ محسوس کر کے حیرت ہوئی، گو اتنی زیادہ بھی نہیں، کہ میری توقعات خاصی مدّھم پڑ گئی ہیں اور مجھے کچھ بے چینی سی ہونے لگی ہے۔ میں نے اسے سفر کے خوف پر محمول کیا جو مجھ پر بعض اوقات طویل سفر سے پہلے طاری ہو جاتا ہے، اور روانہ ہونے سے پہلے مجھے اس خوف

Scanned with CamScanner

سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ کیا میں خیریت سے پہنچ جاؤں گا؟ کہیں جہاز کو ہائی جیک نہ کر لیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنگ چھڑ جائے اور میں خود کو بھاری توپوں میں گھرا ہوا پاؤں۔ صاف بات یہ ہے کہ، خواہ میں اس خیال کی کتنی ہی مزاحمت کروں، میں ہوں دراصل ایک تشویش زدہ آدمی، جس کا مطلب، اگر میں خود کو سمجھانا شروع کروں تو، یہ نکلتا ہے کہ میرا ایک پیر حال کے لمحے میں رہتا ہے اور دوسرا آنے والے لمحے میں۔ میں نہایت عجلت کے عالم میں بے حرکت بیٹھا رہتا ہوں، مستقبل کے بارے میں بے مصرف فکروں میں الجھتا ہوں، اور ایک ضرورت سے زیادہ وزنی ضمیر کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہوں۔

مجھے احساس ہوا کہ سوویت روس میں داخل ہونے کے بارے میں جو باتیں مجھے پریشان کر رہی ہیں وہ کسی سوویت شہر میں کسی سیاح یا اتفاقی مسافر کے ساتھ پیش آنے والی وہ کہانیاں ہیں جو میں نے اخباروں میں پڑھ رکھی ہیں، کہ اسے سیکرٹ پولیس نے "جاسوسی"، "غیر قانونی معاشی سرگرمی"، "غنڈہ گردی" یا ایسے ہی کسی الزام میں گرفتار کر لیا۔ اس غریب کو، جو مثلاً سڈبری، ماساچوسٹس، کا بھی ہو سکتا ہے، اس وقت تک قید تنہائی میں رکھا گیا جب تک اس نے اعتراف نہ کر لیا، اور اعتراف کے بعد اسے سائبیریا کے دشوار خطے میں واقع کیمپ میں سزا کی معیاد کاٹنے کے لیے بھجوا دیا گیا۔ ویزا ملنے کے بعد مجھے کبھی کبھی اس طرح کے خیالات آتے تھے کہ کسی اجنبی نے پہلے میرے ہاتھ میں ایک موٹا سا پلندا تھما دیا، اور پھر، جب میں نہایت حماقت کے عالم میں اسے پڑھنے میں محو تھا، آ کر مجھے گرفتار کر لیا — ظاہر ہے کہ جاسوسی کے الزام میں۔ ایسی صورت میں میں کیا کروں گا؟ میرا خیال ہے جوں ہی وہ مجھے پلندا تھمائے گا، میں اسے وہیں سڑک پر پھینک کر چیخنے لگوں گا: "یہ ترکیب مجھ پر آزمانے کی ضرورت نہیں، میں روسی زبان پڑھنا نہیں جانتا۔" اور پھر اپنے باقی ماندہ وقار کو کام میں لاتے ہوئے آگے چل دوں گا، اس امید میں کہ میری اس جرأت پر انھیں سانپ سونگھ گیا ہو گا۔ خطرے میں گھرا ہوا آدمی اگر آگے بڑھ جائے تو بے پروا اور معصوم معلوم ہوتا ہے۔ کم از کم اپنی نظروں میں۔ تب میں اپنے ذہن میں پیچھا کرتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنتا ہوں، اور چوں کہ میرے خیالوں کی رو معقولیت پر بنیاد رکھتی ہے، کے جی بی کے دو تگڑے افسر آ کر مجھے پکڑ لیتے ہیں اور میرے دونوں بازو موڑ کر مجھے گرفتار کر لیتے ہیں۔ میری توقع کے برخلاف، سڑک پر کوڑا پھیلانے کے الزام میں نہیں، بلکہ "دستاویزی شہادتوں کو ضائع کرنے کی کوشش" کے الزام میں، اور اس الزام کو رد کرنا بے حد دشوار ہے۔

میں لیچ ہوروونز کو، خود کو، چیختے چلاتے، گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے، ادھر ادھر لاتیں چلاتے دیکھتا ہوں، یہاں تک کہ کسی شخص کی بدبودار ہتھیلی اس کا منہ سختی سے بند کر دیتی ہے اور کھوپڑی کی پشت پر پڑنے والے زوردار گھونسے کے بعد، جس کا ذکر غیر ضروری ہے، ایک اعلیٰ تر قوت اسے گھسیٹ کر اس ناگزیر زِیس گاڑی میں سوار کر دیتی ہے جس کے بارے میں پڑھتا رہتا ہوں اور جسے فلموں کے اسکرین پر بھی دیکھ چکا ہوں۔

سرد جنگ ایک خوفناک معاملہ ہے، اور میرا خیال ہے بعض لوگوں کے لیے نسبتاً زیادہ خوفناک۔

کبھی کبھی میری خواہش ہوتی ہے کہ جاسوسی کے طریقے ترقی کی اس معراج پر پہنچ جائیں کہ یو ایس ایس آر اور یو ایس اے دونوں ایک دوسرے کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات سے واقف ہو جائیں، اور ہوش مندانہ طریقے سے کمپیوٹروں کا تبادلہ کر کے اس معلومات میں ہونے والے اضافے ایک دوسرے کو فراہم کر دیا کریں، اور اس کے بعد ایک دوسرے کا پیچھا چھوڑ دیں۔ اس سے جاسوسی کا کاروبار بالکل تباہ ہو جائے گا؛ دنیا میں خاصی معقولیت آ جائے گی اور مجھ جیسے لوگوں کے لیے سوویت یونین کے سفر کا خیال محض مسرت پر محیط ہو گا۔

جون کے وسط کی ایک سہ پہر کو پیرس سے آنے والی پرواز سے کیف ایرپورٹ پر اترتے ہی مجھے ایک قسم کی دہشت نے گھیر لیا۔ کسٹم کے ایک اہلکار نے میرے سوٹ کیس میں سے Visible Secrets کی پانچ کاپیاں برآمد کر کے ضبط کر لیں۔ یہ شاعری کا ایک انتخاب ہے جسے میں نے ہائی اسکول کے طلبا کے لیے چند سال پہلے مرتب کیا تھا، اور اس خیال سے ساتھ لے آیا تھا کہ اگر ایسے روسیوں سے ملاقات ہوئی جنھیں امریکی شاعری سے دل چسپی ہو تو انھیں دے دوں گا۔ مجھے ایک فارم پر دستخط کرنے کو کہا گیا جسے اس اہلکار نے بڑی احتیاط سے، سریلی رسم خط میں، پُر کیا تھا؛ صرف کتاب کا نام انگریزی حروف میں لکھا تھا اور Secrets کے لفظ کو خط کشیدہ کر دیا تھا۔ یونیفارم پہنے ایک کسٹم افسر نے، جو ایک بھاری بدن اور چھوٹے سے سر والا آدمی تھا جس کے سر پر چھدرے بالوں کی پتلی سی تہہ تھی، بتایا کہ جس دستاویز پر مجھے دستخط کرنے کو کہا جا رہا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ میں اس بات سے واقف ہوں کہ سوویت یونین میں کسی غیر ملکی کتاب کی پانچ کاپیاں لانا ممنوع ہے؛ لیکن میری ملکیت مجھے موسکو ایرپورٹ پر ملک سے رخصت ہوتے وقت واپس مل جائے گی۔ میں نے پریشان ہو کر سوچا کہ شاید مجھے دستخط نہیں کرنے چاہییں لیکن ان ٹورسٹ سے تعلق رکھنے والی گائیڈ نے اصرار کیا کہ میں دستخط کر دوں۔ وہ بلونڈ کیے ہوئے بالوں والی ایک خاتون تھی جس کی ایڑیاں چلتے میں گھومتی رہتی تھیں اور جس کی شکل صورت اور خوش مزاجی نے مجھے کم و بیش پُرسکون رکھا، ورنہ مارے غصے کے میرے کپڑوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس نے کہا کہ یہ کوئی ایسا اہم معاملہ نہیں ہے اور یہ کہ مجھے جلدی سے دستخط کر دینے چاہییں کیوں کہ ہمیں دنیاپرو ہوٹل روانہ ہونے میں دیر ہو رہی ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر میں نے سوال کیا کہ اگر میں کتابوں سے دست بردار ہو جاؤں اور واپسی پر انھیں طلب نہ کروں تب کیا ہو گا۔ ان ٹورسٹ والی گائیڈ نے کسٹم افسر سے دریافت کیا، جس نے بڑے سکون، سنجیدگی اور تفصیل کے ساتھ وضاحت کی۔

''یہ کہہ رہے ہیں،'' وہ بولی، ''کہ سوویت یونین کسی غیر ملکی سیاح سے اس کی ملکیت چھیننے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔''

چوں کہ اس شہر میں گزارنے کے لیے میرے پاس صرف چار دن تھے اور وقت تیزی سے، معمول سے زیادہ تیزی سے، گزر رہا تھا، میں نے ہچکچاتے ہوئے اس کاغذ اور اس کی چار کاربن کاپیوں پر -- جو شاید

کتاب کی کاپیوں کی تعداد کے حساب سے تعین یا ممکن ہے پانچ پُراسرار سرکاری شعبوں کے استعمال کے لیے ہوں -- دستخط کر دیے۔ اس کی ایک نقل مجھے ملی جسے میں نے اپنی بلوں والی فائل میں لگا لیا۔

اس واقعے کے باوجود -- اس کا مزاحیہ پہلو بھی میرے سامنے تھا -- اور اس تنہائی کے باوجود جو مجھے عموماً کسی اجنبی شہر میں چند روز تک محسوس ہوتی ہے، میں نے کیف میں اپنا وقت آسانی اور دل چسپی سے گزارا۔ صبحوں کو مجھے پرائیویٹ گاڑیوں میں پہاڑی علاقے میں واقع اس سرسبز اور کشادہ سڑکوں والے شہر میں گائیڈڈ ٹورز پر لے جایا جاتا جہاں کے رنگ دبے دبے انداز میں روم کی یاد دلاتے تھے۔ سہ پہروں کو میں تنہا پھرا کرتا۔ میں کسی بھی بس یا اسٹریٹ کار میں سوار ہو کر سیر کا آغاز کرتا، چند کلومیٹر جا کر اتر جاتا اور آس پاس کے کسی محلے میں آوارہ گردی کرتا رہتا۔ ایک بار میں بھٹک کر دہقانوں کے ایک ہاٹ بازار میں جا نکلا جہاں اجتماعی فارموں پر کام کرنے والے اور دیہاتی -- انیسویں صدی کے روسی ناولوں سے نکلے ہوئے، داڑھیوں اور بُوٹوں والے کردار -- شہر کے باشندوں کے ہاتھ اپنی پیداوار بیچ رہے تھے۔ خیال آیا کہ مجھے اس کے بارے میں روز کو ضرور لکھنا چاہیے -- میرا مطلب ہے لیلین کو۔ ایک اور موقعے پر ایک ویران گلی سے گزرتے ہوئے مجھے اچانک کسٹم والی رسید کا خیال آ گیا اور میں یہ دیکھنے کے لیے پلٹ پڑا کہ کہیں میرا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا ہے۔ ایسی کوئی بات نہ تھی، مگر مجھے ایڈونچر کا لطف ضرور آیا۔

جو تجربہ میرے لیے اس سے قدرے کم پُرلطف تھا ایک شام کو دیر گئے پیش آیا جب میں دنیاپرو کے کنارے کھڑی کشتیوں کے ساتھ ساتھ بھٹک کر کئی کلومیٹر دور جا نکلا۔ میں کشتیوں کو اور جزیروں پر بنی بیچوں کو سراہتا ہوا دریا کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا اور بے خبری کے عالم میں خاصی دور جا پہنچا۔ اب میں واپس ہوٹل پہنچنا چاہتا تھا کیوں کہ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے پیدل واپس جانا مناسب نہ سمجھا -- تین دن میں ضرورت سے زیادہ سیاحی ہو چکی تھی -- اور ٹیکسی لینے کا ارادہ کیا۔ ٹیکسی مجھے آس پاس کوئی دکھائی نہ دی تو سوچا کہ کسی بس میں بیٹھ جاؤں جو اس سمت میں جا رہی ہو جدھر سے میں آیا تھا۔ میں نے ایک دو راہگیروں سے بھی، انگریزی میں، ٹوٹی پھوٹی جرمن میں، اور فرانسیسی "پاردونے مُوا" کا سہارا لے کر، بات کرنے کی کوشش کی، لیکن نتیجہ ہر بار یہی رہا کہ وہ گھبرا کر آگے بڑھ گئے۔ ایک نوجوان عورت تو چند قدم عجیب سے انداز میں دوڑ پڑی اور مجھ سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر اپنی معمول کی چال پر واپس آئی۔ پھر میں آنکھوں کے علاج کی ایک دکان میں داخل ہوا اور پچاس برس عمر کی ایک بظاہر پیشہ ور عورت سے، جو ناک پر بغیر کمانیوں کی عینک، بالوں پر جالی دار غلاف اور کپڑوں کے اوپر سفید اوور آل پہنے بیٹھی تھی، رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جب میں نے انگریزی میں اس سے خطاب کیا تو کوئی پانچ سیکنڈ تک تو وہ حیرت زدہ سی سنتی رہی، پھر اس کا چہرہ پتھرا گیا اور اس نے میری طرف سے منھ پھیر لیا۔ میں نے جلدی جلدی اپنی روسی اصوات کی رہنما کتاب کے ورق الٹے اور اس سے سوال کیا: "ہوٹل کہاں ہے؟" اور پھر اس میں "دنیاپرو" کے لفظ کا اضافہ کر دیا۔ اس نے جواب میں مجھے ایک زوردار "نیئت"

Scanned with CamScanner

(نہیں) پیش کیا۔ "تا کسی؟" میں نے پوچھا۔ پھر "نیئت،" اور اس بار اس نے اپنے متلاطم سینے پر ہاتھ بھی مارا۔ مجھے خیال ہوا کہ ہم دونوں سیر ہو چکے ہیں، سو میں باہر نکل آیا۔ اگرچہ اس وقت تک میں خاصا برگشتہ اور برافروختہ ہو چکا تھا، پھر بھی میں نے ساتھ ساتھ جاتے دو راہگیروں سے بات کی، جن میں سے ایک تو ناک کی سیدھ میں نظر جمائے تیزی سے آگے بڑھ گیا اور دوسرے نے اشارے سے خود کو گونگا بہرا ظاہر کیا۔ بے اختیاری کے ایک لمحے میں میں نے اس پر اپنی اٹکتی ہوئی یدش زبان، جو مجھے بچپن میں میرے دادا نے سکھائی تھی، آزمائی اور تب، اسی زبان اور دبی ہوئی آواز میں، مجھے قریبی بس اسٹاپ تک جانے کا راستا معلوم ہو سکا۔

جس وقت میں اپنے کمرے کا تالا کھول رہا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ یہ قصہ اپنے دوستوں کو پورے جاڑوں سناتا رہوں گا، اندر میرے فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ دوسری جانب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ اس کی موسیقی آمیز روسی زبان کی طویل گفتگو میں میں فقط "گوسپودین گاروتز" اور ایک آدھ اور لفظ سمجھ سکا۔ اس کی آواز میں کسی گلوکارہ کی آواز کا سا لوچ تھا۔ اگرچہ اس کی بات کا لبِ لباب میری سمجھ میں نہ آیا، لیکن وہ شے جسے آپ میرے خیالوں کی رو کہہ سکتے ہیں، پھر جاری ہو گئی اور میں نے بڑی واضح تصویر دیکھی کہ میں ایک حسین روسی دوشیزہ کے ساتھ، یاسنایا پولیانا کے قریب، سفید صنوبروں کے جنگل میں چلا جا رہا ہوں؛ پھر درختوں میں سے نکل کر ہم دونوں، بڑے اخلاص سے باتیں کرتے ہوئے، ایک مرغزار کی ڈھلان پر اترنے لگتے ہیں جس کے آخر پر ایک جھیل واقع ہے؛ اس کے بعد میں اسے کشتی میں بٹھا کر حسین جھیل کی سیر کرانے لگتا ہوں، اور ہم دونوں بالکل خاموش ہیں۔ خاصا پُرسکون معاملہ تھا۔ مجھے بلکہ اس قسم کے خیالات بھی آئے کہ اگر کسی روسی لڑکی سے رشتہ ہو جائے تو کیسا اچھا ہو۔ عمومی تصویر کچھ اسی قسم کی تھی، مگر جب اس نے اپنی بات پوری کی تو مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں نے انگریزی میں کہا جس پر اس نے فون بند کر دیا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد اس لڑکی کا، یا اُسی کی سی آواز والی کسی اور لڑکی کا، پھر فون آیا۔۔ میں صرف اس آواز کی موسیقیت کو پہچانتا تھا۔

"اگر تم انگریزی سمجھ لیتی ہو،" میں نے کہا، "یا تھوڑی بہت جرمن یا فرانسیسی۔۔ یا اگر تمھیں اتفاق سے یدش آتی ہے تو یدش سہی۔۔ تو ہمارا گزارا مزے سے ہو سکتا ہے۔ مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ روسی میں نہیں۔ نیئت رُسکی! مجھے تمھارے ساتھ لنچ پر، یا جہاں بھی تم کہو، جانے میں بڑی مسرت ہو گی؛ لہٰذا اگر میری بات کا مطلب تمھاری سمجھ میں آ رہا ہے تو تم جواب میں دا (ہاں) کہہ دو۔ اس کے بعد انگریزی کی ترجمان کا فون ملاؤ، یا ایکسٹنشن ۲۷۳ ڈائل کرو۔ وہ مجھے ساری تفصیل سمجھا دے گی اور پھر ہم تمھاری سہولت کے مطابق ملاقات کر سکیں گے۔"

میرا تاثر تھا کہ وہ میری بات دونوں کانوں سے سن رہی ہے، لیکن ذرا دیر بعد فون میرے ہاتھ میں بے جان ہو چکا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اسے میرا نام کہاں سے معلوم ہوا ہو گا، یا کوئی شخص یہ پتا لگانے کی

کوشش تو نہیں کر رہا ہے کہ مجھے روسی آتی ہے یا نہیں۔ مجھے واقعی روسی زبان بالکل نہیں آتی۔

اس کے بعد میں نے لیلیئن کو ایک مختصر سا خط لکھا، جس میں اطلاع دی کہ میں کل چار بجے سہ پہر ایروفلوٹ سے موسکو روانہ ہو رہا ہوں، اور یہ کہ میرا ارادہ وہاں، ایستوریا ہوٹل میں، دو ہفتے ٹھہرنے کا ہے جس کے دوران میں تین یا چار دن کے لیے لینن گراد جاؤں گا۔ میں نے اپنے پروگرام کی قطعی تاریخیں درج کیں اور اس کے بعد خط کو ایر میل کے لفافے میں بند کر کے ہوٹل سے کچھ فاصلے پر لگے ہوئے لیٹر بکس میں ڈال دیا، اب یہ جتنا بھی کار آمد ہو سکے۔ مجھے امید تھی کہ یہ خط لیلیئن کو اتنی جلد مل جائے گا کہ اس کا جواب میرے سوویت یونین کے قیام کے دوران ہی مجھ تک پہنچ سکے۔ سچ بات یہ ہے کہ میرا باقی پورا دن خاصی بے چینی میں گزرا۔

لیکن اگلی صبح تک میرا موڈ بدل چکا تھا، اور جس وقت میں دریائے دِینا پر سے اوپر کی طرف ایک پارک کے جنگلے کے پاس کھڑا تھا اور دریا کے دوسری جانب اس زمین پر بلند ہوتی عمارتوں کا نظارہ کر رہا تھا جو کبھی بیابان رہ چکی تھی، تو مجھے ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک وسیع و عریض تعمیر تھی -- بالکل یوں لگتا تھا جیسے دو تین چھوٹے چھوٹے شہر ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر زمین سے بلند ہو رہے ہوں -- اور میں اسے دیکھ کر حیران تھا۔ اس قسم کی تعمیرات پورے روس میں ہو رہی تھیں، اور جب میں نے اندازہ کرنے کی کوشش کی کہ محنت، سرمائے اور حوصلے کے اعتبار سے اس کا کیا مطلب ہے تو مجھے یقین ہو گیا کہ سوویت یونین کبھی ریاست ہائے متحدہ سے جنگ، نیوکلیئر یا کسی اَور طرح کی جنگ، نہیں چھیڑے گا۔ اور نہ ہی امریکا، اگر اس کا دماغ ٹھکانے پر رہا تو، سوویت یونین سے جنگ کرنے کا ارادہ کرے گا۔

روس آنے کے بعد سے یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے خود سلامت اور محفوظ محسوس کیا، اور تب دِینا پر دریا پر لگے ہوئے جنگلے پر کہنیاں ٹکا کر میں نے مسرّت کے چند لمحوں کا لطف اٹھایا۔

ایسا کیوں ہے کہ سب سے زیادہ دل چسپ فنِ تعمیر کے نمونے زاروں کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں؟ میں نے خود سے سوال کیا، اور اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو عین اس لمحے لیونتانسکی چونکا، جو بلاشبہ اتفاق کی بات ہو گی۔ سوائے اس کے کہ میں نے اپنے آپ سے اونچی آواز میں بات کی ہو، جو میں کبھی کبھی کرتا ہوں؛ مگر پھر میں نے طے کیا کہ نہیں، میں زور سے نہیں بولا تھا۔ ٹیکسی اس وقت، اسی کلومیٹر، یعنی تقریباً پچاس میل فی گھنٹے کی رفتار کو چھوتی ہوئی، میوزیم کی سمت چلی جا رہی تھی؛ یہ رفتار بُری نہ تھی، خاص طور پر یہ دیکھتے ہوئے کہ سڑک پر ٹریفک خاصی کم تھی۔

"میرے ملک یونین آف سوویت سوشلسٹ ریپبلکس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" ڈرائیور نے اپنا سر نصف دائرے میں گھما کر مجھے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"اگر تم اپنی آنکھیں سڑک کی طرف رکھو تو میں شکر گزار ہوں گا۔"

Scanned with CamScanner

"گھبرانے کی کیا بات ہے۔ میں برسوں سے گاڑی چلا رہا ہوں۔"

"پھر بھی، مجھے غیر ضروری خطرے مول لینا پسند نہیں۔"

تب میں نے اس کے سوال کا جواب دیا کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے زیادہ تر اس سے متاثر ہوا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک عظیم ملک ہے۔

لیوبتانسکی کا گول چہرہ آئینے میں خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ دکھائی دیا، اس کے دانت کیڑوں کے کھائے ہوئے لگ رہے تھے۔ یہ مسکراہٹ منھ کے اندر سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ اب جب کہ اس نے اپنے نصف یہودی حسب نسب کا انکشاف کر دیا تھا، مجھے گمان گزرنے لگا کہ اس کے خدوخال اتنے سلاوی نہیں ہیں جتنے یہودی، اور اس کے وجود میں اس سے زیادہ بے اطمینانی ہے جتنی مجھے پہلے محسوس ہوئی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس کی آنکھوں سے ہوا۔

"اور ہمارا نظام —— کمیونزم؟"

میں نے احتیاط سے جواب دیا، میں اسے برہم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ "میں تم سے دیانت داری کے ساتھ بات کروں گا۔ میں نے کچھ غیر معمولی چیزیں دیکھی ہیں —— حتیٰ کہ متاثر کن بھی —— مگر میری رائے اس سے کہیں زیادہ انفرادی آزادی کے حق میں ہے جتنی یہاں لوگوں کو بظاہر حاصل ہے۔ خدا جانتا ہے کہ امریکا بھی سنگین نقائص سے خالی نہیں ہے، مگر وہاں لوگوں کو کم از کم تنقید کرنے کی آزادی حاصل ہے، اگر تم سمجھ سکو کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ میرا باپ کہا کرتا تھا: تم بل آف رائٹس کو مات نہیں دے سکتے۔ وہ ایک کھلا معاشرہ ہے، جس کا مطلب ہے انتخاب کی آزادی، کم از کم نظریے کی حد تک۔"

"کمیونزم کہیں زیادہ بہتر سیاسی نظام ہے،" لیوبتانسکی نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا، "اگرچہ موجودہ مرحلے تک اسے مکمل طور پر قائم نہیں کیا جا سکا ہے۔ موجودہ مرحلے میں ———" اس نے تھوک نگلا، کچھ سوچا، پھر اپنی بات کو ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کے بجائے کہنے لگا: "ہمارا انقلاب ایک شان دار اور مقدس واقعہ تھا۔ مجھے سوویت تاریخ کا شروع کا زمانہ پسند ہے، کمیونسٹ آدرش پسندی کا جوش و خروش، بورژوا اور امپیریلسٹ قوتوں پر فتح۔ مصیبت جھیلتے ہوئے عوام کا شعور راتوں رات بلند ہو گیا۔ معاشرے میں سب کے لیے امکانات کی نئی زندگی پیدا ہوئی۔ پاسترناک نے اسے شان دار سرجری کا نام دیا۔ یوجینی زمیاتین، ممکن ہے آپ اس کی کتابوں سے واقف ہوں، اس نے کہا: انقلاب پوری زمین کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے، مگر پھر ایک نئی زندگی پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے بہت سے شاعروں نے اس سے ملتی جلتی باتیں کہیں۔"

میں نے اس سے بحث نہ کی، جس کا انقلاب اسی کو ساجھے۔

"آپ نے پہلے بتایا تھا،" لیوبتانسکی بولا، ایک بار پھر آئینے میں مجھے دیکھتے ہوئے، "کہ آپ اپنے اس دورے کے بارے میں مضمون وغیرہ لکھنا چاہتے ہیں۔ سیاسی مضمون یا غیر سیاسی؟"

"میں سیاست کے بارے میں نہیں لکھتا، ویسے مجھے اس سے دل چسپی ضرور ہے۔ میرے ذہن میں تو کسی امریکی سیاحتی رسالے کے لیے موسکو کے ادبی میوزموں کے بارے میں کوئی مضمون تھا۔ میں اسی

Scanned with CamScanner

طرح کی چیزیں لکھتا ہوں۔ میں فری لانس رائٹر ہوں۔" میں کچھ کچھ معذرت خواہانہ انداز میں ہنسا۔ عجیب بات ہے کہ آپ جن باتوں پر زور دیتے ہیں وہ دوسرے ملک میں جا کر کس طرح بدل جاتی ہیں۔

لیوبتا نسکی نے شائستگی کے ساتھ ہنسی میں میرا ساتھ دیا اور پھر ادھ بیچ میں رک گیا۔ "میں ٹھیک طرح جاننا چاہتا ہوں، فری لانس رائٹر کیا ہوتا ہے؟"

"مطلب یہ کہ رسالے کا ایڈیٹر کسی مضمون کا موضوع تجویز کرتا ہے، اور میری مرضی ہے کہ اسے قبول کروں یا نہ کروں۔ یا پھر میں اپنی دل چسپی کے کسی موضوع پر مضمون لکھتا ہوں اور اسے کسی رسالے کے ہاتھ بیچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کبھی کبھی مضمون فروخت نہیں ہو پاتا اور مالی اعتبار سے گھاٹے کا سودا ہوتا ہے۔ اس میں اچھی بات یہ ہے کہ میں خود اپنا مالک ہوں۔ میں تھوڑا بہت ترتیب و تدوین کا کام بھی کرتا ہوں۔ میں نے شاعری اور مضامین کے انتخاب مرتب کیے ہیں، ہائی اسکول کے طلبا کے لیے۔"

"ہمارے ہاں بھی فری لانس ہوتا ہے۔ میں بھی لکھتا ہوں،" لیوبتا نسکی بڑی سنجیدگی سے بولا۔

"واقعی؟ ترجمے کرتے ہو گے؟"

"ترجمہ تو میرا پیشہ ہے، مگر میں طبعزاد ادیب بھی ہوں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمھارے تین کام ہیں: لکھنا، ترجمہ کرنا اور ٹیکسی چلانا۔"

"ٹیکسی چلانا میرا اصل کام نہیں ہے۔"

"کیا آج کل تم کسی خاص چیز کا ترجمہ کر رہے ہو؟"

ڈرائیور نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا۔ "آج کل میرے ہاتھ میں ترجمے کا کوئی کام نہیں۔"

"تم خود کیا لکھتے ہو؟"

کہانیاں لکھتا ہوں۔"

"اچھا؟ کس قسم کی کہانیاں، اگر مجھے پوچھنے کی اجازت ہو تو؟"

"بتاتا ہوں کس قسم کی --- چھوٹی چھوٹی --- مختصر کہانیاں، زندگی سے بنائی ہوئی۔"

"چھپوائی بھی ہیں؟"

وہ مجھ سے آنکھیں چار کرنے کے لیے پیچھے گھومنے ہی لگا تھا کہ اچانک اس نے اپنی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں نے اپنا امریکی سگریٹ پیش کیا۔ اس نے میرے پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا اور آہستہ آہستہ کش لینے لگا۔

"کچھ چیزیں چھپوائی ہیں، مگر بہت پہلے۔ سچی بات یہ ہے،" اس نے گہرا سانس لیا، "کہ آج کل میں دراز میں رکھ دینے کے لیے لکھتا ہوں۔ آپ اس فقرے سے واقف ہیں؟ یعنی آئزک بیبل کی طرح، میں خاموشی کی صنفِ سخن کا استاد ہوں۔"

"میں نے سن رکھا ہے،" میں نے کہا، میری سمجھ میں نہ آیا کہ اور کیا کہوں۔

"جو اسے ہی پڑھیں گے اور تنقید کریں گے،" لیوبتا نسکی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "جس جسے کو کہا

نہیں جاتے، اس پر بگ دیتے ہیں۔ نہایت اعلیٰ درجے کی تنقید ہے یہ۔"
"مجھے افسوس ہے۔"
"لیجیے، ہم چیخوف میوزیم پہنچ گئے۔"
میں اسے کرایہ ادا کرنے کے لیے آگے کو جھکا اور بے دھیانی میں ایک روبل ٹپ دینے کی غلطی کر بیٹھا۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "میں سوویت شہری ہوں۔" اس نے زبردستی روبل مجھے واپس کیا۔
"اسے میری بے خیالی سمجھنا،" میں نے معذرت کی۔ "میرا مقصد تمھاری توہین کرنا نہیں تھا۔"
"ہیروشیما! ناگاساکی!" اس نے طنز کیا اور وولگا کے سائلنسر سے زور کا دھواں نکلا۔ "ویت نام کے غریب مصیبت زدہ عوام پر حملہ کرنے والے!"
"میں نے ان میں سے کوئی کام نہیں کیا،" میں پیچھے سے پکار کر بولا۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد، جب میں مہمانوں کی کتاب پر دستخط کر کے میوزیم سے رخصت ہونے کو تھا، مجھے ایک شخص سڑک کے دوسری طرف لنڈن کے پیڑ کے نیچے کھڑا سگریٹ پیتا نظر آیا۔ پاس ہی ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو تکنے لگے -- پہلے میں ٹھیک سے نہ سمجھ پایا کہ وہ کون ہے، مگر پھر لیوبتانسکی نے دوستانہ انداز میں سر ہلا کر مجھے اشارہ کیا، اور پکارا: "خوش آمدید! خوش آمدید!" اس نے منھ کھول کر مسکراتے ہوئے اپنا بازو لہرایا۔ اس نے اپنے گھنے بالوں میں کنگھی کر لی تھی اور بغیر ٹائی کی سفید قمیص پر گہرے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے سوٹ کا کوٹ پہن رکھا تھا، اور گزوں کے گھیر والی پتلون۔ اس کے موزے، جن پر سرخ، سفید اور نیلی دھاریاں تھیں، اس کے سینڈلوں میں سے نظر آ رہی تھیں۔
مجھے معاف کر دیا گیا، میں نے سوچا۔ "خوش آمدید!" میں نے بھی، سڑک پار کرتے ہوئے، کہا۔
"چیخوف میوزیم کیسا لگا؟"
"مجھے بہت لطف آیا۔ میں نے بہت سے نوٹس لیے۔ تمھیں پتا ہے وہاں کیا چیزیں رکھی ہیں؟ اس کا ایک سیاہ فیدورا ہیٹ، اور اس کی بغیر کمانیوں کی عینک جو ہم تصویروں میں دیکھتے ہیں۔ بے حد متاثر کن!"
لیوبتانسکی نے اپنی ایک آنکھ پونچھی، جس پر مجھے تعجب ہوا۔ وہ پہلے والا آدمی قطعی نہیں لگ رہا تھا، کم از کم اس میں خاصی تبدیلی آ گئی تھی۔ کیسی عجیب بات ہے، کوئی اجنبی آپ کو اپنے کچھ ذاتی کوائف بتلاتا ہے، اور جوں جوں آپ سنتے جاتے ہیں اس کی ظاہری ہیئت میں فرق آتا جاتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور اب ادیب بھی تھا، جزوقتی ہی سہی۔ بہر کیف، میرا غالب تاثر یہی تھا۔
"میرے سابق غصے کو معاف کیجیے،" لیوبتانسکی نے وضاحت کے طور پر کہا۔ "یہ میرا بہترین وقت ہے۔ وہ بہترین وقت تھا، وہ بدترین وقت تھا،" اس نے اداسی سے مسکراتے ہوئے مشہور مصرعے پڑھے۔

"ٹھیک ہے، اگر تم بھی میری نادانستہ غلطی کو معاف کر دو۔ کیا اس وقت تم مجھے میٹروپول پہنچا سکتے ہو، یا کسی اور اتفاق سے یہاں آ نکلے ہو؟"

میں نے یہ جاننے کے لیے ادھر اُدھر دیکھا کہ آیا کوئی اور شخص میوزیم سے باہر نکل رہا ہے۔

"اگر آپ میری خدمات حاصل کرنا چاہیں تو میں آپ کو لے چلوں گا۔ مگر پہلے میں آپ کو ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں -- کیا کہنا چاہیے؟ -- آپ کی دل چسپی کی۔"

اس نے ٹیکسی کی سامنے والی کھلی کھڑکی میں ہاتھ ڈالا اور بھورے کاغذ میں لپٹا اور سرخ دھاگے سے بندھا ایک پھیلا ہوا پیکٹ برآمد کیا۔

"یہ میری کہانیاں ہیں۔"

"میں روسی نہیں پڑھ سکتا،" میں بولا۔

"میری بیوی نے ان میں سے چار کا ترجمہ کر دیا ہے۔ وہ پیشے کے لحاظ سے مترجم نہیں ہے، اگرچہ اس کی انگریزی خاصی بہتر اور حساس ہے۔ وہ سوویت پرچیزنگ کمیشن کی طرف سے دو سال برطانیہ میں رہی ہے۔ ہماری ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ میں اپنی کہانیوں کا ترجمہ خود نہیں کرتا، کیوں کہ میں روسی سے انگریزی میں اتنا اچھا ترجمہ نہیں کرتا جتنا خوب صورت انگریزی سے روسی میں کرتا ہوں۔ اور میں اپنے ساتھ زبردستی بھی نہیں کرنا چاہتا، یعنی اپنی نقل کرنا۔ ممکن ہے یہ کہانیاں انگریزی میں کچھ عجیب سی محسوس ہوں -- میری بیوی کو بھی اس کا اعتراف ہے -- لیکن آپ انھیں پڑھ کر اپنی رائے قائم کر سکتے ہیں۔"

اگرچہ اس کے پیکٹ کو پیش کرنے کے انداز میں قدرے ہچکچاہٹ تھی، لیکن وہ اسے یوں پیش کر رہا تھا جیسے یہ بہار کے پھولوں کا دستہ ہو۔ کیا یہ کوئی چال ہے؟ میں نے خود سے پوچھا۔ کیا یہ لوگ میرا امتحان لے رہے ہیں کیوں کہ میں نے کیف ایرپورٹ پر اس بدبخت فارم پر دستخط کیے تھے، ایک آدھ بھی نہیں پوری پانچ کاپیوں پر؟

معلوم ہوتا تھا لیویتانسکی کو میرے خیالوں کا اندازہ ہو گیا۔ "یہ خالص کہانیاں ہیں۔"

اس نے دانت سے کاٹ کر دھاگے کے دو ٹکڑے کر دیے، اور پیکٹ کو وولگا کے بونیٹ پر رکھ کر اس کا غلاف اتارا۔ چار کہانیاں نکلیں، جنھیں الگ الگ کلپ کیا گیا تھا اور جو لمبے لمبے باریک نیلے کاغذوں پر صفائی سے ٹائپ شدہ تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک کہانی، جو لیویتانسکی نے مجھے تھمائی، لے لی اور اوپر کے صفحے پر نگاہ ڈالی -- یہ واقعی کوئی کہانی معلوم ہوتی تھی -- اور پھر ورق الٹ کر دوسرے صفحے دیکھے اور مسودہ واپس کر دیا۔ "میں کہانیوں کا کوئی خاص نقاد نہیں ہوں۔"

"مجھے نقاد نہیں چاہیے۔ مجھے پڑھنے والا چاہیے جس میں ادبی تجربہ اور ذوق ہو۔ اگر آپ نے نظموں اور مضامین کے مجموعے مرتب کیے ہیں تو آپ میری کہانیوں کے ادبی معیار کو پرکھ سکیں گے۔ پلیز، میں درخواست کرتا ہوں کہ میری کہانیاں پڑھ لیں۔"

Scanned with CamScanner

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے خود کو کہتے پایا: "ٹھیک ہے، پڑھ لوں گا۔" مجھ سے اپنی آواز پہچانی نہ گئی اور میری سمجھ میں نہ آیا کہ ایسی بات میں نے کیوں کر کہہ دی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بات میں اپنے آپ سے الگ ہٹ کر اور ایسے تذبذب کے ساتھ کہی تھی جو اُس کو یا تو محسوس نہ ہوئی یا جسے نظرانداز کر دینا ہی اس نے مناسب سمجھا۔

"اگر آپ میری کہانیوں کو قابلِ احترام--- قابلِ قبول سمجھیں، تو ممکن ہے کہ پیرس میں یا لندن میں ان کی اشاعت کا بندوبست کر سکیں؟" اس کی گردن میں پڑنے والا گہرا گڑھا تھرتھرایا۔

میں نے اس شخص کی طرف غور سے دیکھا۔ "میں پیرس نہیں جا رہا ہوں، اور لندن میں بھی یو ایس اے جاتے ہوئے جہاز بدلنے کے لیے ٹھہروں گا۔"

"تو پھر آپ اسے اپنے ناشر کو دکھا سکتے ہیں، ممکن ہے وہ میری تحریریں امریکا میں چھاپ دے؟" لیوبتا نسکی کی بے چینی اب بالکل عیاں تھی۔

"امریکا میں؟" میں نے، اپنی آواز کو تعجب میں بلند کرتے ہوئے، کہا۔

پہلی بار اس نے جواب دینے سے پہلے محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"اگر آپ مہربانی کر کے اسے اپنی کتابوں کے ناشر کو دکھا سکیں --وہ قابلِ اعتبار ہے نا؟-- تو ہو سکتا ہے وہ میری کہانیوں کا مجموعہ شائع کرنے پر تیار ہو جائے؟ جن شرائط پر وہ چاہے میں اس سے معاہدہ کر لوں گا۔ پیسا، بالفرض مجھے مل بھی سکے، اصل چیز نہیں ہے۔"

"کس مجموعے کی بات کر رہے ہو؟"

اس نے بتایا کہ اس نے جو تیس کہانیاں اب تک لکھی ہیں ان میں سے اٹھارہ منتخب کی ہیں، جن میں چار بطور نمونہ یہ ہیں۔ "بدقسمتی سے ابھی انھیں کا ترجمہ ہوا ہے۔ میری بیوی بایوکیمسٹ اسسٹنٹ ہے اور لیبارٹری میں خاصی دیر تک کام کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے یہ کہانیاں آپ کے ناشر کو پسند آئیں گی۔ یہ آپ کی رائے پر منحصر ہے۔"

یا تو اس شخص کا تخیل انتہائی افسانہ طراز ہے یا پھر اس کا دماغ چل گیا ہے۔ "میں کسی روسی مسوّدے کو روس سے باہر اسمگل کرنے کے معاملے میں پھنسنے کو تیار نہیں ہوں۔"

"میں نے آپ کو بتایا کہ میرا مسوّدہ بنائی ہوئی کہانیوں کا ہے۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو، لیکن یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے۔ مجھے ایسے خطرے مول لینے پڑیں گے جنھیں مول لینے کی مجھے بالکل خواہش نہیں۔ صاف بات ہے۔"

"کم از کم آپ انھیں پڑھ تو لیں،" اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔

میں نے کہانیاں دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لیں اور آہستہ آہستہ ایک ایک کہانی کے ورق پلٹے۔ میں کیا جاننا چاہ رہا تھا، نہیں کہہ سکتا: شاید کوئی جال؟ مجھے ان کو لینا چاہیے یا نہیں؟ میں نے سوچا۔ کیوں لوں؟ اس نے بھورا کاغذی غلاف مجھے تھمایا اور میں نے کہانیوں کو اس میں لپیٹ لیا۔ میں جتنی جلد

Scanned with CamScanner

انھیں پڑھ سکا پڑھ ڈالوں گا۔ میں ٹیکسی میں داخل ہو گیا۔

"جیسا کہ میں نے بتایا ہے، میں میٹروپول میں ٹھہرا ہوں۔ آج رات نو بجے کے قریب آجانا، میں تمھیں اپنی رائے بتا دوں گا، جو بھی اس کی اہمیت ہو۔ مگر اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکوں گا، مسٹر لیویتانسکی، اس سے آگے کوئی توقع یا جواب دہی نہیں ہو گی۔ اور یہ کسی قسم کا معاہدہ بھی نہیں ہے۔ میرے کمرے کا نمبر ۵۳۸ ہے۔"

"آج رات؟ اتنی جلدی؟" وہ بولا، اور اپنی دونوں ہتھیلیاں کھجائیں۔ "انھیں توجہ سے پڑھیے تاکہ ان کے آرٹ سے آگاہ ہو سکیں۔"

"ٹھیک ہے، کل رات سہی۔ وہی وقت۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ میرے کمرے میں اس سے زیادہ دیر ٹھہریں۔"

لیویتانسکی راضی ہو گیا۔ اپنے شکستہ دانتوں کے درمیان سے سیٹی بجاتے ہوئے وہ احتیاط سے گاڑی چلا کر مجھے میٹروپول لے گیا۔

اس رات، گلاس میں سے ووڈکا کی چسکیاں لیتے ہوئے، میں نے لیویتانسکی کی کہانیاں پڑھیں۔ وہ سادہ اور پُرزور انداز میں لکھی ہوئی تھیں ۔۔ مجھے کم و بیش یہی توقع تھی ۔۔ اور ترجمہ بھی بُرا نہ تھا: بلکہ جیسا مجھے بتایا گیا تھا، ترجمہ پڑھنے میں اس سے بہتر ہی تھا، گو کچھ نقائص یقیناً تھے: ساخت کے عیوب، بے جوڑ الفاظ، جن میں بعض کے آگے سوالیہ نشان بنا ہوا تھا، اور جو میرے خیال میں تھیسارس سے لیے گئے تھے۔ اور کہانیاں، چھوٹے چھوٹے قصے جن کا تعلق ۔۔ مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی ۔۔ زیادہ تر موسکو کے یہودیوں سے تھا، اچھی تھیں، فنکارانہ اسلوب میں لکھی گئی تھیں، اور واقعی متاثر کرتی تھیں۔ ان سے جس صورت حال کا پتا چلتا تھا اس سے میں یکسر بے خبر نہ تھا: میں اخبار ٹائمز بڑے غور سے پڑھتا ہوں۔ لیکن یہ کہانیاں صورت حال کا شکوہ کرنے کی غرض سے نہیں لکھی گئی تھیں۔ ان کا جو کچھ پیغام تھا وہ ان کی ہیئت کے ذریعے سے پہنچتا تھا، رقص اور رقاص میں امتیاز کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے آلو کے مشروب سے ایک اور گلاس بھرا ۔۔ اب میں کچھ کچھ مخمور ہو چلا تھا اور کبھی کبھی سوچ میں پڑ جاتا تھا کہ اتنا کچھ اپنے آپ سے الگ تھلگ کیوں کیے دے رہا ہوں، غالباً میں سکون کی کیفیت میں تھا۔ تب میں نے، لیویتانسکی کے لیے تحسین محسوس کرتے ہوئے، ان کہانیوں کو دوبارہ پڑھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ پہلے میں خاصا پُرجوش ہوا، پھر دل گرفتہ ہو گیا، جیسے مجھے کسی ایسے راز میں شریک کر لیا گیا ہو جسے میں جاننا نہ چاہتا ہوں۔

کہانیاں لکھنے والے کے لیے یہاں کی زندگی بہت دشوار ہے، میں نے سوچا۔

اس کے بعد ان کہانیوں کا آس پاس ہونا مجھے پریشان کرنے لگا۔ ان میں سے ایک کہانی میں ایک روسی ادیب اپنی کہانیاں باورچی خانے کے سنک میں رکھ کر جلا دیتا ہے۔ ان کہانیوں کو، ظاہر ہے، کسی نے نہیں جلایا تھا۔ میں نے خود سے سوچا، اگر یہ کہانیاں میرے قبضے میں پکڑی جائیں، خاص طور پر یہ

جانتے ہوئے کہ ان میں یہاں کے حالات کے بارے میں کس قسم کے اشارے موجود ہیں، تو اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ میں کتنی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ کاش میں نے اصرار کیا ہوتا کہ لیوبتانسکی آج ہی رات آ کر انھیں لے جائے۔

دروازے پر ایک صاف دستک سنائی دی۔ میرا خیال ہے میں اپنی کرسی پر کئی انچ اُچھلا ہوں گا۔ کچھ دیر بعد، لیوبتانسکی میرے سامنے موجود تھا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،" میں نے کہانیاں زبردستی اسے واپس تھماتے ہوئے کہا، "بالکل کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اگلی رات میں اور ادیب اُس کی چھوٹی سی، کتابوں سے کھچاکھچ بھری مطالعہ گاہ میں کونیاک کے گلاس تھامے ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا انداز پُروقار تھا، گو پہلے پہل وہ کچھ متکبر اور زخم خوردہ سا لگا، اپنی بے صبری کو چھپانے کی بمشکل کوشش کرتا ہوا۔ میں خود بھی کچھ زیادہ اطمینان کی حالت میں نہیں تھا۔

میں وہاں مروّت میں چلا آیا تھا، اور غالباً کچھ اور وجوہ سے بھی: سب سے بڑھ کر ایک عجیب سی بے اطمینانی کے زیرِ اثر جسے میں ٹھیک سے بیان نہیں کر سکتا تھا، سوائے اس کے کہ وہ ایسے آدمی کی طبیعت کے مطابق لگتی تھی جو کہ میں ہوں، یا ہونا چاہتا ہوں، یعنی میرا وہ وجود جو مجھے ایسے معاملات میں پھنسا دیتا ہے جن میں میں پھنسنا نہیں چاہتا -- اور یہ ہمیشہ خطرناک معاملات ہوتے ہیں۔

لیوبتانسکی، اپنی کھڑکھڑاتی ہوئی وولگا پیکاس چلاتا ہوا ٹیکسی ڈرائیور، اور اپنا اَدھ کچرا مسودہ ٹھکانے لگانے کی چالاک کوشش کرتا ہوا نوآموز، میرے ذہن سے محو ہو چکا تھا، اور اب میں اسے ایک سنجیدہ سوویت ادیب کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا جسے اپنی تحریریں شائع کرانے میں مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ ایسے اَور بھی ادیب ہوں گے۔ میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ میں نے سوچا۔ اور کیوں کروں؟

"کل رات میں اپنے اصل احساسات کا ٹھیک سے اظہار نہیں کر پایا،" میں نے معذرت کی۔ "معاف کرنا، تم نے اچانک آ کر مجھے چونکا دیا تھا۔"

لیوبتانسکی دونوں ہاتھوں کی کھردری انگلیوں سے دونوں ہاتھ کھجا رہا تھا۔ "آپ نے میرا پتا کیسے حاصل کیا؟"

میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر تہہ کیا ہوا بھورا کاغذ نکالا جو اس کے مسودے کا غلاف تھا۔ "اس پر لکھا ہوا ہے -- نووو اوستاپوفسکایا اسٹریٹ، نمبر ۲۸۸، فلیٹ ۵۹۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ کر چلا آیا۔"

"اچھا، اسے تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

ممکن ہے، میں نے سوچا۔

اس کے باوجود مجھے اندر داخل ہونے کے لیے گویا اپنا پیر بند ہوتے ہوئے دروازے میں پھنسانا پڑا

تھا۔ میری متذبذب دستک کے جواب میں لیویتانسکی کی بیوی نے دروازہ کھولا تھا، اس کی آنکھوں میں تشویش تھی، مجھے احساس ہوا کہ وہ اسی تاثر کے ساتھ عموماً زندگی گزارتی ہے۔ اس کی آنکھیں، جو ایک اجنبی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی تھیں، جب میں نے انگریزی میں اس کے شوہر کے بارے میں استفسار کیا تو صاف صاف خشم ناک ہو گئیں۔ مجھے محسوس ہوا، جیسے کیف میں محسوس ہوا تھا، کہ میری مادری زبان میری دشمن ہو گئی ہے۔

"آپ کہیں غلط اپارٹمنٹ میں تو نہیں آ گئے؟"

"شاید نہیں۔ اگر گوسپودین لیویتانسکی یہیں رہتا ہے تو ہرگز نہیں۔ میں اس سے اس کے، کیا کہتے ہیں، مسودے کے سلسلے میں ملنے آیا ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں سائے اور چہرے پر زردی چھا گئی۔ دس سیکنڈ بعد میں فلیٹ کے اندر تھا، اور دروازہ میرے پیچھے مقفل کیا جا چکا تھا۔

"لیویتانسکی!" اس نے پکار کر اسے بلایا۔ اس پکار میں تذبذب کی سی خصوصیت تھی -- آؤ، مگر نہ آؤ۔

جب وہ نمودار ہوا تو غالباً وہی قمیص پتلون اور سہ رنگے موزے پہنے ہوئے تھا۔ اس کے تنے اور تھکے ہوئے چہرے پر پہلے بناوٹی سی بوریت کا تاثر آیا۔ مگر وہ اپنے جوش کو چھپا نہیں پا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں گھومتیں، پھر ٹھہر جاتیں، پھر گھومتیں۔

"اوہ، نہیں!" لیویتانسکی نے کہا، جو کچھ بھی اس کا مطلب ہو۔

میرے خدایا، میں نے سوچا، کیا یہ میرا انتظار کر رہا تھا؟

"میں تم سے چند منٹ بات کرنے آیا ہوں، اگر تم برا نہ مانو تو،" میں بولا۔ "میں ان کہانیوں کے بارے میں اپنی اصلی رائے بتانا چاہتا ہوں جو تم نے مہربانی کر کے مجھے پڑھنے کو دی تھیں۔"

اس نے کچھ اکھڑی سی روسی زبان میں اپنی بیوی سے کچھ کہا اور اس نے بھی فوراً ویسے ہی لہجے میں جواب دیا۔ "میں اپنی بیوی کا تعارف کرا دوں: آئرینا فلپوفنا لیویتانسکی، بایو کیمسٹ۔ خاصی صابر عورت ہے، گو کہ کوئی سینٹ وغیرہ نہیں ہے۔"

وہ چہرے پر ہچکچاتی ہوئی سی مسکراہٹ لائی۔ تقریباً اٹھائیس برس کی خاصی دلکش عورت تھی، قدرے بھاری بدن کی، اور سادہ لباس اور گھر کے چپل پہنے تھی۔ اس کی شمیز کا کنارہ اسکرٹ کے نیچے سے جھانک رہا تھا۔

اس کے لہجے میں برطانوی پن کی ہلکی سی رمق تھی۔ "مجھے آپ سے متعارف ہو کر خوشی ہوئی۔" اگر واقعی ایسا تھا تو بظاہر پتا نہیں چلتا تھا۔ اس نے سیاہ پمپ جوتے پہن لیے، کلائی پر بازوبند چڑھا لیا اور ایک سگریٹ اپنے دہن کے کونے میں اٹکا لیا۔ اس کی ٹانگیں اور بازو سڈول، اور بھورے بال چھوٹے کٹے ہوئے تھے۔ زردی مائل چہرے پر بھنچے ہوئے پتلے ہونٹوں کا تاثر میرے ذہن پر رہ گیا۔

Scanned with CamScanner

"میں برابر میں، کوالیفسکی کے ہاں، جا رہی ہوں،" وہ بولی۔
"کہیں میری وجہ سے تو نہیں؟ میں تو صرف اتنا کہنے۔۔۔"
"ہمسائے ہیں، برابر کے فلیٹ میں رہتے ہیں،" لیوبتانسکی مسکرایا۔ "اور پھر، دیواریں بہت پتلی ہیں۔" اس نے کھوکھلی دیوار پر انگلیوں کے جوڑ سے دستک کا اشارہ کیا۔
میں نے اپنے خوف کا اظہار کیا۔
"پلیز، زیادہ دیر مت لگائیے گا،" آرینا بولی، "کیوں کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔"
مجھ سے تو نہیں؟ ایجنٹ باورڈ ہوروو ٹز، سی آئی اے ۔۔ عجب مزاحیہ خیال تھا۔
چھوٹا سا مربع شکل کا لِونگ روم غیر دلکش نہیں تھا، مگر لیوبتانسکی نے اندر مطالعہ گاہ کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے وسکی پینے کے پیالوں میں میٹھی کونیاک پیش کی، پھر میرے سامنے آ کر اپنی کرسی کے کنارے پر بیٹھ گیا، اس کے انداز سے دبایا ہوا جوش ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے گمان گزرا کہ اس کی کرسی ابھی ہلے گی، پرواز کرنے لگے گی۔
اگر ایسا ہوا تو اسے اکیلے جانا ہوگا۔
"میں یہ کہنے آیا ہوں،" میں نے اسے بتایا، "کہ مجھے تمہاری کہانیاں پسند آئیں اور مجھے افسوس ہے کہ کل رات تم سے یہ بات نہ کہہ پایا۔ مجھے تمہاری تحریر کی سادہ، بنیادی حقیقت بیانی اچھی لگی۔ کہانیوں کی بُنت سادہ ہے مگر میں ان سے متاثر ہوا۔ لوگوں سے ہم دردی رکھتے ہوئے بھی تم نے ان کے بیان میں معروضیت برقرار رکھی ہے، اس کی میں قدر کرتا ہوں۔ ان کہانیوں کی خاصیت کچھ کچھ چیخوفین ہے، مگر یہ زیادہ گنجان، کٹھیلی اور بے باک ہیں، اگر تم میری بات سمجھ سکو۔ مثلاً وہ کہانی جس میں ایک بوڑھا باپ اپنے بیٹے سے ملنے آتا ہے اور وہ اُسے جُل دے کر نکل جاتا ہے۔ میں تمہارے اسلوب پر رائے زنی نہیں کر سکتا کیوں کہ میں نے ان کہانیوں کے ترجمے ہی پڑھے ہیں۔"
"چیخوفین،" لیوبتانسکی نے اپنے گھِسے ہوئے دانتوں سے مسکراتے ہوئے اقرار کیا، "بڑی عمدہ تحسین ہے۔ ہمارے اوّلین سوویت شاعر مایاکوفسکی نے چیخوف کو لفظوں کا زور آور اور مسرور آرٹسٹ قرار دیا تھا۔ کاش لیوبتانسکی کے لیے زندگی اور آرٹ میں اتنا مسرور ہونا ممکن ہوتا۔" وہ کمرے کے کھنچے ہوئے پردے کو گھورتا محسوس ہو رہا تھا، مگر غالباً کسی خاص نقطے کو نہیں۔ پھر، شاید خود کو تسلّی دیتے ہوئے، بولا: "روسی زبان میں میرا اسلوب خاصا عمدہ ہے ۔۔ قطعیت، اختصار، حسِ مزاح وغیرہ۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ مشکل ہے کیوں کہ وہ اتنی پُرمایہ زبان نہیں۔"
"یہ بات میں نے پہلے بھی سنی ہے۔ ویسے مجھے دیانت داری سے کہہ دینا چاہیے کہ کہیں کہیں مجھے ان کہانیوں پر اعتراضات بھی ہیں، مگر یہ تو کسی بھی تحریر پر کسی پڑھنے والے کو ہو سکتے ہیں۔"
خود مجھ کو ہیں۔"
اس کے اس اعتراف کے بعد میں نے اپنی تنقید روک لی۔ میں اس کے بک کیس کے اوپر لگی

Scanned with CamScanner

ایک تصویر کے بارے میں سوچ رہا تھا، میں نے پوچھا کہ یہ کس کی تصویر ہے۔ "یہ چہرہ مجھے دیکھا ہوا سا لگتا ہے۔ آنکھیں بڑی، کیا کہتے ہیں، شاعرانہ ہیں۔"

"اور آواز بھی۔ یہ بورس پاسترناک کی جوانی کی تصویر ہے۔ اُدھر کی دیوار پر مایاکوفسکی ہے۔ وہ بھی شان دار شاعر تھا، بے پناہ، پرمسرت، نازک اعصاب والا، انقلاب کا عاشق۔ کہتا تھا: یہ میرا انقلاب ہے۔ اس کے لیے انقلاب ایک مقدس دھوبن تھی جس نے ساری دنیا سے گند کی کو دھو ڈالا تھا۔ بعد میں بدقسمتی سے وہ مایوسی کا شکار ہو کر خود کو گولی مار بیٹھا۔"

"ہاں، میں نے پڑھا تھا۔"

"اس نے لکھا تھا: میری خواہش ہے کہ میرا ملک مجھے سمجھے. اگر ایسا نہ ہوا تو میں بادوباراں کے طوفان کی طرح پورے روس سے گزر جاؤں گا۔"

"کیا تم نے ڈاکٹر ژواگو پڑھا ہے؟"

"پڑھا ہے،" ادیب نے گہرا سانس لیا، اور پھر روسی میں کچھ پڑھنے لگا -- میرے خیال میں کسی نظم کی سطریں۔

"یہ سورت شاعرہ مارینا سوِیتائیوا کے نام ہے جو پاسترناک کی قریبی دوست تھی۔" لیوِنتانسکی میز پر رکھے سگریٹ کے پیکٹ سے کھیلنے لگا۔ "اس کی زندگی کا انجام دردناک تھا۔"

"کیا اوسِپ ماندلستام کی بھی کوئی تصویر ہے،" یہ نام لیتے ہوئے میری زبان لڑکھڑائی۔

وہ یوں چونکا جیسے مجھ سے ابھی ابھی متعارف ہوا ہو۔ "آپ ماندلستام کو جانتے ہیں؟"

"کسی انتخاب میں اس کی چند نظمیں پڑھی تھیں۔"

"ہمارا بہترین شاعر -- مقدس شاعر -- چلا گیا، بہت سے اور لوگوں کی طرح۔ میری بیوی مجھے اس کی تصویر نہیں لگانے دیتی۔"

"میرے آنے کا مقصد،" میں نے ذرا دیر بعد کہا، "ہمدردی اور احترام کا اظہار کرنا تھا۔"

لیوِنتانسکی نے ماچس کی تیلی اپنے ناخن پر رگڑ کر جلائی۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا، اس لیے اس نے سگریٹ سلگائے بغیر اسے بجھا دیا۔

اس کی شرمندگی کا خیال کر کے میں نے ظاہر کیا کہ کہیں اور دیکھ رہا ہوں۔ "چھوٹا سا کمرہ ہے۔ تمہارا بیٹا یہاں سوتا ہوگا؟"

"میری کہانی والے ادیب کو کہانی کے مصنف سے خلط ملط مت کیجیے۔ ہماری شادی کو آٹھ سال ہو گئے ہیں مگر ہمارا کوئی بچہ نہیں ہے۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اُسی کہانی میں ایڈیٹر سے ملاقات کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، کیا وہ حقیقی ہے؟"

"حقیقی تو نہیں، مگر سچ ہے،" ادیب کچھ بے چین ہو کر بولا۔ "میں تخیل کی مدد سے لکھتا ہوں۔"

ڈائری میں لکھی چیزوں یا محض یادوں کو دُہرانے سے مجھے دل چسپی نہیں۔"

"اس سے تو میں بھی متفق ہوں۔

کہانی میں جو بات بیان نہیں ہوئی وہ یہ ہے کہ میں روسی رسالوں کو اپنے خاکے اور کہانیاں بہت بھیجتا رہا ہوں مگر ان میں چند ہی چھپی ہیں، جو ان میں بہترین نہیں تھیں۔ کچھ لوگ، بہت کم لوگ، سامزدات (samizdat) کے ذریعے مجھ سے واقف ہیں، جس میں مسودہ مختلف لوگوں کے ہاتھوں میں گردش کرتا ہے۔"

"کیا تم نے یہودی کہانیاں بھی چھپنے کو بھیجیں؟"

"پلیز، کہانیاں کہانیاں ہوتی ہیں، ان کی کوئی قومیت نہیں ہوتی۔"

"میرا مطلب تھا یہودیوں سے متعلق کہانیاں۔"

"کچھ بھجوائی تھیں، مگر چھپیں نہیں۔"

دلیر آدمی ہے، میں نے سوچا۔ "جو چار کہانیاں تم نے دی تھیں ان کو پڑھنے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ تم یہودیوں کے بارے میں اتنا اچھا کیسے لکھ لیتے ہو۔ خود کو تم رسمی یہودی کہتے ہو -- یہی کہا تھا نا؟ -- اس کے باوجود ان کے بارے میں اتنے اعتماد سے لکھتے ہو۔ غالباً ایسی بات نہیں کہ آدمی لکھ نہیں سکتا، مگر جب کوئی لکھ لے تو تعجب ہوتا ہے۔"

"اعتماد تخیل سے پیدا ہوتا ہے۔ جب میں یہودیوں کے بارے میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو کہانیاں خود بخود آتی چلی جاتی ہیں، اس لیے میں ان کے بارے میں لکھتا ہوں۔ میں ان کرداروں پر لکھتا ہوں جو مجھے کہانیاں دیتے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں خود نصف یہودی ہوں۔ اہم بات ہے مشاہدہ، احساس، اور پھر آرٹ۔ ماضی میں میں اپنے یہودی باپ کا مشاہدہ کر چکا ہوں۔ کبھی کبھی میں سِناگوگ میں بھی یہودیوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ میں وہاں اجنبیوں کی بنچ پر جا بیٹھتا ہوں۔ گبائی مجھے دیکھتا رہتا ہے، میں اسے دیکھتا رہتا ہوں۔ لیکن جو کچھ میں لکھتا ہوں، چاہے وہ یہودیوں کے بارے میں ہو یا گالیسیا یا جورجیا والوں کے بارے میں، دراصل تخیل کی بنائی ہوئی کہانی ہونی چاہیے ورنہ وہ میرے نزدیک مُردہ ہے۔"

"میں خود بھی باقاعدگی سے سِناگوگ نہیں جاتا،" میں نے اسے بتایا، "مگر کبھی کبھی وہاں جانا مجھے پسند ہے، زبان اور ماحول کے ذریعے ایسی جگہ کی یاد تازہ کرنے کے لیے جہاں خدا کبھی موجود تھا۔ عجیب بات ہے، کیوں کہ میں نے کوئی خاص مذہبی تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔"

"میں تو ملحد ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ تخیل سے تمھاری کیا مراد ہے -- تمھاری وہ کہانی مجھے یاد ہے جس میں دعا کی شال کا ذکر ہے۔ مگر کیا میرا یہ خیال درست ہے،" میں نے اپنی آواز مدھم کر لی، "کہ اپنی کہانیوں کے ذریعے تم نے اس ملک میں یہودیوں کی حالت کے بارے میں بھی کچھ کہنا چاہا ہے؟"

"میں پروپیگنڈا نہیں کیا کرتا،" لیوِتانسکی نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں اسرائیل کا ترجمان نہیں

ہوں - میں سوویت فنکار ہوں۔"

"وہ تو تم ہو ہی، مگر تمھاری کہانیوں میں یہودیوں کے لیے گہری ہمدردی پائی جاتی ہے، اور، بہر حال، خیالات آخر زندگی ہی سے جنم لیتے ہیں۔"

"میرا مقصد میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"پڑھنے والے کو ناانصافی کی آگاہی سی محسوس ہوتی ہے۔"

"ناانصافی کچھ بھی ہو، تحریر کو آرٹ ہونا چاہیے۔"

"میں تمھارے فلسفے کا احترام کرتا ہوں۔"

"پلیز، اس قدر احترام کرنے کی ضرورت نہیں،" وہ کچھ جھلا کر بولا۔ "ہمارے ملک میں ایک مقولہ ہے: معذرت سے فر کا کوٹ نہیں بنایا جا سکتا۔ خیالات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ میں آپ کے احترام کی قدر کرتا ہوں، مگر مجھے عملی مدد کی ضرورت ہے۔"

مجھے اس قسم کے الفاظ سننے کی توقع تھی، چناں چہ میں نے کچھ گول مول باتیں شروع کیں۔

"پہلے میری بات سن لیجیے،" لیویتانسکی میز پر ہتھیلی مار کر بولا۔ "میں دشوار حالت۔۔۔ صورتِ حال میں ہوں۔ میں برسوں سے لکھ رہا ہوں مگر بہت کم چیزیں شائع ہوئی ہیں۔ ماضی میں ایک، نہیں دو ایڈیٹروں نے، جو دوست تھے، مجھے بتایا کہ میری کہانیاں عمدہ ہیں مگر سماجی حقیقت نگاری کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتی ہیں۔ جس چیز کو آپ معروضیت کہہ رہے ہیں، اسے وہ لوگ فطرتیت اور جذباتیت کی افراط کہتے تھے۔ اس قسم کی بکواس سننا بڑی مشکل بات ہے۔ وہ تیرنے کو کہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ میں اپنی ٹانگیں نہ ہلاؤں۔ انھوں نے مجھے خبردار کیا؛ انھوں نے میرے لیے جواز بھی تراشے، جو مجھے اچھا نہیں لگا۔ انھوں نے یہاں تک کہا کہ میں دیوانہ ہوں، حالاں کہ میں نے انھیں بتایا تھا کہ میں اپنی کہانیاں اس لیے چھپنے کو دے رہا ہوں کیوں کہ سوویت یونین ایک عظیم ملک ہے۔ عظیم ملک اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ فنکار کیا لکھ رہا ہے۔ عظیم ملک ادیبوں، مصوّروں، موسیقاروں کے فن کو اپنی سانسوں میں شامل کر لیتا ہے، اور اور عظیم، اور صحت مند ہو جاتا ہے۔ میں نے انھیں یہ سب کچھ بتایا مگر انھوں نے کہا کہ میری حقیقت نگاری ناقص ہے۔ اسی وجہ سے مجھے رائٹرز یونین میں نہیں بلایا جاتا۔ اور اس کے بغیر کوئی چیز شائع کرانا ممکن نہیں ہے۔" وہ تلخی سے مسکرایا۔ "انھوں نے خبردار کیا کہ رسالوں کو اپنی چیزیں بھیجنا بند کر دوں، سو میں نے بند کر دیا۔"

"مجھے سخت افسوس ہے،" میں نے کہا۔ "میں خود نہیں سمجھتا کہ ادیبوں کو جلاوطن کرنے سے کوئی فائدہ ہوتا ہے۔"

"میں ایسی حالت میں مزید کام نہیں کر سکتا،" لیویتانسکی اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنی کہانیوں کے ساتھ دراز میں بند ہوں۔ اب مجھے باہر نکلنا ہو گا، ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔ ہر روز میرے لیے لکھنا اور مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے مدد چاہیے۔ کسی اجنبی سے اس قسم کی

Scanned with CamScanner

اہم ذاتی درخواست کرنا آسان نہیں ہے۔ میری بیوی نے مجھے منع کیا تھا۔ وہ ناراض ہے، ڈرتی بھی ہے، مگر اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ میں اہم سوویت ادیب ہوں۔ مجھے پڑھنے والے ملنے چاہییں۔ میری خواہش ہے کہ سوویت لوگ میری کتابیں پڑھیں۔ میں چاہتا ہوں میری کہانیاں میرے اور میری بیوی کے علاوہ دوسرے لوگوں سے بھی داد وصول کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ لوگ پہچانیں کہ میری تحریروں کا رشتہ ماضی کے اور جدید روسی ادیبوں سے ہے۔ میں چیخوف، گورکی، آئزک بیبل کی روایت سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں اگر میری کہانیوں کی کتاب چھپے تو اس سے مجھے اچھی شہرت ملے گی۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں آپ میری مدد کریں —— یہ میری اندرونی آزادی کے لیے ضروری ہے۔''

اس کے اعترافات ایک مضطرب بہاو کی شکل میں سامنے آئے۔ یہ لفظ میں نے سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے، کیوں کہ ایک حد تک یہی وجہ تھی کہ میں اس کی بات سن کر گڑبڑا گیا۔ مجھے ایسے اعترافات کبھی پسند نہیں رہے جو اُن لوگوں کو ذاتی مسائل میں الجھالیں جو الجھنے پر آمادہ نہ ہوں۔ روسی اس فن کے بادشاہ ہیں —— اس کی تصدیق آپ ان کے ناولوں سے کر سکتے ہیں۔

''تمھاری درخواست میرے لیے اعزاز ہے،'' میں نے کہا، ''مگر میں محض ایک سیاح ہوں۔ ہمارے درمیان بہت ہلکا سا تعلق ہے۔''

''میں سیاح کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں، انسان کے طور پر کہہ رہا ہوں، آدمی کے طور پر،'' لیوبتانسکی بڑے جذبے کے ساتھ بولا۔ ''اور آپ فری لانس ادیب بھی ہیں۔ اب آپ جان چکے ہیں کہ میں کیا ہوں اور کیسے دل کا ہوں۔ آپ میرے گھر میں بیٹھے ہیں۔ میں اَور کس سے کہہ سکتا ہوں؟ میں اپنی کہانیاں یوروپ میں شائع کرانا بہتر سمجھوں گا، مثلاً اٹلی کے مونداوری یا ایناودی والوں سے، لیکن اگر یہ آپ کے لیے ناممکن ہے تو امریکا میں سہی۔ ایک نہ ایک دن میری تحریریں میرے اپنے ملک میں بھی پڑھی جائیں گی، شاید میرے مرنے کے بعد۔ کیسی ہولناک ستم ظریفی ہے، مگر میری نسل کے لوگ ایسی ہی ستم ظریفیوں پر زندہ ہیں۔ چوں کہ میری فوری طور پر مرنے کی خواہش نہیں ہے، اس لیے مجھے یہی جان کر سکون ملے گا کہ میرا آرٹ کسی ایک زبان میں تو زندہ ہے۔ ماندلستام نے لکھا تھا: میں کسی اجنبی زبان میں ملفوف ہو جاؤں گا۔ کچھ نہ ہونے سے تو یہی بہتر ہے۔''

''تم نے کہا میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو، مگر کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔ ''میں ایک سیدھا سادہ آدمی ہوں، میرا تخیل بھی کچھ ایسا زوردار نہیں، مگر میں اچھے خاصے اخباری مضمون لکھ لیتا ہوں۔ میری پوری زندگی، کسی نہ کسی وجہ سے، ایڈونچر سے خالی گزری ہے، سوائے اس کے کہ بیوی سے طلاق ہوئی اور اس کے بعد میں ایک اَور عورت سے شادی کرکے ہنسی خوشی رہتا رہا جس کے مرنے کا سوگ آج کل منا رہا ہوں۔ اس وقت میں یہاں تقریباً تعطیلات پر آیا ہوں، نامعلوم قسم کے خطرے مول لے کر اپنے آپ کو تباہ کرنے کی غرض سے نہیں۔ اور دوسری بات یہ، جسے بتانے کے لیے میں تمھارے پاس آیا تھا، کہ ممکن ہے مجھ پر پہلے ہی سے نظر رکھی جا رہی ہو اور تمھیں فائدے کے

بجائے نقصان پہنچا بیٹھوں۔"

میں نے لیونتانسکی کو کیف ایرپورٹ والے واقعے کے بارے میں بتایا۔ "میں نے ایک ایسی دستاویز پر دستخط کر دیے جسے پڑھ بھی نہیں سکتا تھا، جو نہایت احمقانہ حرکت تھی۔"

"یہ کیف میں ہوا؟"

"ہاں۔"

وہ مایوسی سے ہنسا۔ "اگر آپ موسکو سے آتے تو ایسا نہ ہوتا۔ یوکرین والے، کیا کہتے ہیں، دہقان ہیں، دیہاتی لوگ۔"

"ممکن ہے ہوں، مگر میں نے دستخط تو کر ہی دیے۔"

"اس کی نقل آپ کے پاس ہے؟"

"یہاں نہیں ہے۔ ہوٹل میں میز کی دراز میں رکھی ہے۔"

"وہ یقیناً آپ کی کتابوں کی رسید ہوگی جو آپ کو سوویت یونین سے جاتے وقت واپس مل جائیں گی۔"

"اسی کا تو مجھے ڈر ہے۔"

"ڈر کیوں؟" اس نے پوچھا۔ "کیا آپ کو اپنی کھوئی ہوئی چھتری کے دوبارہ مل جانے سے ڈر لگتا ہے؟"

"مجھے ڈر ہے کہ اس بات سے کوئی اور بات نکل آئے گی -- اور سوالات، اور تلاشیاں۔ تمہارا مسودہ اپنے سوٹ کیس میں رکھنا، اور وہ بھی روسی زبان میں جو میں پڑھ بھی نہیں سکتا، اس سے بڑی حماقت کوئی نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ مجھ پر چوری کی دستاویزات لے جانے کا الزام لگا دیں تو؟"

یہ خیال آتے ہی میں بیٹھے سے کھڑا ہو گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ کمرے کی فضا کا تناؤ بھاپ کی طرح گدلا تھا، زیادہ تر میری سانسوں کی بھاپ۔

لیونتانسکی بھی تلخی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ "جاسوسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا میں اپنے ملک کا غدار لگتا ہوں؟"

"میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ میں سوویت حکام کے ساتھ کسی مشکل میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ اس بات پر مجھے کوئی الزام نہیں دے سکتا۔ دوسرے لفظوں میں، یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔"

"میں نے معلومات کی ہیں،" لیونتانسکی نے اصرار کیا۔ "ایک سیاح جو اِن ٹورسٹ کی نگرانی میں چند ہفتے سوویت یونین میں رہا ہو اور روسی نہ جانتا ہو، اسے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میری بیوی نے مجھے بتایا کہ آپ کے سامان کی تلاشی نہیں ہوگی۔ یہ سلوک سیاسی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، یا بورژوا صحافیوں کے ساتھ جنھوں نے غلط تاثر قائم کیا ہو۔ میں مسودہ بالکل آخری وقت میں پہنچاؤں گا۔ یہ ڈیڑھ سو

Scanned with CamScanner

سے کم صفحات پر، باریک کاغذ پر ٹائپ کیا ہوا ہے، چھوٹا سا پیکٹ بنے گا، بالکل وزنی نہیں ہو گا۔ اگر کسی گڑبڑ کا اندیشہ ہو تو آپ اسے ڈسٹ بن میں پھینک سکتے ہیں۔ میرا نام کہیں لکھا ہوا نہیں ہو گا، اور اگر انھوں نے میرا پتا لگا بھی لیا تو میں کہہ دوں گا کہ یہ کہانیاں میں نے خود پھینکی ہیں۔ انھیں یقین تو نہیں آئے گا، مگر وہ کیا کہہ سکتے ہیں؟ اگر میں نے لکھنا چھوڑ دیا تو یہ میری موت کے برابر ہو گا۔ آپ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

"اگر تم بُرا نہ مانو تو میں اس معاملے سے الگ ہی رہنا پسند کروں گا۔"

منہ ہی منہ میں کچھ کہتے ہوے، جو میرے اندازے کے مطابق مایوسی میں نکلنے والا کوئی کوسنا ہو گا، لیوبتانسکی نے بک کیس کے اوپر لگے ہوے پورٹریٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے دیوار پر دے مارا۔ پاسترناک مایاکوفسکی سے جا کر ٹکرایا، اس کے چہرے پر کانچ کے ٹکڑے بکھیر دیے اور خود کو بھی کرچی کرچی کر لیا، دونوں تصویریں فرش پر آ رہیں۔

"فری لانس رائٹر،" وہ چلّایا، "جہنّم میں جاوَ، امریکا جاوَ! جا کے کالوں کو بتاوَ بِل آف رائٹس کے بارے میں! ان سے کہو کہ وہ تمھارے غلام ہوتے ہوے آزاد ہیں! ہلاک کیے ہوے ویت نامیوں سے کہو کہ تم ان کا احترام کرتے ہو!"

آرسنا فلیوفنا دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی۔ "فیلکس،" اس نے التجا بھری آواز میں کہا، "کووالیفسکی ایک ایک لفظ سن رہا ہے!"

"پلیز!" اس نے میری منّت کی، "پلیز آپ چلے جائیے۔ اس بچارے لیوبتانسکی کو اس کے حال پر چھوڑ دیجیے۔ میں اپنے بے حال دل سے آپ کی منّت کرتی ہوں!"

میں جلدی سے چلا آیا۔ اگلے دن لینن گراد روانہ ہو گیا۔

تین دن بعد، جب میں لینن گراد کے تناو بھرے سفر سے اس حالت میں لوٹا جو میری بہترین حالت ہرگز نہ تھی، میں موسکو ایرپورٹ پر اترنے کے آدھ گھنٹے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی ٹیکسی میں ڈھیر ہوا، اِن ٹورسٹ کی ایک خوش مزاج گائیڈ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہمارا رخ یوکرین ہوٹل کی جانب تھا جہاں سوویت یونین میں میرے باقی ماندہ دنوں کے لیے میرا بندوبست کیا گیا تھا۔ یوں تو میں میٹروپول کو ترجیح دیتا، کیوں کہ وہ زیادہ سہولت کی جگہ واقع تھا اور میں اس سے مانوس بھی ہو چکا تھا، مگر پھر مجھے خیال آیا کہ کسی ایسی جگہ ٹھہرنا چاہیے جہاں ایک خاص فرد کو میرا ٹھکانا نہ مل سکے۔ جس وولگا میں ہم بیٹھے تھے وہ کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی، لیکن اگر یہ وہی گاڑی تھی تب بھی غنیمت تھا کہ اسے ایک پستہ قد اجنبی بڑھی سی اونی ٹوپی پہنے چلا رہا تھا۔ اس نے دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا اور مجھ پر کوئی خاص توجہ نہیں دے رہا تھا۔

لینن گراد پہنچنے کے پہلے دن میں نے چند بے حد خوش گوار منٹ گزارے تھے۔ گرمیوں کی ایک روشن سفید شام کو، ایستوریا ہوٹل میں اپنا اسباب کھول کر رکھنے کے کچھ دیر بعد، نیوسکی پروسپیکٹ پر ذرا

Scanned with CamScanner

ساپیدل چلنے پر مجھے سرمائی محل اور ہرمی تاژ دکھائی دے گئے تھے۔ محل کے سامنے وسیع چوک میں ٹھیکی لے کر، جو اس وقت بالکل ویران تھا، اُن انقلابی واقعات کو یاد کرتے ہوئے جو وہاں پیش آئے تھے، میں نے اپنے اندر جذبات کا غیر متوقع ہیجان محسوس کیا۔ اوہ خدایا، میں نے سوچا، میں خود کو روسی تاریخ کا حصہ کیوں محسوس کر رہا ہوں؟ انسانوں کے ساتھ جو کچھ پیش آتا ہے دراصل متعدی معاملہ ہے۔ محل کے پُل پر کھڑے ہو کر میں نے برف جیسے نیلگوں دریائے نیوا پر نگاہ ڈالی، فاصلے پر، سبزی مائل آسمان پر ہوا میں اڑتے ضخیم بادلوں کے نیچے پیٹر اعظم کے بنوائے ہوئے کیتھیڈرل کے سنہری مینار دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سوویت یونین ہے، مگر یہ ابھی تک روس بھی ہے۔

اگلے دن میں بہت مضطرب حالت میں بیدار ہوا۔ سڑک پر دو اجنبیوں نے مجھ سے انگریزی میں مخاطب ہونے کی کوشش کی؛ میرا خیال ہے وہ میرے سویڈ کے جوتے دیکھ کر میری طرف متوجہ ہوئے ہوں گے۔ ان میں سے ایک، جس کی آنکھیں چُندھی اور کپڑے بے ڈھنگے تھے، میرے ہاتھ چور بازار کے روبل بیچنا چاہتا تھا۔ "نیئت!" میں نے جواب دیا، اپنے تنکوں کے ہیٹ پر انگلی سے ٹھوکا دیا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ دوسرے نے، جو لمبا سا، داڑھی والا، کوئی انیس برس کا نوجوان تھا، جس کی بائیں طرف کی قلم داہنی قلم سے بڑی تھی اور جس نے گھر کا بُنا ہوا سبز پُل اوور پہن رکھا تھا، جاز کے ریکارڈ، "جوانوں کے کپڑے" اور امریکی سگریٹ خریدنے کی پیش کش کی۔ "سوری، بیچنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔" میں نے اس سے بھی جان چھڑائی، مگر سبز سویٹر نہر کے کنارے کنارے کوئی ایک کلومیٹر تک میرے پیچھے لگا رہا۔ میں بھاگ پڑا۔ پھر جب میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔ اُس رات مجھے خراب نیند آئی، آدھی رات تک تو بالکل کچی نیند رہی؛ صبح اٹھ کر میں نے ہیلسنکی جانے والی ممکنہ فوری پرواز کے لیے دریافت کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک ہفتے تک بکنگ نہیں ہو سکتی۔ میں نے خود کو تسلی دیتے ہوئے، اپنے پروگرام سے ایک دن پہلے ہی، موسکو لوٹنے کا ارادہ کیا، بڑی حد تک یہ جاننے کے لیے کہ وہاں دستوئفسکی میوزیم میں کیا کچھ رکھا ہے۔

میں لیوستاشکی کے بارے میں بہت سوچتا رہا تھا۔ وہ کتنا بڑا ادیب ہو سکتا ہے؟ میں نے اس کی اُن اٹھارہ کہانیوں میں سے صرف چار پڑھی تھیں جنھیں وہ چھپوانا چاہتا تھا۔ بالفرض اس نے مجھے بہترین چار کہانیاں پڑھوا دی ہوں اور باقی کہانیاں بالکل معمولی، یا تقریباً معمولی، ہوں تو؟ کیا اس قسم کی کتاب کے لیے خطرہ مول لیا جا سکتا ہے؟ میں نے سوچا کہ اپنے ذہنی سکون کی خاطر بہتر ہو گا کہ اس شخص کو بھول جاؤں۔ ایستوریا سے رخصت ہوتے ہوئے مجھے لیلین کا ایک باتونی خط ملا، جو موسکو سے ہوتا ہوا آیا تھا، مگر بظاہر میرے خط کے جواب میں نہ تھا بلکہ اس کے وصول ہونے سے پہلے لکھا گیا تھا۔ کیا مجھے اُس سے شادی کر لینی چاہیے؟ کیا میں یہ حوصلہ کر سکتا ہوں؟ فون کی گھنٹی تیز آواز میں بجی، مگر جب میں نے رسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے کوئی نہ بولا۔ جہاز میں موسکو آتے ہوئے مجھے ہوائی حادثے کا خیال آتا رہا؛ سوویت یونین میں ضرور بہت سے حادثے ہوتے ہوں گے جن کی خبر باہر کہیں نہیں چھپتی۔

Scanned with CamScanner

یو کرین کی بارھویں منزل پر اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے سبز پلاسٹک کے کور والی آرام کرسی میں بیٹھ کر سکون کا سانس لیا۔ کمرے میں ایک نیچا سا سنگل بیڈ اور صنوبر کی لکڑی کی بنی سادہ سی میز بھی تھی جس پر سیب کے سے سبز رنگ کا ٹیلی فون فوری استعمال کے خیال سے رکھا ہوا تھا۔ ہفتے بھر میں میں گھر واپس پہنچ جاؤں گا، میں نے سوچا۔ اب مجھے اٹھ کر شیو کرنا اور یہ دیکھنا چاہیے کہ آج رات کے لیے کسی کنسرٹ یا اوپرا کا ٹکٹ مل سکتا ہے یا نہیں۔ میں موسیقی کے موڈ میں تھا۔

غسل خانے میں لگا ہوا بجلی کا پلگ کام نہیں کر رہا تھا، لہذا میں نے اپنا بجلی کا شیور ایک طرف رکھا اور ابھی برش سے چہرے پر جھاگ بنا رہا تھا کہ دروازے پر، صرف ایک بار، دھماکے جیسی دستک ہوئی۔ میں نے محتاط انداز میں دروازہ کھولا تو وہاں لیوبتانسکی، بھورے کاغذ میں لپٹا ایک پیکٹ تھامے، کھڑا تھا۔

کیا یہ کتّے کا بچہ مجھے بلیک میل کرنے آیا ہے؟

"میرے پہنچنے کے دس منٹ کے اندر اندر تمھیں میرا پتا کیسے معلوم ہو گیا، مسٹر لیوبتانسکی؟"

"کیسے معلوم ہوا؟" ادیب نے کندھے اُچکائے۔ وہ تھکن سے مرنے کے قریب لگ رہا تھا، اس کا چہرہ لمبا اور اترا ہوا، کسی لومڑی کا سا دکھائی دے رہا تھا جو نڈھال ہو کر گرنے والی ہو مگر پھر بھی اپنے کام میں مصروف ہو۔

"میرا سالا اس ٹیکسی کا ڈرائیور تھا جس نے آپ کو ایرپورٹ سے یہاں پہنچایا۔ اس نے لڑکی کی زبان سے آپ کا نام سن لیا۔ اس سے میں آپ کا ذکر کر چکا ہوں۔ دیمتری نے، جو میری بیوی کا بھائی ہے، مجھے اطلاع دے دی کہ آپ یو کرین میں اترے ہیں۔ میں نے نیچے آپ کے کمرے کا نمبر پوچھا جو مجھے بتا دیا گیا۔"

"جو بھی ہوا ہو،" میں نے مضبوط لہجے میں کہا، "میں تمھیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنا ارادہ تبدیل نہیں کیا ہے۔ میں اس سے زیادہ اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ جب میں لینن گراد میں تھا تو میں نے اس پر خوب اچھی طرح غور کر لیا ہے، اور یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔"

"میں اندر آ سکتا ہوں؟"

"ضرور، مگر میں ملاقات کو مختصر رکھنا چاہوں گا، وجہ ظاہر ہے۔"

لیوبتانسکی کچھ سکڑا ہوا سا، پتلے گھٹنے آپس میں جوڑ کر، آرام کرسی میں بیٹھ گیا اور اپنا پارسل بھدّے سے انداز میں اپنی گود میں رکھ لیا۔ اگر وہ مجھے تلاش کر لینے پر خوش تھا تو اس خوشی سے اس کے تاثرات کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔

میں نے شیو پورا کیا، دھلی ہوئی سفید قمیص پہنی، اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس پیش کرنے کے لیے کوئی مشروب وغیرہ نہیں ہے، مگر میں نیچے فون کر کے منگوا سکتا ہوں۔"

لیوبتانسکی نے انگلیوں کے اشارے سے انکار کیا۔ وہ اپنے موزوں تک اُسی لباس میں تھا۔ کیا اس

کی بیوی یہی جوڑا روز دھو دیتی ہے یا اس کے پاس تمام موزے سُرخ، سفید اور نیلے ہیں؟
"صاف بات یہ ہے،" میں نے کہا، "کہ مجھے اس تناو پر احتجاج کرنا ہے جو تم نے مجھ میں اور میرے ارد گرد پیدا کر دیا ہے۔ کوئی ہوش مند شخص سوویت یونین کا دورہ کرنے والے مکمل اجنبی سے یہ توقع نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی سلامتی کو داؤ پر لگا دے گا۔ یہ تمہارا اپنا ملک ہے جو ادیب کی حیثیت سے تمہارے کام میں رکاوٹ ڈال رہا ہے، مَیں نہیں، اور نہ ریاست ہائے متحدہ امریکا، اور چوں کہ تم یہاں رہتے ہو اس لیے ان حالات سے سمجھوتا کرنے کے سوا کیا کر سکتے ہو؟"
"مجھے اپنے ملک سے محبت ہے،" لیویتانسکی بولا۔
"اس سے کسی کو انکار نہیں۔ اسی طرح مجھے بھی اپنے ملک سے محبت ہے، اگرچہ — ہمیں حقیقت کا سامنا کرنا چاہیے — ملک کی محبت خاصی پیچیدہ چیز ہوتی ہے۔ قومیت روح نہیں ہوتی، میرا خیال ہے تم اس بات سے اتفاق کرو گے۔ لیکن میں یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ اگر آدمی کو اپنے ملک کی بعض چیزیں ناپسند ہوں تب بھی اسے ان کے ساتھ گزارا کرنا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے تم ردِ انقلاب کا منصوبہ نہیں بنا رہے ہو۔ تو اگر تمہارے پیچھے دیوار آ گئی ہے جسے تم چڑھ کر، یا نیچے سے سرنگ لگا کر، یا کسی اور طرح پار نہیں کر سکتے تو کم از کم اس سے سر ٹکرانا بند کر دو، اور میرا سر ٹکرانے کا تو خیال ہی چھوڑ دو۔ جو کچھ تم کر سکتے ہو وہ کرو۔ پریوں کی کہانیوں میں، مثال کے طور پر، کیا کہا جا سکتا ہے۔"
"میں اپنی پری کہانیاں لکھ چکا ہوں،" لیویتانسکی گمبھیر لہجے میں بولا۔ "اب کسی بہروپ کے بغیر سچ کا سامنا کرنے کا وقت ہے۔ میں اس حد تک سمجھوتا کرنے کو تیار ہوں جہاں تک میرا تخیل، میری اندرونی آزادی متاثر نہیں ہوتی؛ اس حد کے بعد مجھے سمجھوتا کرنا بند کر دینا چاہیے۔ میرے سالے نے بھی مجھ سے کہا تھا: ایسی کہانیاں لکھو جو قابلِ قبول ہوں؛ جب دوسرے لکھ سکتے ہیں تو تم کیوں نہیں لکھ سکتے؟ میں نے اسے جواب دیا: کہانیاں میرے لیے قابلِ قبول ہونی چاہییں۔"
"ایسی صورت میں کیا تم ایک بے بسی کی صورتِ حال سے دوچار نہیں ہو؟ اگر تم مجھے اجازت دو تو میں کہوں گا کہ کیا تمہاری کہانیوں میں آنے والے یہودی، تبرک کی روٹی اور دعاؤں کی کتاب سے محروم، اپنی مذہبی زندگی میں اس سے زیادہ آزاد ہیں جتنے تم ادیب کے طور پر آزاد ہو؟ ان کے بارے میں لکھتے ہوئے دراصل تم یہی بات کہہ رہے ہو۔ میرا مطلب ہے، آدمی کو اپنے معاشرے کی حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔"
"میں نے تو کر لیا ہے۔ کیا آپ نے بھی تسلیم کیا ہے؟ اپنے معاشرے کی حقیقت کو؟" اس نے ملامت بھرے لہجے میں پوچھا۔
"اتنی اچھی طرح تو نہیں جیسا کر سکتا تھا۔ میرا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ میں اپنی بات کا اظہار کر نہیں سکتا بلکہ یہ کہ میں کرتا نہیں۔ میرے ذاتی خیال میں ویت نام ایک ہولناک اور غیر اخلاقی غلطی ہے، لیکن میں نے درحقیقت کبھی اس کی مخالفت نہیں کی، سوائے اس کے کہ دو چار پٹیشنوں پر دستخط کر دیے یا کسی

ایسے کانگریس مین کو ووٹ دے دیا جو کہتا ہے کہ وہ اس جنگ کے خلاف ہے۔ میری پہلی بیوی مجھ پر تنقید کیا کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں غلط قسم کی چیزیں لکھتا ہوں اور کار آمد عمل کے سوا ہر طرح کے کام میں مشغول رہتا ہوں۔ میری دوسری بیوی بھی یہ بات جانتی تھی مگر مجھ پر ظاہر یہ کرتی تھی کہ نہیں جانتی۔ میں عجیب طریقے سے اس بات سے واقف ہو رہا ہوں کہ امریکی حکومت برسوں سے میری روح کو کچلتی چلی آرہی ہے۔"

اپنے بدن کی حرارت سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ میرا چہرہ سُرخ ہو رہا ہے۔

لیوبتانسکی کے گلے کا گٹھا یوں اوپر کو چڑھ گیا جیسے جھنڈا بانس پر چڑھتا ہے، پھر اس کی زبان سے کوئی لفظ نکلے بغیر نیچے آگیا۔

اس نے دوبارہ کوشش کی، اور بولا: "سوویت یونین نے ہم سب کے لیے انقلاب کی فتوحات کی یادیں محفوظ رکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں برسوں ریاست کے ساتھ سمجھوتا کیے رہا۔ کمیونزم میرے لیے اب بھی اثر کا سرچشمہ ہے اگرچہ اس تاریخی دور کو انسانیت کا مفلس تصور رکھنے والے لیڈروں نے خراب کر دیا ہے۔ انھوں نے انقلاب پر پیشاب کیا ہے۔"

"استالن؟"

"ہاں، وہ خاص طور پر، مگر دوسرے لیڈر بھی۔ اس کے باوجود میں پارٹی کی ہدایات کی پابندی کرتا رہا، اور جب پابندی کرنا ممکن نہ رہا تو میں نے دراز میں رکھنے کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے خود سے کہا: لیوبتانسکی، تاریخ ہر لمحے تبدیل ہو رہی ہے اور کمیونزم میں بھی تبدیلی آئے گی۔ میرا خیال ہے کہ اگر ریاست آرٹسٹوں کی دو یا تین نسلوں کی آزادی کو محدود کر دے تو سچے سوشلسٹ معاشرے کے قیام کے مقابلے میں اس کی کیا اہمیت ہے؟ وہ آخر دنیا کی تاریخ کا بہترین معاشرہ ہوگا۔ تو پھر اگر ہم میں سے کچھ لوگوں کو قربانی دینی پڑے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بس کچھ بُری کتابیں، بُری تصویریں، بُری موسیقی کم ہو جائے گی۔ پھر پچاس برس میں ریاست مضبوط ہو جائے گی اور سوویت آرٹسٹ جو چاہیں گے کہہ سکیں گے۔ میں یہی باتیں سوچتا تھا، یا سوچنے کی کوشش کرتا تھا، لیکن اب ایسا نہیں سوچتا۔ میں پارٹی کے فلسفے پر یقین نہیں رکھتا، جو خیالات کی رہنمائی کا فلسفہ ہے، یہ اصطلاح میرے نزدیک احمقانہ ہے۔ میں ادب کو بالشویک بنانے پر بھی یقین نہیں رکھتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ انقلاب کسی ایسے ملک میں کامیاب ہو سکتا ہے جہاں ناول نگاروں، شاعروں اور ڈراما نگاروں کو اپنی تحریروں کی اشاعت کی اجازت نہ ہو، وہ اپنی درازوں میں ادب کی پوری پوری لائبریریاں چھپائے بیٹھے رہتے ہوں جو کبھی نہ چھپ سکیں اور اگر چھپیں بھی تو اس وقت جب وہ اپنی قبروں میں خاک ہو چکے ہوں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ ریاست کبھی خود کو محفوظ تصوّر نہیں کر سکتی، کبھی نہیں! یہ سیاست کی، بلکہ انسانی صورتِ حال کی فطرت ہی میں نہیں ہے کہ انقلاب پورا ہو جائے۔ یوجینی زمیاتین بتاتا ہے: آخری انقلاب کوئی نہیں ہو سکتا، انقلاب ہمیشہ جاری رہتا ہے!"

"میں سمجھتا ہوں کہ میرے خیالات بھی کم و بیش یہی ہیں،" میں نے، اپنی ذاتی سلامتی کے خیال

Scanned with CamScanner

ہے، لیوبتا نسکی کو اس کے حتمی اعتراف سے باز رکھنے کی غرض سے کہا، وہ اعتراف جو اس کی بھاری ہوتی ہوئی آنکھوں میں ابھی سے جھلک رہا تھا، مجھے خوف تھا کہ یہ اعتراف کہیں مجھے اُس کی آرزو کا اور تاریخ کا قیدی نہ بنادے۔

"میں نے اپنی کہانیاں لکھتے ہوئے سیکھا ہے،" ادیب کہہ رہا تھا، "کہ تخیل ریاست کا دشمن ہے۔ میں نے اپنی تحریروں سے سیکھا ہے کہ میں آزاد آدمی نہیں ہوں۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ میں آپ کی مدد چاہتا ہوں، اپنے ملک کو نقصان پہنچانے کے لیے نہیں، کیوں کہ اس میں اب بھی بے پناہ سوشلسٹ امکانات موجود ہیں، بلکہ اس لیے کہ مجھے اپنے ملک کی بد ترین غلطیوں سے بچ نکلنے کا راستا مل سکے۔ میں اس کو بدنام نہیں کرنا چاہتا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ میری تحریروں کے ذریعے اس ملک کی حقیقی روح سامنے آسکے۔ پشکن سے لے کر پاسترناک تک سب نے، اور اپنے طریقے سے سولژے نِتسن نے بھی، یہی کیا ہے۔ اگر آپ واقعی جمہوری انسان دوستی کو مانتے ہیں تو آپ کو آزادی حاصل کرنے میں ایک فنکار کی مدد کرنی چاہیے۔ ٹھیک بات ہے یا نہیں؟"

میں اس سوال کو خود پر سے جھاڑنے کی کوشش میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھ پر تمھاری کیا ذمے داری عائد ہوتی ہے لیوبتا نسکی؟" میں نے اپنے ناگواری کے احساس کو ضبط کرنے کی کوشش کی۔

"ہم دونوں بنی آدم کا حصہ ہیں۔ اگر میں ڈوب رہا ہوں تو مجھے بچانا آپ کا فرض ہے۔"

"اگر مجھے پانی کی گہرائی کا اندازہ نہ ہو، اور مجھے تیرنا نہ آتا ہو، تب بھی؟"

"آپ میری طرف رسی تو پھینک سکتے ہیں۔"

"دیکھو، میں یہاں سیاح کے طور پر آیا ہوں۔ جیسا کہ میں نے تمھیں بتایا ہے، ممکن ہے مجھے مشتبہ بھی سمجھا جارہا ہو۔ ہوسکتا ہے تم خود کوئی سوویت ایجنٹ ہو اور مجھے پھنسانے کی کوشش کررہے ہو، مجھے کیا پتا؟ ہوسکتا ہے اس کمرے میں بات چیت ریکارڈ ہورہی ہو، پھر کیا ہوگا؟ مسٹر لیوبتا نسکی، مجھے مزید کچھ سننے یا بحث میں الجھنے کی خواہش نہیں۔ میں صرف اپنی معذوری کا اعتراف کرکے تم سے جانے کی درخواست کرنا چاہتا ہوں۔"

"ریکارڈنگ؟"

"ممکن ہے کوئی ہماری بات چیت سن رہا ہو۔"

لیوبتا نسکی کا رنگ رفتہ رفتہ زرد پڑ گیا۔ وہ ذرا دیر خیالوں میں گم، بے حرکت بیٹھا رہا، پھر تھکے ہوئے انداز میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں آپ سے اپنی مدد کی درخواست واپس لیتا ہوں اور آپ کی بات مان لیتا ہوں کہ آپ میری مدد کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ میں آپ پر تنقید نہیں کرنا چاہتا۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں، گوسپودین گاروتز، کہ صرف نام بدل لینے سے آدمی کا کردار نہیں بدل جاتا۔"

لیوبتا نسکی کمرے سے نکل گیا، صرف کونیاک کے ہلکے بخارات اس کے پیچھے باقی رہ گئے۔ اُس نے

Scanned with CamScanner

بُو بھی چھوڑی تھی۔

"واپس آ جاؤ!" میں نے پکارا، مگر زیادہ اونچی آواز میں نہیں؛ اگر اسے دروازے کے دوسری طرف میری آواز سنائی بھی دی تو اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ چلو جان چھوٹی، میں نے سوچا۔ یہ بات نہیں کہ مجھے اُس سے ہم دردی نہیں تھی، لیکن ذرا سوچیے کہ اس نے خود میری اندرونی آزادی کا کیا حشر کیا تھا۔ ہزاروں میل دور روس پہنچ کر کون ایسی مصیبت میں پھنسنا چاہے گا؟ یہ تو چھٹیاں گزارنے کا نہایت خطرناک طریقہ ہوا۔

ادیب جا چکا تھا مگر اس کا خفیہ مسوّدہ وہیں، میرے بستر پر، پڑا رہ گیا تھا۔

"یہ اُس کا مال ہے، میرا نہیں۔" میں نے طیش میں آ کر ٹائی باندھی اور کوٹ پہنا، پھر انگریزی والے فون نمبر کے توسط سے ٹیکسی منگوائی۔ مگر میں اُس کا پتا بھول گیا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد بھی میں ٹیکسی میں بیٹھا ہوا اضطراب کے عالم میں نووو اوستاپوفسکایا اسٹریٹ پر آگے پیچھے چکر لگا رہا تھا۔ پھر مجھے ایک اپارٹمنٹ ہاؤس نظر آیا جس پر مجھے گمان ہوا کہ شاید یہی ہوگا۔ مگر وہ تھا نہیں، اس سے ملتا جلتا ضرور تھا۔ میں نے ڈرائیور کو پیسے دیے اور پیدل چلنے لگا یہاں تک کہ ایک بار پھر مجھے گمان ہوا کہ میں درست عمارت تک پہنچ گیا ہوں۔ سیڑھیاں چڑھنے پر مجھے یقین ہو گیا کہ یہی وہ جگہ ہے۔ جب میں نے لیوبتانسکی کے دروازے پر دستک دی تو ادیب، جو زیادہ عمر کا معلوم ہو رہا تھا اور بہت دور لگتا تھا -- جیسے ابھی ابھی کسی لمبے سفر سے لوٹا ہو، یا جیسے اپنے کام میں مصروف تھا اور وہاں سے اٹھ کر آیا ہو -- خالی نظروں سے مجھے تکنے لگا۔ نہایت خالی نظروں سے۔

"لیوبتانسکی، میرا دل تمھارے لیے خون ہوا جا رہا ہے، میں قسم کھا کر کہتا ہوں، مگر یقین کرو، میں یہ ذمے داری نہیں اٹھا سکتا۔ مجھے تم پر پورا یقین ہے لیکن اپنی زندگی کے اس مرحلے پر، خاص طور پر اپنی موجودہ حالت اور حالیہ تجربات کے پیشِ نظر، میں کسی خطرناک ایڈونچر میں داخل ہونے کو تیار نہیں ہوں۔ میں تم سے معذرت چاہتا ہوں۔"

میں نے مسوّدہ زبردستی اس کے ہاتھ میں تھمایا اور لپک کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ عمارت سے تیزی سے باہر نکلتے ہوئے میں آرینا لیوبتانسکی سے مڈبھیڑ ہونے پر دہشت زدہ رہ گیا۔ میرے پوری قوت سے اس سے ٹکرا جانے اور اس کے فٹ پاتھ پر بُری طرح لڑکھڑا جانے سے ایک لمحہ پہلے مجھے پہچان لینے پر اُس کی آنکھیں خوف سے چمک اٹھی تھیں۔

"اف میرے خدا! یہ میں نے کیا کر دیا؟ میں معافی چاہتا ہوں!" میں نے چوٹ لگنے سے چکرائی ہوئی عورت کی اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد کی، اس کے اسکرٹ پر لگی ہوئی مٹی جھاڑی اور اس کے گلابی بلاؤز پر بھی بے سود ہاتھ پھیرا جو اس کے خراش زدہ بازو اور کندھے پر سے پھٹ گیا تھا۔ جب مجھے جنسی قسم کی سنسنی محسوس ہونے لگی تو میرا ہاتھ جہاں کا تہاں رک گیا۔

آرینا فلیپوفنا نے خون بہتے ہوئے نتھنے پر رومال رکھ لیا اور تھوڑا سا روئی۔ ہم ایک پتھریلی بنچ پر جا

بیٹھے جہاں دس برس کی ایک بچی اور اس کا چھوٹا بھائی ہمیں دیکھنے لگے۔ آئرینا نے روسی میں ان سے کچھ کہا تو وہ وہاں سے چلے گئے۔

"میں آپ سے اتنی ہی خوف زدہ تھی جتنی آپ ہم لوگوں سے،" وہ بولی۔ "چوں کہ لیویتانسکی کو آپ پر اعتبار ہے اس لیے میں بھی اعتبار کرنے لگی ہوں۔ لیکن میں آپ سے مسودہ ساتھ لے جانے کو نہیں کہوں گی۔ یہ فیصلہ کرنا آپ کی اپنی ذمے داری ہے۔"

"میں یہ ذمے داری نہیں لینا چاہتا،" میں نے ناخوشی کے ساتھ کہا۔

اس نے گویا اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہا: "ممکن ہے میں لیویتانسکی سے علیحدہ ہو جاؤں۔ وہ اس قدر خراب حالت میں ہے کہ ہماری شادی تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ پیتا ہے۔ اور کچھ کماتا بھی نہیں۔ میرا بھائی دیمتری اسے دن میں چند گھنٹے، اپنا نقصان کر کے، اسے اپنی ٹیکسی چلانے دیتا ہے۔ اس سے جو ایک آدھ روبل ملتا ہے اس کے علاوہ تمام خرچ میں اٹھاتی ہوں۔ لیویتانسکی کو اب ترجمے کا کام بھی نہیں ملتا۔ اور کسی پڑوسی نے، یقیناً گوولیفسکی نے، پولیس سے اس کی شکایت کر دی ہے کہ نکما اور طفیلی ہے۔ مقدمہ چلے گا۔ لیویتانسکی کہتا ہے کہ وہ اپنے مسودے جلا دے گا۔"

"اُف خدایا! میں نے اس کی کہانیاں ابھی ابھی اسے لوٹائی ہیں!"

"جلائے گا نہیں،" وہ بولی۔ "لیکن اگر جلا بھی دیں تو اور لکھ لے گا۔ اگر اسے جیل میں ڈال دیا گیا تو ٹوائلٹ پیپر پر لکھنے لگے گا۔ جب جیل سے باہر آئے گا تو اخباروں کے حاشیوں پر لکھے گا۔ اس وقت بھی وہ اپنی میز پر بیٹھا ہوگا۔ وہ بہت شاندار ادیب ہے۔ میں اسے لکھنے سے منع نہیں کر سکتی، مگر اب وقت آ گیا ہے کہ میں اپنے بارے میں فیصلہ کر لوں کہ اپنی باقی زندگی اسی طرح گزارنا چاہتی ہوں یا نہیں۔"

آئرینا خاموش بیٹھ گئی، مٹی لگے اسکرٹ اور پھٹے ہوئے بلاؤز کے ساتھ، وہ متناسب ٹانگوں اور پیروں والی پُرکشش عورت تھی۔ میں نے اسے پتھر کی بنچ پر بیٹھا ہوا چھوڑا، رومال اس کی مٹھی میں سختی سے بھنچا ہوا تھا۔

میری وہ رات۔۔ یعنی ۴ جولائی کی رات، جب کہ مجھے پانچ تاریخ کو سوویت یونین سے رخصت ہونا تھا۔۔ اپنی ذات پر سخت شبہے کے عالم میں گزری۔ اگر میں واقعی بزدل ہوں تو مجھے اس حقیقت کو دریافت کرنے میں اتنا عرصہ کیوں لگا؟ اضطراب کہاں ختم ہوتا ہے اور بزدلی کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ بہت سے "حسّاس" (یہ لفظ روز استعمال کرتی تھی)، تنے ہوئے اعصاب والا، حتیٰ کہ خوف زدہ انسان بھی خوف کی حالت میں وہی کچھ کرتا ہے جسے کرنا ضروری ہو، جب مزاحمت کرنا یا چھت پر سے دریا میں چھلانگ لگانا ضروری ہو تو خوف خود ہی ہمت پیدا کر لیتا ہے۔ انسان کی زندگی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب کہیں پہنچنے کے لیے کوئی دروازہ یا کھڑکی نہ ہو تو وہ دیواروں سے بھی گزر جاتا ہے۔

دوسری طرف، فرض کیجیے کہ کوئی شخص کسی احمقانہ مقصد کے حصول کی خاطر حوصلہ مند ہے۔۔ ایسی صورت میں کیا آپ اس کے حوصلے کو زیادہ قابلِ توجہ سمجھیں گے اور ہوش مندی کو نظر انداز کر دیں

گے؟ اس مسئلے کو اپنے ذہن میں سلجھانے کی مسلسل کوشش کرتے ہوئے آخر میں کس طرح یہ فیصلہ کروں کہ لیوتانسکی کا مسوّدہ اسمگل کرنا واقعی اس قابل ہے کہ اس کے لیے خود کو خطرے میں ڈال دیا جائے، جب کہ مجھے اس تمام کارروائی کی اہمیت کے بارے میں بھی شبہات ہیں؟ یہ مانتے ہوئے، جیسا کہ میں اب مانتا ہوں، کہ وہ شخص بھروسے کے لائق ہے، اور اس کی بیوی اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہے، تاہم مجھ جیسے شخص کو یہ خطرہ مول لینے پر کیا حاصل ہو سکتا ہے؟

اگر چھ ہزار سوویت ادیب اپنا پورا زور لگا کر اپنے لیے مزید ایک انچ فنکارانہ آزادی حاصل کرنے سے قاصر ہیں تو میں اُن کی جنگ لڑنے والا کون ہوتا ہوں -- ایچ ہوروو ٹز، مین ہیٹن کا فری لانس سُوربا؟ اگر یہ مان لیا جائے کہ تمام انسان، بشمول کمیونسٹ، آزاد اور مساوی پیدا کیے گئے ہیں اور انصاف تمام انسانوں کے لیے ہے، تب بھی کوئی شخص آخر کتنی دور تک جا سکتا ہے؟ اگر آپ ہینٹس، ماتیس اور لڈوگ فان بیتھوون کے حامی ہوں، تب بھی آپ اُن کے فن کی خاطر کتنی دور تک جا سکتے ہیں؟ گوگول، تالستائی اور دستو تفسکی کی تو بات ہی جانے دیجیے- کیا آدمی خود کو جان بوجھ کر مصیبت میں پھنسا سکتا ہے: ایچ ایچ مینوسکرپٹ اسمگلنگ سروس؟ کیا فنکارانہ سماجی آزادی کے لیے میری شاندار خدمات کے صلے میں صدر اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ مجھے خراجِ تحسین پیش کریں گے؟ اور فرض کیجیے آخر میں یہ تمام معاملہ ہی نہایت پھسپھسا ثابت ہو تو؟ اگر میں لیوتانسکی کا مسوّدہ اسمگل کر کے لے گیا اور وہ کہانیوں کا عام سا مجموعہ ثابت ہوا تب کیا ہو گا؟

ایک سے زائد بار میں خود سے اس دلیل بازی میں اُلجھا، لیکن ہر بار اس کا نتیجہ یہی نکلا کہ میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا-

معاملے کا لبِ لباب، میں تو کہتا ہوں، یہ ہے کہ وہ مجھ سے مدد اس لیے چاہتا ہے کہ میں امریکی ہوں- کیا حوصلہ ہے صاحب!

دورات بعد -- عجیب بات ہے کہ چار جولائی کو چار جولائی نہیں منائی جا رہی تھی، جب کہ میں آتش بازی کی آوازیں سننے کی توقع میں تھا -- موسکو میں موسمِ گرما کی نیم خوش گوار شام کو، یکسانیت سے بوجھل اور بے چین کرنے والے دو دن گزارنے کے بعد، حالاں کہ میں میوزیم کے بارے میں نوٹس لیتا رہا تھا، میں خود کو تسکین دینے کی غرض سے بوشوئی تھیئٹر میں "توسکا" سننے چلا گیا- اسے ایک شاندار سینے والی عورت اور ایک خوش وضع مرد روسی میں گا رہے تھے لیکن اصل اطالوی پلاٹ جوں کا توں رکھا گیا تھا اور اس کے آخر میں اسکارپیا نے، جس نے بندوق کی نقلی گولیوں کی مدد سے "موت" کا وعدہ کیا تھا، گھات لگا کر گرم سیسے کی ایک پوری باڑھ ماری؛ ایک اور اداکار زمین پر گر پڑا اور فلوریا توسکا کو اس المیے سے گزرنے پر معلوم ہوا کہ محبت وہ کچھ نہیں تھی جو وہ سمجھے بیٹھی تھی-

میرے برابر میں ایک اور بھرے بھرے سینے والی عورت بیٹھی تھی، اس حسین روسی عورت کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہو گی اور وہ سفید لباس پہنے تھی جو متناسب اور گداز بدن پر چست تھا، سنہری

Scanned with CamScanner

بال اس کے شاندار سر پر کسی بڑے سے پرندے کی صورت بیٹھے تھے۔ لیلیَن ایسی لگ سکتی تھی، مگر روز نہیں۔ یہ عورت۔۔وہ تنہا تھی جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔۔ بے داغ انگریزی بولتی تھی گو ذرا اجنبی سے لہجے میں۔

پہلے وقفے کے دوران اس نے دوستانہ انداز میں، ذرا فاصلہ قائم رکھتے ہوئے مگر دل چسپی کے ساتھ، پوچھا: "کیا آپ امریکی ہیں؟ یا پھر سویڈش؟"

"سویڈش نہیں۔ امریکی ہی درست ہے۔ آپ کو کیسے اندازہ ہوا؟"

"اگر آپ برا نہ مانیں تو مجھے آپ میں،" وہ دلکش ہنسی کے ساتھ بولی، "ایک طرح کی خود اطمینانی کا احساس ہوا۔"

"ایسا بالکل نہیں ہے،" میں نے کہا۔

جب اس نے اپنا پرس کھولا تو بہار کی خوشبوؤں کا، تازہ پھولوں کی خوشبوؤں کا، ایک جھونکا سا آیا؛ اس کے بدن کی گرمی میرے نتھنوں تک پہنچی۔ مجھے جوانی کی آرزوؤں اور خوابوں کی یاد نے بے کل کر دیا۔

اگلے وقفے میں اس نے میرے بازو کو چھوتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا: "کیا میں ایک درخواست کر سکتی ہوں؟ آپ سوویت یونین سے کب جا رہے ہیں؟"

"کل۔"

"میری خوش قسمتی ہے! کیا آپ کے لیے یہ کام زیادہ مشکل تو نہیں ہوگا کہ جہاں کہیں بھی آپ جا رہے ہیں وہاں سے میرا ایرمیل کا خط پوسٹ کر دیں؟ یہ میرے شوہر کے نام ہے جو آج کل پیرس میں ہیں۔ ہمارے ہاں کی ڈاک کو مغرب تک پہنچنے میں دو ہفتے لگ جاتے ہیں۔ میں ممنون ہوں گی۔"

میں نے لفافے پر نظر ڈالی جس پر پتا آدھا فرانسیسی اور آدھا سریلی خط میں لکھا ہوا تھا، اور ہامی بھر لی۔ لیکن اگلے ایکٹ کے دوران میرے بدن پر پسینا رینگنے لگا اور اوپرا کے ختم ہونے پر، یعنی توسکا کی خودکشی کے وقت کی چیخ کے بعد، میں نے وہ خط اس خاتون کو واپس تھما دیا اور وہ میری معذرت پر بہت زیادہ حیران نہ ہوئی۔ میں نے سر کی جنبش سے اسے الوداع کہا اور تھیٹر سے باہر نکل آیا۔ مجھے مبہم سا احساس ہوا کہ اس کی آواز میں پہلے بھی کہیں سن چکا ہوں۔ پھر میں سیدھا اپنے ہوٹل واپس پہنچا اور خود سے عہد کر لیا کہ اب صرف ناشتہ کرنے کی غرض سے کمرے سے باہر نکلوں گا، اور پھر وسیع نیلے آسمان میں پرواز کر جانے کے لیے۔

بعد میں میں ایک کتاب اور ویٹر سے منگوائی ہوئی میٹھی بیئر کی بوتل پر اونگھتا ہوا سو گیا، خود کو اس خیال سے بہلاتے ہوئے کہ میں بالکل پُرسکون ہوں جب کہ دراصل میں ہمیشہ کی طرح اپنی روانگی اور واپسی کی پرواز کے خیالوں سے پریشان تھا؛ اور جب میں، اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کے مطابق تین منٹ بعد، بیدار ہوا تو مجھے لگا کہ ڈراونے خوابوں کی ایک اور قطار سے شناسائی پیدا کر چکا ہوں۔ ایک لمحے کو مجھے اس

اضطراب نے آلیا کہ کسی نے میرے کپڑوں میں کوئی خطر رکھ دیا ہے، اور میں نے اپنے دونوں سوٹوں کی جیبیں اچھی طرح جھاڑیں۔ نیسٔت! تب مجھے یاد آیا کہ اپنے ایک خواب میں میں ایک میز پر بیٹھا ہوں جس کی دراز آہستہ آہستہ کھلتی ہے اور فیلکس لیویتانسکی، ایک بونا جو دراز میں چند دوست چوہوں کے ساتھ رہتا ہے، کنگھے کی سیڑھی بنا کر لکڑی کی دیوار پر چڑھتا ہے اور کود کر میز کی سطح پر آپہنچتا ہے۔ وہ اپنا للی پٹ جیسا گھونسا لہرا کر میرا منھ چڑاتا ہے اور بلند آہنگ مگر (میرے لیے) قابلِ فہم روسی زبان میں چلاتا ہے: "اے تم بوہنک! تم نے معصوم جاپانیوں کا قتلِ عام کیا! امیریکانسکی باسٹرڈ!"

"یہ زیادتی ہے!" میں چیخ کر کہتا ہوں۔ "اس وقت تو میں کالج کا لڑکا تھا!"

ایک غم ناک خواب، میں نے سوچا۔

بعد میں مجھے خیال آیا: فرض کیجیے جو کچھ لیویتانسکی کے ساتھ پیش آیا ہے وہ میرے ساتھ پیش آ جائے۔ فرض کیجیے امریکا کسی نیم متذبذب احمقانہ انداز میں چین کے ساتھ جنگ میں ملوث ہو جائے، اور اس کا فوری تصفیہ کرنے کی غرض سے — میرے لاکھ چیخ چیخ کر اور بازو لہرا لہرا کر احتجاج کرنے اور گالیاں دینے کے باوجود — چند درجن ہائیڈروجن بم چینیوں کے سنبھلنے سے پہلے ان پر گرادے اور کوئی بیس لاکھ مشرقی باشندوں کو اُبال کر ان کا گاڑھا اِسٹو سُوپ تیار کر ڈالے: خون، چینی ہڈیاں، نلیوں کا گودا اور لاتعداد تیرتے ہوئے چینی آنکھوں کے ڈھیلے۔ ہم جنگ جیت جاتے ہیں کیوں کہ روسی ٹھیک سے فیصلہ نہیں کر پاتے کہ اپنے میزائلوں کا رخ پہلے کس فریق کی طرف کریں۔ اور فرض کیجیے اس ہولناک قتلِ عام کے بعد تقریباً ایک کروڑ امریکی، خود بیزاری کے شدید احساس کے زیرِ اثر، ملک سے فرار ہونے کے لیے سرحدوں کا رخ کرتے ہیں۔ ملکی دولت کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے ٹینکوں میں بیٹھے فوجی انھیں سرحدوں سے واپس لوٹا دیتے ہیں۔ بارو ٹز اپنے کمرے میں جا چھپتا ہے اور پردے کھینچ کر، سخت احتجاجی ہیجان میں، ایک طویل رزمیہ نظم لکھنے بیٹھ جاتا ہے جس میں امریکی قصابیت کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ اب کس ایشیائی یا غیر ایشیائی قوم کی باری ہے؟ ریاست ہائے متحدہ میں کوئی شخص اس نظم کو چھاپنے پر تیار نہیں ہوتا کیوں کہ اس سے فساد پھیل سکتا ہے اور کینیڈا اور میکسیکو کی جانب تارکینِ وطن کا فرار دوبارہ شروع ہو سکتا ہے۔ تب ایک دن دروازے پر دستک ہوتی ہے اور باہر ایف بی آئی کے کارندے نہیں بلکہ داڑھی والا لیویتانسکی کھڑا ہے، جو اچھے دنوں کا ایک سوویت سیاح ہے، ازمنۂ وسطیٰ کا نہیں بلکہ جدید دور کا کمیونسٹ۔ وہ نہایت مہربانی سے نظم کا مسودہ چھپا کر اپنے ساتھ لے جانے اور سوویت یونین میں اسے شائع کرانے کی پیش کش کرتا ہے۔

"کیوں؟" بارو ٹز تشکیک آمیز لہجے میں سوال کرتا ہے۔

"کیوں نہیں؟ تاکہ کتاب اپنی آزادی حاصل کر سکے۔"

میں رات بھر کی بے چین نیند سے جاگا۔ ان ٹورسٹ والوں نے مجھے پرواز کے وقت سے دو گھنٹے پہلے، یعنی گیارہ بجے، اپنے سامان کے ساتھ لابی میں آنے کی ہدایت کی تھی۔ چھ بجے تک میں شیو کر کے

کپڑے بدل چکا تھا اور سات بجے بارھویں منزل کے بوفے میں -- مجھے سخت بھوک لگی تھی -- دہی، ساسج اور انڈوں کا ناشتہ کر چکا تھا۔ پھر میں ٹیکسی کی تلاش میں نکلا۔ اس وقت ٹیکسی ذرا مشکل سے ملتی تھی، لیکن میں نے ہوٹل سے کچھ دور، امریکی سفارت خانے کے قریب، ایک ٹیکسی تلاش کر ہی لی۔ حسبِ معمول دقیانوسی جرمن اور فرانسیسی زبانوں کے آمیزے کو اظہارِ مدعا کے لیے استعمال کرتے ہوئے میں نے، پہلے دلیلوں سے، پھر دو روبل کی قابلِ قبول رشوت دے کر، ٹیکسی والے کو قائل کر لیا کہ وہ مجھے لیوبتانسکی کے گھر تک لے چلے اور نیچے چند منٹ میرا انتظار کرے۔ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور جب ادیب شب خوابی کے نصف لباس اور آہنی چہرے کے ساتھ نمودار ہوا تو اتنے سویرے جگا دینے پر اس سے معذرت کی۔ ذہنی سکون یا ارادے کی مضبوطی کے بغیر میں نے استفسار کیا کہ کیا وہ اب بھی اپنی کہانیوں کا مسوّدہ باہر بھجوانا چاہتا ہے۔ اتنی زحمت اٹھانے کے بعد مجھے جواب یہ ملا کہ دروازہ میرے منھ پر دھڑ سے بند کر دیا گیا۔

آدھ گھنٹے بعد میں اپنا سب سامان باندھ چکا تھا اور سوٹ کیس کو تالا لگا رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی، بلکہ اسے آپ نیم دستک کہہ سکتے ہیں۔ کوئی سوٹ کیس اٹھانے آیا ہو گا، میں نے سوچا۔ دروازے پر موٹی سی ٹوپی اور لمبا کوٹ پہنے پستہ قد آدمی کو کھڑا دیکھ کر میں ایک لمحے کو خوف زدہ ہوا۔ اس نے آنکھ ماری، اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اس اشارے کا آنکھ مار کر جواب دیا۔ میں نے لیوبتانسکی کے سالے دیمتری کو پہچان لیا تھا۔ وہ اندر چلا آیا، اپنے کوٹ کے بٹن کھولے اور کاغذ میں لپٹا ہوا مسوّدہ باہر نکالا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے بتا سکوں کہ اب مجھے اس سے دل چسپی نہیں رہی، اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مسوّدہ مجھے تھما دیا۔

"لیوبتانسکی کا ارادہ بدل گیا؟"

"ارادہ نہیں بدلا۔ اسے ڈر تھا کہ کوالیفسکی آپ کی آواز سن لے گا۔"

"مجھے افسوس ہے۔ مجھے خود خیال کرنا چاہیے تھا۔"

"لیوبتانسکی کہتا ہے آپ اسے خط مت لکھیے،" برادرِ نسبتی نے سرگوشی کی۔ "جب کتاب چھپ جائے تو اسے داس کیپیٹال کی ایک کاپی بھجوا دیجیے۔ وہ سمجھ جائے گا۔"

میں ہچکچاتے ہوئے آمادہ ہو گیا۔

دیمتری بھدے جسم، چھوٹے قد اور اداس یہودی آنکھوں والا آدمی تھا، اس نے دوبارہ آنکھ ماری، تپتی ہوئی ہتھیلی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے نکل گیا۔

میں نے اپنے سوٹ کیس کا تالا کھولا اور مسوّدے کو اپنی قمیصوں کے اوپر رکھ لیا۔ پھر میں نے سوٹ کیس کی آدھی چیزیں باہر نکالیں اور ادبی میوزیموں کے بارے میں اپنے نوٹس اور لینن کے خطوں کی فائل کھول کر مسوّدے کو ان کاغذوں کے درمیان رکھا۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ اگر میں امریکا پہنچ سکا تو پہلی ہی ملاقات میں اُس سے شادی کی درخواست کروں گا۔ جس وقت میں کمرے سے نکلا، فون کی

گھنٹی بج رہی تھی۔

ایرپورٹ کے راستے میں، ٹیکسی میں تنہا بیٹھے ۔۔ ان ٹورسٹ کی کوئی لڑکی میرے ساتھ نہ تھی ۔۔ مجھے کچھ کچھ دیر بعد متلی سی محسوس ہوتی رہی۔ اگر اس کا باعث ساسج اور دہی نہیں تھا تو یہ محض عام قسم کے خوف کی وجہ سے ہوگی۔ بہر حال، اگر لیوبتا نسکی میں اپنی کہانیوں کو باہر بھجوانے کی جرأت ہے تو مجھے کم سے کم اس کا ساتھ تو دینا ہی چاہیے۔ اگر آدمی سوچے تو اپنی زندگی کے دورانیے میں یہ کم سے کم خدمت ہے جو انسانی آزادی کے لیے کی جا سکتی ہے۔ ایرپورٹ پر اگر مجھے برومو یا اس کا روسی متبادل مل جائے تو یقیناً میری طبیعت بہتر ہو جائے گی۔

ڈرائیور، جو کسی اسکالر کے سے سر والا سخت مزاج آدمی معلوم ہوتا تھا، بڑے اطمینان سے سگریٹ پیتے ہوئے گاڑی کے آئینے میں میرا جائزہ لے رہا تھا۔

"اچھا دن ہے،" میں نے فرانسیسی میں کہا۔

اس نے انگلی اوپر اٹھا کر ایرپورٹ جانے والی سڑک کے کنارے لگے ہوئے ایک انگریزی بورڈ کی طرف اشارہ کیا:

"عالمی امن زندہ باد!"

امن اور آزادی۔ میں کسی شخص (باورڈ ہورووِٹز نہیں) کے اس سوویت بورڈ کے اوپر سرخ رنگ سے یہ عبارت لکھنے کے خیال پر مسکرا دیا۔

ہم آگے بڑھتے گئے، اور میں سوویت یونین سے اپنی رخصتی کے خیال میں مگن رہا۔ میں نے محتاط انداز میں وقفے وقفے سے خاصی معلومات جمع کر لی تھیں اور لینن گراد میں ان ٹورسٹ کی ایک لڑکی نے مجھے بتایا تھا کہ سب سے پہلے مجھے پاسپورٹ کنٹرول ڈیسک پر اپنے کاغذات دکھانے ہوں گے، باقی ماندہ روبل جمع کرانے ہوں گے ۔۔ انھیں ساتھ لے جانا سنگین جرم ہے ۔۔ اور اس کے بعد اپنا سامان جہاز میں سوار کرا دینا ہوگا؛ تلاشی نہیں ہوتی، اس نے قسم کھا کر کہا تھا۔ اور بس، قصہ ختم۔ سوائے اس کے کہ پاسپورٹ ڈیسک پر بیٹھے ہوئے افسر کو میرا نام اپنے پاس موجود کسی فہرست میں دکھائی دے جائے اور وہ کہے کہ مجھے کسٹم آفس میں جا کر اپنا ایک پیکٹ وصول کرنا ہے۔ ایسی صورت میں ۔۔ اگر مجھ سے کہا نہ گیا تو میں بھی کسی کو یاد نہیں دلاؤں گا ۔۔ میں جا کر اپنی ضبط شدہ کتابیں وصول کر لوں گا۔ میں نے تصور کیا کہ میں پیکٹ کو کھولوں گا نہیں، بس اس کے لفافے کو (اگر کتابیں لفافے میں لپٹی ہوئی ہوئیں) ذرا سا پھاڑ کر گویا یہ تصدیق کر لوں گا کہ یہ وہی کتابیں ہیں جنھیں پانے کی مجھے توقع تھی، اور پھر پیکٹ کو بغل میں دبا کر آگے چل دوں گا۔ اگر مجھ سے کسی اور روسی زبان کی دستاویز کی پانچ کاپیوں پر دستخط کرنے کو کہا گیا تو میں اس کے آخر میں لکھ دوں گا: "واضح رہے کہ میں روسی زبان بولنے یا پڑھنے سے قاصر ہوں"، اور یہ لکھ کر اپنے دستخط کر دوں گا۔

میں نے سنا تھا کہ جہاز میں سوار ہونے والی ڈھلان کے بالکل پاس کے جی بی کا ایک کارندہ متعین

Scanned with CamScanner

رہتا ہے۔ وہ آپ کا پاسپورٹ طلب کرتا ہے، سیاہ چشمے کے پیچھے سے آپ کو غور سے دیکھتا ہے اور تصویر اور شکل میں کوئی سنگین فرق نہ ہو تو آپ کا استعمال شدہ ویزا پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور آپ کو جہاز میں سوار ہونے کی اجازت دے دیتا ہے۔

اس کے دس منٹ کے اندر اندر، تین زبانوں میں حفاظتی بند باندھ کر، آپ ہوا میں بلند ہو جاتے ہیں اور جہاز کو مغرب کی جانب خم کھاتا دیکھنے لگتے ہیں۔ اگر اُس وقت میں غور سے دیکھوں تو شاید دور کہیں مجھے فیلکس لیوبتانسکی چھت پر کھڑا، اپنے سرخ، سفید اور نیلے موزے بانس سے باندھ کر لہراتا دکھائی دے جائے۔ پھر جہاز سیدھا ہو جاتا ہے، ہم بادلوں کے اوپر جا پہنچتے ہیں اور ہمارا رخ مغرب کی طرف ہو جاتا ہے۔ اور اگلے پانچ یا چھ گھنٹے یہی صورت حال رہتی ہے، بجز اس کے کہ پائلٹ کو ریڈیو پر واپس لوٹنے کی ہدایت موصول ہو جائے؛ یا چیکوسلوواکیا یا مشرقی جرمنی میں اترنے کو کہا جائے جہاں بڑے بڑے ہیٹ پہنے دو سراغ رساں جہاز میں داخل ہو جائیں۔ اپنے تخیل اور قوت ارادی کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے میں نے کسی اَور مسافر کو ان کے ہاتھوں گرفتاری کا ہدف بنا دیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں جہاز ہی میں رہتا ہوں جو دوبارہ ہوا میں بلند ہو جاتا ہے اور ہم مزید کسی واقعے کے بغیر لندن ایرپورٹ پر جا اترتے ہیں۔

جس وقت ٹیکسی موسکو کے ایرپورٹ میں داخل ہوئی، میں نے اپنا ٹکٹ انگلیوں میں اٹھاتے اور سوٹ کیس کا ہینڈل مضبوطی سے ہاتھ میں لیتے ہوئے، خود میں اُسی قدر حوصلہ پیدا ہونے کی خواہش کی جتنا لیوبتانسکی کو اُس وقت درکار ہو گا جب روسی حکام پر انکشاف ہو گا کہ وہ کہانیوں کے اس مجموعے کا خالق ہے جسے میں چھپا کر باہر لے جانے اور شائع کرانے میں کامیاب رہا ہوں، اور اس کے مقدمے اور سزا کا آغاز ہو گا۔

انگریزی میں لیوبتانسکی کی چار کہانیوں میں سے پہلی ایک بوڑھے، پنشن یافتہ باپ کے بارے میں تھی جس کی صحت خراب تھی اور وہ اس کی اطلاع اپنے بیٹے کو پہنچانا چاہتا تھا جس سے اس کے شدید اور متواتر اختلافات رہے تھے اور جسے اس نے آٹھ مہینے سے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے جا کر اس سے مختصر سی ملاقات کا ارادہ کیا۔ چوں کہ اس کا بیٹا اس کے فلیٹ سے ایک بڑے فلیٹ میں، باپ کو اپنا پتا بتائے بغیر، منتقل ہو چکا تھا، اس لیے باپ اس سے اس کے دفتر میں ملنے گیا۔ بیٹا ایک نئی ریاستی عمارت میں واقع کسی دفتر میں کسی طرح کا اہلکار تھا۔ باپ اس عمارت میں اس سے پہلے کبھی نہیں گیا تھا اگرچہ اس کا محل وقوع جانتا تھا کیوں کہ ایک بار پیدل کہیں جاتے ہوئے اس کے ایک پڑوسی نے اشارے سے اسے یہ عمارت دکھائی تھی۔

بوڑھا باپ اپنے بیٹے کے دفتر کی وسیع انتظار گاہ میں ایک کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا کہ بیٹے کو چند منٹ کی فرصت ملے۔ "یوری،" اس نے خیالوں میں بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا، "میں تمھیں صرف اتنا بتانے آیا ہوں کہ اب میری صحت پہلے کی سی نہیں رہی۔ میرا سانس پھولنے لگا ہے اور سینے میں درد رہتا

ہے۔ درحقیقت میں مریض ہو گیا ہوں۔ آخر میں اور تم باپ بیٹے ہیں اور تمھیں میرا حال معلوم ہونا چاہیے، خاص طور پر اس لیے کہ میری صحت ٹھیک نہیں ہے اور تمھاری ماں مر چکی ہے۔"

بیٹے کی اسسٹنٹ سیکرٹری نے، جو مختصر اور تنگ اسکرٹ میں ملبوس ایک ماڈرن لڑکی تھی، اطلاع دی کہ وہ ایک اہم انتظامی کانفرنس میں مصروف ہے۔

"ہاں، کانفرنس تو کانفرنس ہے،" باپ نے کہا۔ وہ اس میں مخل ہونا نہیں چاہتا تھا اور انتظار کرنے پر آمادہ تھا، حالاں کہ اس کا جی متلا رہا تھا اور درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

باپ کئی گھنٹے بڑے صبر کے ساتھ کرسی پر بیٹھا انتظار کرتا رہا؛ اور اگرچہ اس دوران اس نے کئی بار اٹھ کر اسسٹنٹ سیکرٹری سے بے تابانہ استفسار کیا لیکن دن پورا ہونے تک اپنے بیٹے سے ملنے میں ناکام رہا۔ تب لڑکی نے اپنا گلابی ہیٹ سر پر رکھتے ہوے اسے اطلاع دی کہ اس کا بیٹا عمارت سے جا چکا ہے۔ وہ اپنے باپ سے ملنے کا موقع نہ نکال سکا کیوں کہ اسے ایک اہم سرکاری معاملے پر مشورے کے لیے غیر متوقع طور پر طلب کر لیا گیا تھا۔

"اب گھر چلے جاؤ، وہ تم سے فون پر بات کر لے گا۔"

"میرے پاس فون نہیں ہے،" بوڑھے نے بے صبری سے کہا۔ "اور وہ جانتا ہے۔"

اسسٹنٹ سیکرٹری نے، اندر کے کمرے میں بیٹھنے والی قدرے عمر رسیدہ پرائیویٹ سیکرٹری نے، اور پھر عمارت کے نگراں نے باری باری بوڑھے باپ کو گھر لوٹ جانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، مگر وہ راضی نہ ہوا۔

پرائیویٹ سیکرٹری نے کہا کہ اس کا شوہر انتظار کر رہا ہو گا اور وہ مزید نہیں رک سکتی۔ کچھ دیر بعد اسسٹنٹ سیکرٹری بھی اپنے گلابی ہیٹ کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ بھیگی آنکھوں اور کھردری مونچھوں والے نگراں نے بوڑھے کو سمجھایا اور گھر واپس بھیجنے کی کوشش کی۔ "کیا بےوقوفی کی بات ہے کہ گھپ اندھیری عمارت میں رات بھر بیٹھ کر انتظار کیا جائے؟ ڈر کے مارے ہی تمھارا دم نکل جائے گا، اور دوسری تکلیفیں جو ہوں گی سو الگ۔"

"نہیں،" مریض باپ بولا، "میں انتظار کروں گا۔ صبح کو جب میرا بیٹا دفتر آئے گا تو میں اسے ایک ایسی بات بتاؤں گا جو اس کو اب تک معلوم نہیں ہے۔ میں اسے بتاؤں گا کہ جو کچھ وہ میرے ساتھ کر رہا ہے، کل اُس کے بچے اُس کے ساتھ کریں گے۔"

نگراں بھی چلا گیا۔ بوڑھا باپ صبح اپنے بیٹے کے دفتر آنے کا انتظار کرنے کے لیے تنہا رہ گیا۔

"میں پارٹی سے اس کی شکایت کروں گا،" وہ بڑبڑایا۔

دوسری کہانی ایک اور بوڑھے شخص کے بارے میں تھی، اڑسٹھ برس کے ایک رنڈوے کے بارے میں، جسے بہار کے یہودی تہوار کے موقعے پر تبرک کی ماتزو روٹیاں حاصل ہونے کی امید تھی۔ پچھلے

برس اسے ان کا کوٹا ملا تھا۔ یہ روٹیاں سرکاری بیکریوں میں تیار اور سرکاری دکانوں میں فروخت کی جاتی تھیں؛ لیکن اس بار سرکاری بیکریوں کو انھیں تیار کرنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ افسروں کا کہنا تھا کہ مشین خراب ہو گئی ہے، مگر ان کی بات پر کس کو یقین آتا تھا۔

بوڑھا شخص ربی کے پاس گیا جو اُس سے بھی زیادہ بوڑھا تھا جس کی داڑھی کی بے ترتیبی سے اس کی زندگی کی دشواری ظاہر تھی۔ اس نے ربی سے پوچھا کہ اسے ماتزو روٹیاں کہاں سے مل سکتی ہیں۔ اسے ڈر تھا کہ اس سال اسے روٹیاں نہیں مل سکیں گی۔

"یہ ڈر تو مجھے بھی ہے،" بوڑھے ربی نے اعتراف کیا۔ اس نے بتایا کہ اسے ہدایت ملی ہے کہ تہوار کے اجتماع میں آنے والوں سے کہے کہ وہ آٹا خرید لیں اور روٹیاں گھر پر تیار کریں۔ سرکاری دکانوں سے انھیں آٹا مہیا کر دیا جائے گا۔

"مگر میں کیا کروں گا؟" رنڈوے نے پوچھا۔ اس نے ربی کو یاد دلایا کہ اس کے پاس ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جسے باقاعدہ گھر کہا جا سکے، بس ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں ایک چولھے والا بجلی کا اسٹوو ہے۔ اس کی بیوی دو برس پہلے فوت ہو گئی تھی۔ اس کی اولاد میں بس ایک بیٹی زندہ تھی جو اپنے شوہر کے ساتھ بیرو بیجان میں رہتی تھی۔ اس کے دوسرے رشتے داروں میں -- یعنی وہ جو جرمن حملے کے بعد بھی زندہ بچ گئے تھے -- فقط دو عم زاد بہنیں تھیں جو اودیسا میں رہتی تھیں؛ اور وہ خود، اگر کہیں سے تنور حاصل بھی کر لے، نہیں جانتا تھا کہ ماتزو روٹیاں کیسے پکائی جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ کیا کرے؟

تب ربی نے وعدہ کیا کہ وہ بوڑھے کی خاطر کہیں سے ایک آدھ کلو روٹیاں حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ بوڑھے نے خوش ہو کر اسے دعا دی۔

وہ مہینا بھر بے تابی سے انتظار کرتا رہا مگر ربی کی زبان سے پھر روٹیوں کا نام تک نہ نکلا۔ ممکن ہے وہ بھول گیا ہو۔ آخر اس کی جان کو یہی ایک فکر تو نہیں تھی، اور بوڑھا اسے بار بار یاد دلا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر تہوار سر پر تھا اور اسے کچھ تو کرنا ہی تھا۔ متبرک ایام سے ہفتہ بھر پہلے وہ تیز تیز قدموں سے ربی کے فلیٹ پر پہنچا اور اس سے بات کی۔

"ربی،" اس نے التجا کی، "آپ نے مجھ سے ایک آدھ کلو ماتزو روٹیوں کا وعدہ کیا تھا۔ کیا ہوا ان کا؟"

"جانتا ہوں میں نے وعدہ کیا تھا،" ربی بولا، "مگر یہ یاد نہیں کہ کس سے کیا تھا۔ وعدہ کرنا کون مشکل کام ہے۔" اس نے اپنے چہرے پر گیلا رومال پھیرا۔ "مجھے خبردار کیا گیا ہے کہ ماتزو روٹیاں تیار کرنے اور بیچنے پر منافع خوری کے الزام میں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ بات اس صورت میں بھی پیش آ سکتی ہے کہ روٹیوں کی قیمت نہ لی گئی ہو۔ یہ ایک نیا جرم ایجاد کیا گیا ہے۔ بہرحال، لے جاؤ روٹیاں۔ میں بوڑھا آدمی، گرفتار بھی ہو جاؤں تو کیا، مجھے کون لمبا لمبا ٹکا میں بہت دن جینا ہے۔ شکر ہے وہاں بوڑھا آدمی بہت دن جی بھی نہیں سکتا۔ میں تمھیں چھوٹا سا پیکٹ بنا کر دے دیتا ہوں، مگر دیکھو، کسی سے

ذکر نہ کرنا، نہ یہ بتانا کہ کہاں سے ملی ہیں۔"

"خدا آپ پر ہمیشہ اپنی رحمت کا سایہ رکھے، ربی۔ رہی بات جیل خانے میں مرنے کی، تو مریں ہمارے دشمن۔"

ربی نے جا کر اپنی الماری میں سے ماتزو روٹیوں کا بنا بنایا، گرہ دار ڈوری سے بندھا پیکٹ نکال لایا۔ جب بوڑھے نے دبی زبان سے اس کی قیمت کا سوال اٹھایا تو ربی آٹے تک کی قیمت لینے پر راضی نہ ہوا۔ "دینے والا خدا ہے،" وہ بولا، "اگرچہ بعض وقت بڑی مشکل سے دیتا ہے۔" اس نے بتایا کہ لوگوں کو اپنی ضرورت کے مطابق ماتزو روٹیاں بمشکل مل رہی ہیں، اس لیے اسے جو کچھ مل گیا ہے اس پر شکر گزار ہونا چاہیے۔

"میں کم کھا لوں گا،" بوڑھا بولا۔ "ایک ایک نوالہ گن گن کر کھاؤں گا، اور آخری ٹکڑا دیکھنے اور چومنے کے لیے بچا رکھوں گا۔ خدا تو سب کچھ سمجھتا ہے۔"

چند روٹیاں مل جانے پر بھی خوشی سے بدحواس، بوڑھا ٹرالی کار میں سوار ہو کر گھر کو چلا تو وہاں ایک اور یہودی سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی جس کا بازو سوکھا ہوا تھا۔ وہ یدش زبان میں سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ اجنبی نے اس تقریباً چوکور پیکٹ پر نظر ڈالی۔ پھر بوڑھے رنڈوے کو دیکھا، اور بھاری آواز میں سرگوشی کی: "ماتزو؟" بوڑھا آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور اثبات میں سر ہلا کر بولا: "خدا کی دین ہے۔" "ملی کہاں سے؟" "خدا نے دی۔" "خدا ہی دینے والا ہے، تو پھر مجھے کیوں نہیں دیتا،" اجنبی کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "میں بدنصیب ہوں۔ میرے رشتے دار کلیولینڈ، امریکا، میں رہتے ہیں۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ بہت عمدہ ماتزو روٹیوں کا ایک بڑا سا پیکٹ بھجوائیں گے۔ مگر جب میں دفتر والوں سے پوچھنے گیا تو انھوں نے کہا کہ کوئی پیکٹ نہیں آیا۔ تم جانتے ہو کب پہنچے گا؟" وہ بڑبڑایا۔ "جب تہوار کو دو ایک مہینے گزر چکے ہوں گے۔ تب کیا فائدہ ہو گا؟"

بوڑھے نے اداسی سے سر ہلایا۔ اجنبی نے اپنے کارآمد ہاتھ سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور اگلے اسٹاپ پر بہت سے دوسرے مسافروں کے ساتھ اتر گیا۔ جاتے ہوئے اس نے خداحافظ کہنے تک کی زحمت نہ کی۔ جب بوڑھے کے اترنے کا وقت آیا تو اس نے اپنے پیروں کے بیچ میں نظر ڈالی جہاں بڑی احتیاط سے ماتزو روٹیوں کا پیکٹ رکھا تھا۔ وہاں کیا دھرا تھا۔ بس اس کے پیر تھے۔ بوڑھا یوں چلایا جیسے کسی نے ناخن سے اس کی پیٹھ کھرچ ڈالی ہو۔ اس نے دیوانگی سے پوری ٹرالی کار میں تلاش کیا، اور اس چکر میں اپنے اسٹاپ سے بہت آگے نکل گیا، ایک ایک مسافر سے دریافت کیا، خاتون کنڈکٹر سے پوچھا، ڈرائیور سے معلوم کیا، مگر کسی نے اس کا روٹیوں کا پیکٹ نہیں دیکھا تھا۔

تب اسے خیال آیا کہ سوکھے بازو والا اجنبی اس کی روٹیاں چرا کر بھاگا ہے۔

غم زدہ بوڑھے نے خود سے سوال کیا: کیا کوئی یہودی دوسرے یہودی کا قیمتی تبرک چرا سکتا ہے؟ یہ بات تو ممکن معلوم نہیں ہوتی تھی۔ لیکن، اس نے سوچا، کسے معلوم، اگر آدمی کے پاس تبرک کی روٹیاں

نہ ہوں تو وہ انھیں حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے؟

جہاں تک میرا تعلق ہے، اب میرے پاس دیکھنے بھر کو بھی ماتزو روٹیاں نہیں بچیں۔ اگر میں کسی یہودی یا روسی کی روٹیاں چُرا سکتا تو ضرور چرا لیتا۔ اس نے یہاں تک سوچا کہ موقع ملے تو اسے بوڑھے ربی تک کی روٹیاں چرا لینے میں عار نہ ہو۔

ماتزو روٹیوں سے محروم بوڑھا گھر چلا گیا اور اس کا تہوار تبرک کی روٹی کے بغیر ہی گزرا۔

تیسری کہانی، جس کا عنوان "تالیتھ" تھا، سترہ برس کے ایک نوجوان کے بارے میں تھی جس کی ٹھوڑی پر داڑھی کے محض چند بال تھے اور جو کیروف سے سفر کر کے موسکو کی آرخی پووا اسٹریٹ پر واقع عبادت گاہ کی سیڑھیوں تک پہنچا تھا۔ اس کے پاس دعا کی ایک شال تھی، نہایت خوب صورت دمکتے ہوئے سفید رنگ کا بہت بڑا پارچہ، جسے وہ انواع و اقسام کے اور چھوٹے بڑے یہودیوں کے ہاتھ -- جو شال پر بیک وقت تجسس، خوف اور حرص کی نگاہیں ڈال رہے تھے -- پندرہ روبل میں بیچنے کو لایا تھا۔ ان میں سے بیش تر لوگ نوجوان سے کترا کر گزر رہے تھے، خاص طور پر بڑی عمر کے یہودی، حالاں کہ ان میں سے جو زیادہ عبادت گزار تھے انھیں اپنی پُرانی شال کی فکر بھی تھی جو روزانہ کے متواتر استعمال سے کندھوں پر سے گھس کر ختم ہو رہی تھی اور وہ اس کی جگہ دوسری شال حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ "اسے ضرور ہماری صفوں میں موجود مخبروں نے بھیجا ہے،" انھوں نے آپس میں سرگوشیاں کیں، "تاکہ انھیں کسی کی مخبری کا موقع ہاتھ آسکے۔"

تاہم، اپنے بڑوں کی تنبیہوں کے باوجود، کئی نسبتاً جوان مردوں نے قریب جا کر شال کا معائنہ کیا اور تحسین کا جذبہ محسوس کیا۔ "تمھیں اتنی عمدہ شال کہاں سے ملی؟" نوجوان سے سوال کیا گیا۔ "میرے ابا کی ہے جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے،" اس نے جواب دیا۔ "انھیں یہ ایک مال دار یہودی دوست سے تحفے میں ملی تھی۔" "تو پھر تم اسے اپنے لیے کیوں نہیں رکھتے، تم بھی تو یہودی ہو۔ ہو یا نہیں؟" "ہوں،" نوجوان ذرا گھبرائے بغیر بولا، "مگر میں کوسومول کا رضاکار بن کر براتسک جا رہا ہوں اور مجھے شادی کرنے کے لیے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں میں باضابطہ طور پر ملحد ہوں۔"

بے مُنڈے بھاری گالوں والا ایک جوان آدمی جو شال کے دمکتے سفید رنگ، اس رنگ کی گہرائی اور کناروں پر لگی لمبی ریشمی جھالروں کو سراہ رہا تھا، سرگوشی میں نوجوان سے کہنے لگا کہ وہ اسے پانچ روبل میں خریدنے کو تیار ہے۔ لیکن اس کی بات دعا کرانے والے گبائی کے کانوں میں پڑ گئی اور وہ اپنی چھڑی لہرا کر چلایا، "بدبخت، اگر تُو نے یہ شال خریدی تو کہیں یہ تیرا کفن نہ ثابت ہو۔" بے مُنڈے گالوں والا یہودی فوراً دبک گیا۔

"مارنا مت،" خوف زدہ ربی، جس نے عبادت گاہ سے نکلتے ہوئے گبائی کو چھڑی اٹھاتے دیکھ لیا تھا، بے اختیار بول اٹھا۔ اس نے عبادت گزاروں سے فوراً دعا شروع کرنے کو کہا، اور نوجوان سے مخاطب

ہو کر بولا، "یہاں سے چلے جاؤ۔ ہماری مصیبتیں پہلے ہی کون سی کم ہیں۔ مذہبی چیزیں بیچنے کی ممانعت ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ہم پر مجرمانہ معاشی سرگرمی کا الزام لگے؟ یا عبادت گاہ کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں؟ سو ہم پر اور خود پر رحم کرو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

عبادت گزار اندر چلے گئے۔ نوجوان سیڑھیوں پر اکیلا کھڑا رہ گیا؛ مگر پھر گبائی دروازے سے باہر آیا، وہ خمیدہ پشت آدمی تھا اور بہتے ہوئے کان میں روئی کا پھاہا ٹھونسے ہوئے تھا۔

"دیکھو،" وہ کہنے لگا۔ "میں جانتا ہوں یہ چوری کی ہے۔ مگر دعا کی شال پھر دعا کی شال ہے، اور خدا اس کے بارے میں بندوں سے کوئی سوال نہیں کرے گا۔ جلدی بات کرو، اس سے پہلے کہ عبادت ختم ہو اور لوگ باہر آجائیں۔"

"دس روبل دے دو اور شال لے لو،" نوجوان بولا۔

گبائی نے اسے تیکھی نظر سے دیکھا۔ "میرے پاس فقط آٹھ روبل ہیں، مگر ذرا انتظار کرو تو دو روبل اپنے برادرِ نسبتی سے اُدھار لا سکتا ہوں۔"

نوجوان صبر سے انتظار کرنے لگا۔ شام کا جھٹ پٹا گہرا ہو چلا تھا۔ چند منٹ بعد ایک بڑی سی سیاہ گاڑی آکر عبادت گاہ کے سامنے رکی اور دو پولیس والے اترے۔ نوجوان فوراً سمجھ گیا کہ گبائی نے اس کی شکایت کر دی ہے۔ اسے اور تو کچھ نہ سوجھا، بس فوراً شال اپنے سر پر ڈال لی اور زور زور سے دعا پڑھنے لگا۔ اس نے نہایت رقت انگیز ماتمی دعا پڑھی۔ پولیس والے دعا پڑھنے کے دوران اس کے پاس آنے سے ہچکچائے اور سیڑھیوں کے نیچے کھڑے دعا کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ پھر جب عبادت گزار باہر نکلے تو انھیں یقین نہ آیا کہ وہ نوجوان اس قدر خشوع و خضوع سے دعا پڑھ رہا ہے۔ اس کی آواز میں اتنا سوز اور اثر تھا کہ ان کا دل موم ہو گیا۔ ممکن ہے واقعی اس کا باپ کچھ دن پہلے مرا ہو۔ سب لوگ متوجہ ہو کر سننے لگے، اور بہت سوں کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ نوجوان کی دعا کبھی ختم نہ ہو، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ دعا پوری ہوتے ہی اسے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا جائے گا۔

اندھیرا چھا گیا ہے۔ چاند دودھیا بادلوں کے پیچھے سے عبادت گاہ کے بُرج پر چمکنے لگا ہے۔ نوجوان کی دعا متواتر سنائی دے رہی ہے۔ عبادت گزار سڑک پر دم سادھے کھڑے سن رہے ہیں۔ دونوں پولیس والے بھی اب تک وہیں ہیں، اگرچہ دکھائی نہیں دے رہے۔ نوجوان بھی نظر نہیں آرہا۔ رات کے اندھیرے میں فقط دعا کی شال کا سفید رنگ چمک رہا ہے۔

آرینا فلیپوفنا کی ترجمہ کی ہوئی چوتھی اور آخری کہانی ایک ادیب کے بارے میں ہے جو روسی باپ اور یہودی ماں کی اولاد ہے اور برسوں سے چھپ کر کہانیاں لکھ رہا ہے۔ لکھنے کی خواہش اسے کم عمری سے تھی، لیکن پہلے پہل اسے جرأت نہ ہوئی -- کیوں کہ یہ اس قدر سفاکی کا کام معلوم ہوتا تھا -- اس لیے اس نے ترجمے سے آغاز کیا؛ اور آخر ایک دن جب سنجیدگی اور مسرت کے ساتھ طبع زاد کہانیاں لکھنا شروع

Scanned with CamScanner

کیا تو اس پر یہ حیران کن انکشاف ہوا کہ اس کی بہت سی کہانیاں، تقریباً نصف کہانیاں، یہودیوں کے بارے میں ہیں۔

ایک ایسے شخص کے لیے جو خود نصف یہودی ہو، یہ تناسب معقول ہے، اس نے سوچا۔ باقی کہانیوں کے کردار روسی تھے جو اس کے ددھیالی عزیزوں سے مماثلت رکھتے تھے۔ "یہ اچھی بات ہے کہ مجھے ایک سے زائد جگہوں سے خیالات سوجھتے ہیں،" اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "اس طرح میں زندگی کے زیادہ رنگارنگ تجربات کو سمیٹ سکتا ہوں۔"

کئی برس لکھنے کے بعد اس نے اپنے یونیورسٹی کے دنوں کے ایک قابلِ اعتبار دوست وکتور زویر کوف کو، جو پروگریسو پبلشنگ ہاؤس کے ایڈیٹروں میں شامل تھا، شائع کرنے کی غرض سے دینے کے لیے اپنی کہانیوں کا ایک انتخاب کیا۔ جب اسے جواب میں عجلت میں لکھا ہوا ایک مبہم سا رقعہ ملا تو ایک صبح وہ اپنی تحریروں پر تبادلۂ خیال کرنے ایڈیٹر کے دفتر پہنچا۔ زویر کوف، جو یوں بھی ایک مصیبت زدہ شخص تھا۔۔اور ہر کسی سے رونا رویا کرتا تھا کہ اس کی بیوی اس کی ذرا عزت نہیں کرتی۔۔اسے دیکھتے ہی اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ اس نے لپک کر دروازہ بند کیا اور کچھ دیر تک اس کی جھری سے کان لگائے کچھ سننے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس نے تیزی سے اپنی میز کے قریب پہنچ کر جیب سے ایک چابی نکالی اور دراز میں سے مسودہ برآمد کیا۔ وہ بھاری جسم اور تمتمائے ہوئے چہرے والا آدمی تھا، اس کے دانت داغ دار اور آواز گھٹی ہوئی تھی۔ اس نے مسودے کو بڑے عجیب سے انداز میں تھام رکھا تھا جیسے اسے ڈر ہو کہ وہ ابھی اُچھل کر اس کے چہرے پر زخم ڈال دے گا۔

"تولیبیا، پلیز،" اس نے اپنا سر ادیب کے سر کے بالکل نزدیک لاتے ہوئے ہانپتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی، "ان ہولناک کہانیوں کو فوراً یہاں سے لے جاؤ۔"

"تمھیں ہو کیا گیا ہے؟ اس قدر کانپ کیوں رہے ہو؟"

"اتنے بھولے مت بنو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو میری یہ حالت کیوں ہو رہی ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ تم نے ایسی ٹیڑھی چیزیں چھپنے کو کیسے دے دیں۔ ایڈیٹر کے طور پر میری رائے یہ ہے کہ ان کا ادبی معیار مشتبہ ہے۔۔میں یہ نہیں کہوں گا کہ گھٹیا ہے، ایمان داری کی بات ہے، تولیبیا۔۔لیکن کہانیوں کی حیثیت سے یہ ہمارے معاشرے کی خوفناک توہین کرتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے کہانیوں کے موضوع کے طور پر یہودیوں کا آخر کیوں انتخاب کیا۔ تم ان کے بارے میں جانتے ہی کیا ہو؟ تمھاری ثقافت کا تعلق یہودیت سے نہیں سوویت روس سے ہے۔ اس پورے سلسلے ہی سے ریاکاری کی بُو آتی ہے اور تم پر یہوددشمنی کا بھی الزام لگ سکتا ہے۔"

اس نے اٹھ کر کھڑکی بند کی اور دوبارہ بیٹھنے سے پہلے ایک الماری کے پٹ کھول کر اس کے اندر جھانکا۔

"تمھارا دماغ تو ٹھکانے پر ہے وکتور؟ میری کہانیاں کسی بھی طرح یہوددشمن نہیں ہیں۔ اگر کسی

نے انھیں سر کے بل کھڑے ہو کر پڑھا ہو تو اور بات ہے۔"

"اس کی صرف ایک منطقی توضیح ہو سکتی ہے،" ایڈیٹر بحث کرنے لگا۔ "میرے انتہائی ہمدردانہ تجزیے کی رو سے، جس کی بنیاد تم جیسے گویا نیک نہاد آدمی کے لیے رعایت پر ہے، یہ کہانیاں سوشلسٹ حقیقت نگاری کے منھ پر ایک طمانچہ ہیں اور ایک خطرناک رجحان کی -- بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ سخت لفظ استعمال کرنا چاہیے -- نشان دہی کرتی ہیں، یعنی سوویت مخالف جذبات کی۔ ممکن ہے تمھیں پوری طرح اس کا شعور نہ ہو -- میں جانتا ہوں کہانی کس طرح لکھنے والے کے ناک میں نکیل ڈال دیتی ہے۔ ایڈیٹر کی حیثیت سے مجھے ان چیزوں کا احساس کرنا پڑتا ہے۔ میں جانتا ہوں، تولیپیا، تمھاری گفتگو سے مجھے معلوم ہے کہ تم ہمارے سوشلزم پر پورے خلوص سے یقین رکھتے ہو؛ میں تمھیں سوویت نظام کو بدنام کرنے کا قصوروار نہیں ٹھہرا رہا ہوں، لیکن دوسرے لوگ ایسا سوچ سکتے ہیں۔ بلکہ میں جانتا ہوں کہ وہ ایسا ہی سوچیں گے۔ اگر اکتیابر کا کوئی ایڈیٹر تمھاری کہانیاں پڑھ لے تو یقین کرو تمھارا کریئر تباہ ہو جائے۔ ایک تو تم خود حفاظتی کے نارمل احساس سے بالکل بے بہرہ ہو، اور دوسری اور بے حد افسوس ناک بات یہ ہے کہ تمھیں بے گناہ راہ گیروں کو اپنی بدقسمتی میں ملوث کر لینے سے بھی کوئی عار نہیں۔ اگر یہ کہانیاں میری لکھی ہوئی ہوتیں تو میں انھیں لے کر تمھارے پاس کبھی نہ آتا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ان کہانیوں کو ضائع کر دو، اس سے پہلے کہ یہ تمھیں ضائع کر دیں۔"

اس نے میز پر رکھا ہوا گلاس اٹھایا اور سخت پیاس کے عالم میں پانی پیا۔

"یہ تو میں مرتے دم تک نہیں کرنے والا،" ادیب نے غصے میں آ کر جواب دیا۔ "ان کہانیوں کا لہجہ یا نفسِ مضمون مختلف بھی ہو تو کم از کم ان کی روح وہی ہے جو اوّلیں سوویت ادیبوں کی تھی -- انقلاب کے فوراً بعد کی مسرور روحیں۔"

"میرا خیال ہے تم جانتے ہو ان مسرور روحوں کا کیا حشر ہوا۔"

ادیب کچھ دیر اسے تکتا رہا۔ "اچھا، مگر اُن کہانیوں کے بارے میں کیا خیال ہے جو یہودیوں کے تجربات کے بارے میں نہیں ہیں؟ ان میں کچھ کہانیاں روسی زندگی کے گھریلو پہلوؤں کے موضوع پر ہیں؛ مثلاً پنشن یافتہ باپ اور اس کے نادیدہ بیٹے کی کہانی۔ مجھے تو امید تھی کہ تم ان میں سے ایک آدھ کہانی اپنی ذاتی سفارش کے ساتھ نوومی میر یا یونوست میں شائع کرنے کے لیے بھیجو گے۔ یہ بے ضرر خاکے ہیں اور انھیں عمدہ اسلوب میں لکھا گیا ہے۔"

"کم سے کم وہ تو نہیں جو دو طوائفوں کے بارے میں ہے،" ایڈیٹر بولا۔ "اس میں سماجی تنقید پوشیدہ ہے اور بے محابا فطرت پرستی پائی جاتی ہے۔"

"طوائفیں بھی تو سماجی زندگی گزارتی ہیں۔"

"گزارتی ہوں گی مگر میں اسے شائع تو نہیں کر سکتا۔ دیکھو تولیپیا، میں تمھیں مشورہ دوں گا کہ اگر تم ہم سے ترجمے کا مزید کام حاصل کرنے کی توقع رکھتے ہو تو تمھیں اس مسودے سے فوری طور پر نجات حاصل کر

لینی چاہیے تاکہ خود کو اور اپنے خاندان کو سنگین نتائج سے محفوظ رکھ سکو، اور اس اشاعتی ادارے کو بھی جس نے تمھیں ماضی میں اتنی وفاداری اور فیاضی سے روزگار فراہم کیا ہے۔"

"چوں کہ یہ کہانیاں تم نے نہیں لکھی ہیں، اس لیے تمھیں خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، وکتور الیکساندرووچ،" ادیب سرد لہجے میں بولا۔

"میں ڈرپوک نہیں ہوں، اگر تمھارا اشارہ اس طرف ہے، اناتولی بورسووچ، لیکن اگر ایک ہیبت ناک انجن پٹریوں پر دوڑتا چلا آرہا ہو تو مجھے پتا ہے کہ چھلانگ لگا کر کس طرف ہٹنا چاہیے۔"

ادیب نے تیزی سے اپنے مسودے کے صفحات اکٹھے کیے، اپنے چمڑے کے بیگ میں انھیں ٹھونسا اور بس میں بیٹھ کر گھر واپس چلا گیا۔ اس کی بیوی ابھی اپنے کام پر سے نہیں لوٹی تھی۔ اس نے کہانیاں باہر نکالیں اور ایک کہانی کو پورا پڑھ کر اسے، ایک ایک صفحہ کر کے، باورچی خانے کے سنک میں رکھ کر جلا دیا۔

اس کا نو سالہ بیٹا جب اسکول سے واپس آیا تو کہنے لگا: "پاپا، آپ نے سنک میں کیا چیز جلائی ہے؟ وہ آگ جلانے کی جگہ تو نہیں ہے۔"

"میں اپنی راست گوئی کو جلا رہا ہوں،" ادیب بولا۔ پھر کہنے لگا: "اپنی صلاحیت کو، اپنے ورثے کو۔"

**

(انگریزی عنوان : Man in the Drawer)

سمیر نیازی
کی معروف اور اہم کتاب

The Press in Chains

کا اردو ترجمہ

صحافت پا بندِ سلاسل

مجلد ۳۷۵ صفحات   قیمت: سو روپے

محمد عمر میمن

گم شدہ خطوط

اور دیگر تراجم

میلان کنڈیرا، الیگزاندر سولژے نتسن، ایین مالوف،
لیلیٰ بعلبکی اور جولین بارنز کی افسانوی تحریروں کے ترجمے

مجلد ۱۷۶ صفحات   قیمت: اسّی روپے

Scanned with CamScanner

قیمت: اسّی روپے

تقسیم کار

مکتبہ دانیال۔ صدر، کراچی
ٹامس اینڈ ٹامس، صدر، کراچی
ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی
گورا پبلشرز، لوئر مال، لاہور
کلاسیک، شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور
فکشن ہاؤس، مزنگ، لاہور